ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی مرکزی کردار "رانی لکشمی بائی" کی داستان

رانی جھانسی

ذوالفقار ارشد گیلانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رانی جھانسی

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی مرکزی کردار "رانی لکشمی بائی" کی داستان

رانی جھانسی

ذوالفقار ارشد گیلانی

علم دوست پبلیکیشنز

25 سی لوئر مال لاہور۔ فون: 7325418

اللہ سب سے بڑا ہے

ناشر: خالد ڈوگر

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : رانی جھانسی

مصنف : ذوالفقار ارشد گیلانی

مطبع : اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور

قیمت : -/200 روپے

ڈسٹری بیوٹرز: دُعا پبلی کیشنز

25 سی لوئر مال لاہور۔ فون: 7325418

انتساب

ان پیار بھری

یادوں کے نام!

جو

''میرے اپنوں''

سے وابستہ ہیں

فہرست

پیش لفظ ---------- 7
حرف آغاز ---------- 12
فلیش مین اور جھانسی کی رانی ---------- 19
حوالہ جات(1) ---------- 223
مانی کارنیک سے لکشمی بائی تک ---------- 232
حوالہ جات(2) ---------- 333

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

وہ میرا اور میں اس کا استاد ہوں۔

ہے تو عجیب سی بات.....لیکن حقیقت یہی ہے۔

کیونکہ اس نے اخباری دنیا کے اسرار و رموز کے سلسلے میں میری رہنمائی کی جب کہ میں نے اسے لفظوں کو کہانیوں کی مالا میں پرونا سکھایا۔

میرا اور ذوالفقار ارشد گیلانی کا یہ رشتہ گذشتہ اکیس برس سے قائم ہے لیکن اس انوکھے رشتے کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ کے ساتھی اور آپس میں گہرے دوست ہیں۔ اچھے وقتوں میں بے شک ہم مہینوں یا بلکہ سالوں نہ ملتے ہوں لیکن یہ طے ہے کہ بُرے دنوں میں ہم نے ہمیشہ اپنے اس تعلق کی لاج رکھی ہے۔

شاید وہ 1984ء یا 1985ء کا موسم گرما تھا جب میں پہلی بار اس سے ملا۔ وہ سکھر سے نیا نیا کراچی آیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ لفظ اس کے پاس تب بھی تھے لیکن انہیں کہانی کا روپ دینا اسے نہیں آتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک اخبار نویس تھا۔ عام طور پر ایک اخبار نویس کبھی اچھا کہانی کار یا لکھاری نہیں ہوسکتا کیونکہ خبر اور کہانی کا انداز اور لفظوں کی ترتیب و تشکیل بالکل مختلف ہوتی ہے۔

اس سے پہلے وہ اخبارات میں ہی کام کرتا رہا لیکن نئے افق وہ پہلا ڈائجسٹ تھا جس نے اسے ایک کہانی نویس کی حیثیت سے متعارف کرایا اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اسے خبروں کے گورکھ دھندے سے نکال کر کہانیوں کی ایسی دنیا میں پہنچایا جہاں بڑے بڑے نام اس کے مد

مقابل تھے لیکن آفرین ہے اس پر کہ مختصر سے عرصے میں اس نے خود کو کچھ اس طرح تبدیل کیا کہ آج اس کا شمار بھی ملک کے ممتاز کہانی نویسوں میں ہوتا ہے۔

میں ذاتی طور پر اس کی صلاحیتوں کا معترف ہوں اور اسے لفظوں کی مشین کہتا ہوں۔ بے شک ایک عرصے تک اس نے صرف تراجم کیے اور درجنوں انگریزی ناولوں کو اُردو کے قالب میں ڈھالا۔ کئی ناول تو اس نے خالص مغربی رنگ میں ہی ترجمہ کیے لیکن بعض کو اس نے کچھ اس طرح مشرقی رنگ دیا کہ ان پر طبع زاد کہانیوں کا گمان گزرتا تھا۔

میک بولان کے کے ناول اس کا نقطۂ آغاز تھے۔ بعدازاں اس نے بابر سریز، کیپٹن راحیلہ عدنان سیریز اور عقاب جیسی تحریریں لکھیں لیکن یہ سب ایکشن ناول تھے چنانچہ اس پر مار دھاڑ سے بھرپور کہانیاں لکھنے والے کی چھاپ لگ گئی مگر پھر اس نے میرے ہی اصرار پر اپنی پہلی تاریخی کہانی ''تاج محل'' تحریر کی جو 1990ء میں نیا رخ کے صفحات پر شائع ہوئی۔ اسے قارئین نے بے حد پسند کیا اور انہیں اس امر پر بھی یقین آ گیا کہ یہ شخص صرف اپنی کہانی کے کرداروں سے گولیاں چلوانے کا فن ہی نہیں جانتا بلکہ اسے ہر قسم کی تحریریں لکھنے پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔

یوں اس نے گل آوارہ، دھوپ چاؤں، رقاصہ، وادیٔ ایمن، قراقوش، رانی، راج اور اس جیسی کئی طویل کہانیاں، مختلف موضوعات پر تخلیق کیں جن سے اندازہ ہوا کہ وہ الفاظ کو اپنی مرضی کے مطابق جس رنگ میں چاہے ڈھال سکتا ہے۔

لیکن ان کے علاوہ ایک کہانی ایسی ہے جسے میں آج بھی اس کی یادگار اور بہترین تحریر قرار دیتا ہوں۔

یہ ''ناگ رانی'' تھی

ایک ایسی معاشرتی کہانی جس میں سچائیوں کو شاید ضرورت سے کچھ زیادہ ہی حقیقی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کی بنیاد بعض زندہ لوگوں کی ذاتی زندگی اور ایک انگریزی ناول کے چند صفحات پر رکھی گئی لیکن اسے اتنی پذیرائی ملی کہ شاید ذوالفقار کی کسی اور کہانی کو اس کے ہم پلہ قرار نہ دیا جا سکے۔

کہانی بے شک ذوالفقار نے لکھی لیکن وہ اس کا سارا کریڈٹ مجھے دیتا ہے۔ شاید یہ اس کی محبت ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس کہانی میں تحریر کیا جانے والا کوئی واقعہ، کوئی سچویشن یا ڈائیلاگ ایسا

نہ تھا جسے ہم دونوں نے باہم مشورے سے فائنل نہ کیا ہو۔ ''ناگ رانی'' نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز کے جرائد کی بعض حدود و قیود سے آزاد ہونے کے باوجود چھپی اور اس نے خوب داد و تحسین سمیٹی۔

لیکن ذوالفقار میں ایک خامی یہ ہے کہ وہ بہت کم کام پایۂ تکمیل کو پہنچاتا ہے چنانچہ حسبِ عادت اس نے اسے بھی ادھورا چھوڑ دیا اور دوبارہ اپنی اخباری زندگی میں لوٹ گیا۔

اسی اثناء میں ایک روز ''الف لیلہ'' ڈائجسٹ کے روحِ رواں اور مشہور عالم کردار صبیحہ بانو کی ''چھلاوہ'' کے خالق محترم ایچ اقبال سے ملاقات ہوگئی۔ ''ناگ رانی'' اس وقت تک کتابی صورت میں شائع ہو چکی تھی۔ انہوں نے اس کے چند صفحات کا مطالعہ کیا جو انہیں بے حد پسند آئے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اسے اپنے قلم سے آگے بڑھائیں جب کہ ساتھ ہی وہ ذوالفقار سے ملاقات کے مشتاق بھی ہوئے۔

ذوالفقار اس وقت تک کراچی چھوڑ کر راولپنڈی جا چکا تھا۔ اس سے تو ایچ اقبال صاحب کی ملاقات ہوگئی لیکن ''ناگ رانی'' جوں کی توں رہ گئی۔ شاید اس وجہ سے کہ ذوالفقار کا نام اور ''ناگ رانی'' ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔

کہانیوں سے ذوالفقار نے ناتا توڑ لیا تو کسی حد تک مجھ سے بھی دور ہو گیا لیکن یہ دوری ایسی نہ تھی کہ ہم کبھی مل نہ سکتے۔ چنانچہ ہم پھر ملے اور شاید پہلے سے زیادہ گرم جوشی کے ساتھ ملے۔

یہاں میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ دوستی، دو افراد کے باہم تعلق کا دوسرا نام ہوتی ہے جس میں دونوں فریقین کی دل چسپی، محبت اور لگن یکساں ہوتی ہے لیکن ذوالفقار میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں، سو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً ہم دونوں میں پیدا ہونے والے فاصلوں کو کم کرنے میں پہل ہمیشہ میں نے ہی کی۔

مگر اس کے باوجود وہ آج بھی میرا دوست ہے اور میری کوشش ہے کہ ہمارا یہ رشتہ ہمیشہ قائم و دائم اور ہرا بھرا رہے۔

اس عرصے میں ذوالفقار نے اپنی تحریروں کا ایک نیا رنگ منتخب کر لیا اور تاریخ کو اپنی زندگی کا محور بنا لیا اس نے تاریخی کرداروں، واقعات اور مقامات پر بے تحاشا ریسرچ کی اور تاریخ کے حوالے سے یکے بعد دیگرے اس کی چھ کتابیں شائع ہوئیں جن میں تاریخی رومان، تاریخ کا سفر،

تاریخ الانبیاء، کاروانِ تہذیب، قصص الانبیاء اور لازوال محبتیں شامل ہیں۔ ان کتابوں کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے ہر کردار یا واقعے کا زمانہ اور سن وسال تلاش کیے اور اسی کو بنیاد بنا کر مضامین لکھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا یہ کام قابل تعریف اور منفرد ہے لیکن میں اسے ایک بار پھر کہانیوں کی دنیا میں واپس لانا چاہتا تھا۔ صد شکر کہ اس نے اپنے ایک دیرینہ دوست کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اب دوبارہ قلم اٹھالیا ہے اس لیے میری دُعا ہے کہ اب اس کے قلم اور کہانی کا رشتہ کبھی نہ ٹوٹے۔

ذوالفقار کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ بھی بتاتا چلوں کہ وہ ہمیشہ سے تاریخی کہانیاں لکھنے کا مخالف رہا ہے۔ اس کا استدلال ہے کہ تاریخ کو افسانہ بنانا کسی طور بھی دیانت داری نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ آج ہم تاریخی حوالوں کے لیے سو سال پرانی کتب سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کی تحریر کو سند تسلیم کرتے ہوئے اپنی تحقیق کی بنیاد بناتے ہیں لہٰذا مزید سو سال بعد جب محققین دورِ حاضر کی کتب کا مطالعہ کریں گے تو انہیں حوالوں کے طور پر تاریخ اپنی اصلی حالت میں نہیں ملے گی کیونکہ ہم انہیں اس حد تک تبدیل کر چکے ہوں گے کہ وہ اسی کو مستند سمجھیں گے۔ چنانچہ اس طرح ہم تاریخ سے اس کی اصل شناخت چھیننے کا باعث بنیں گے۔

لیکن میرے کہنے سے ذوالفقار نے تاریخی کہانیاں ہی لکھنی شروع کی ہیں۔ سیف الملوک سے اس نے ازسرِنو آغاز کیا اور ان دنوں نئے اُفق میں اس کی سلسلہ وار تاریخی کہانی ''سکندر اعظم'' شائع ہو رہی ہے جسے بہت جلد آپ کتابی صورت میں بھی ملاحظہ کر سکیں گے۔ ذوالفقار نے اس صنف میں بھی ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ عام طور پر تاریخی ناول نگار یا کہانی نویس کسی ایک زمانے کا انتخاب کر لیتے ہیں اور اس زمانے کے کسی کردار کو مرکز بنا کر باقی کردار اور واقعات موقع کی مناسبت سے اس میں شامل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض فرضی نام بھی تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں لیکن ذوالفقار نے اصل کرداروں کو ہی بنیاد بنایا ہے اور ہر قسط کے آخر میں حواشی دیے ہیں جن میں کہانی میں شامل کرداروں یا مقامات کا تفصیلی تعارف دیا جاتا ہے۔

یہ یقیناً تاریخی ناول نگاری کا ایک منفرد انداز ہے۔

جہاں تک آپ کے ہاتھ میں موجود اس کتاب یعنی ''رانی جھانسی'' کا تعلق ہے تو یہ بھی

ذوالفقار کی دو تاریخی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ دونوں کہانیاں ایک ہی شخصیت یعنی جھانسی کی رانی لکشمی بائی کے بارے میں تحریر کی گئی ہیں البتہ ان کے لکھے جانے میں پندرہ سال کا ایک طویل وقفہ ہے۔ پہلی کہانی 1990ء میں ماہنامہ نیا رخ کے صفحات پر شائع ہوئی تھی جب کہ دوسری اپریل 2005ء کے ماہنامہ نئے اُفق کے صفحات کی زینت ہے۔

اُمید ہے کہ یہ دونوں کہانیاں آپ کو بے حد پسند آئیں گی کیونکہ یہ جس ہستی کے بارے میں لکھی گئی ہیں اسے آج بھی برصغیر پاک و ہند میں شجاعت اور دلیری کے نشان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

ذوالفقار ایک عرصے تک ڈائجسٹ کی دنیا سے دور رہا ہے۔ اگر یہ وقفہ نہ آتا تو وہ یقیناً ایک بڑا کہانی نویس ہوتا لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ اس دوری کے باوجود اس کے حلقۂ احباب نے اسے فراموش نہیں کیا۔

میں اس کے لیے یہی دُعا کروں گا کہ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''

عمران احمد

مدیر

ماہنامہ نئے اُفق، کراچی

(یکے از مطبوعات، نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز)

حرف آغاز

شروع اللہ کے نام سے
جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔

یوں تو برصغیر پاک و ہند اگست 1947ء میں انگریزوں کے پنجہ استبداد سے آزاد ہوا لیکن اس کی آزادی کے حصول کی طویل جدوجہد کا آغاز مئی 1857ء میں اس وقت ہوا جب میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے انگریز سرکار کے خلاف پہلی گولی چلائی اور پھر مغربی ہندوستان کے اس چھوٹے سے شہر میں شروع ہونے والی ''جنگ آزادی'' نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

انگریزوں نے 1601ء میں محض تجارت کی غرض سے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا جب کہ مغل شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر نے 1612ء میں انہیں ساحلی شہر سورت میں اپنی پہلی فیکٹری قائم کرنے کی اجازت دی۔ انگریزوں نے 1640ء میں چینا پٹنم کے راجہ سے ایک قطعہ اراضی خرید کر مدراس کا قلعہ سینٹ جارج تعمیر کیا جو سرزمین ہندوستان پر انگریزوں کا پہلا قلعہ تھا۔

اسی زمانے میں جب آگرہ، اجمیر، احمد آباد، اور بھڑائچ میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں بھی قائم ہو گئیں تو ان پر ہندوستان کی پراسرار سرزمین کے راز آشکار ہونا شروع ہوئے اور انہیں پہلی بار علم ہوا کہ یہ ملک ہر لحاظ سے ان کے لیے سونے کی چڑیا ہے چنانچہ انہوں نے تجارتی مفادات کے ساتھ ساتھ اپنے سیاسی مقاصد کا آغاز بھی کر دیا تا کہ سرزمین ہندوستان کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ نچوڑا جا سکے۔

1681ء میں بنگال کے مغل گورنر شائستہ خان کے ساتھ انگریزوں کا محصول کی ادائیگی پر جھگڑا شروع ہوا تو برطانوی تجارتی کمپنی کے گورنر سر جوشیا چائلڈ نے اپنے بادشاہ جیمز ثانی سے

مغلوں کے خلاف اعلان جنگ کی درخواست کی تا کہ بحری آمد ورفت اور بنگال کے محاصل متاثر ہوں۔ چٹا گانگ کو مرکز بنا کر انگریزی فوجیں خشکی کے راستے آگے بڑھیں تا کہ مغل صوبے دار کو انگریزی شرائط تسلیم کرنے پر مجبور کیا جا سکے لیکن اس وقت اورنگ زیب عالمگیر جیسا طاقت ور بادشاہ، ہندوستان کا حکمران تھا۔ مغلوں نے انگریزوں کی تمام کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا اور انہیں ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس پر انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور معافی کے خواست گار ہوئے۔ اورنگ زیب نے انہیں ایک لاکھ پچاس ہزار طلائی سکے جرمانے کی سزا دی اور معافی دے کر دوبارہ تجارت کا اجازت نامہ مرحمت کر دیا۔

اب تک دو علیحدہ علیحدہ برطانوی کمپنیاں ہندوستان سے تجارت کر رہی تھیں جس کے باعث برطانوی حکومت اور خود ان کمپنیوں کو بھی نقصان ہو رہا تھا چنانچہ 1707ء میں دونوں نے متحد ہو کر ایک معاہدے کے تحت ایک نئی کمپنی کی بنیاد رکھی جس کا نام ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' تھا اور یہی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی تھی جس نے پہلے کمپنی اور پھر برطانوی راج کی صورت میں اڑھائی سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔

مغل شہنشاہوں، شہاب الدین شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے ادوار میں تو انگریز ان کی قوت و طاقت کے سامنے بے بس نظر آئے اور کسی حد تک اپنی اوقات میں رہے لیکن 1707ء میں عالمگیر کے انتقال کے بعد جب کشور ہندوستان پر مغلوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی تو انگریزوں نے بھی سیاسی اور جنگی چالبازیوں سے اپنے دائرہ اقتدار کو وسعت دینی شروع کر دی۔

بادشاہت کمزور ہو کر چھوٹے چھوٹے رجواڑوں اور ریاستوں میں تبدیل ہوئی تو انگریزوں کو کھل کر اپنے ''جوہر'' دکھانے کا موقع ملا۔ ہر خود مختار راجہ، مہاراجہ اور حکمران اپنی ریاست اور تاج وتخت کے تحفظ کے لیے کسی کی مدد کا خواہاں تھا اور انگریز ایسے ہی فرمانرواؤں کی تاک میں تھے چنانچہ انہوں نے اسی ''مدد'' کی آڑ میں ہندوستان اور اس کے عوام کو مرحلہ وار غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا شروع کر دیا۔

بعض غیور حکمرانوں نے ان کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی لیکن انگریزوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے اور اقتدار کے لالچی وحریص مقامی راجاؤں کی مدد سے انہیں کچل کر رکھ دیا۔ اگر انہیں کسی مقام پر شکست کا اندیشہ لاحق ہوتا تو وہ مخالف فرمانرواؤں کے بعض بے ضمیر امراء کو

اپنے ساتھ ملا کر ان کی جڑیں کھوکھلی کر دیتے جس کی زندہ مثال میر جعفر اور میر صادق کی صورت ہمارے سامنے ہے جنہیں آج بھی ''غداران وطن'' کے نام ولقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ساحلی علاقوں سے اٹھ کر انگریز رفتہ رفتہ پورے ہندوستان میں پھیلنا شروع ہوئے تو بنگال کا خود مختار حکمران نواب سراج الدولہ ایک مضبوط حریف کی صورت میں ان کے سامنے آیا لیکن میر جعفر کی غداری کے باعث 23 جون 1757ء کو لڑی جانے والی جنگ پلاسی کے نتیجے میں نواب کو کلائیو لائیڈ کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور انگریزوں کی ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' ہندوستان کے مقدر کی بلاشرکت غیرے مالک بن گئی۔

گو اس جنگ میں کامیابی نے انگریزوں کے طویل اقتدار کی راہ ہموار کر دی لیکن بعض ہندوستانی نجومیوں اور جوتشیوں نے پیش گوئی کی کہ ہندوستان میں برطانوی راج، جنگ پلاسی کے ٹھیک سو سال بعد یعنی 23 جون 1857ء کو ختم ہو جائے گا۔

چنانچہ جب مئی 1857ء میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو انگریزوں کو یہ پیش گوئی یاد آ گئی اور اس جنگ کی گونج نہ صرف عظیم تر سلطنت برطانیہ کے کونے کونے میں سنی گئی بلکہ لندن میں برطانوی اقتدار کے ایوان بھی ڈگمگانے لگے۔

یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے آزادی کی اس جنگ کو نہ صرف ''غدر یا بغاوت'' کا نام دیا بلکہ اسے کچلنے کے لیے ظلم وستم کی انتہا کر دی۔ بہ الفاظ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستان کے غلامی کا اصل دور ہی اس جنگ کے بعد شروع ہوا۔ مورخین اور مستشرقین اس بات پر متفق ہیں کہ بہ ظاہر ہندوستانیوں کی یہ جنگ آزادی ناکام ہو گئی لیکن راکھ میں دبی چنگاری کے مصداق یہ آگ آہستہ آہستہ سلگتی رہی اور بالآخر 1940ء میں دوبارہ بھڑک اٹھی تو انگریز کو ہندوستان چھوڑتے ہی بنی۔

اس ''بہ ظاہر'' ناکام جنگ آزادی نے تاریخ کو بعض ایسے کردار دیئے جو امر ہو گئے۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی بھی انہی کرداروں میں سے ایک ہے جو آج بھی بہادری و دلیری کے نشان کی صورت زندہ ہے۔ وہ جنگ آزادی کا بنیادی ستون، ہندوستانی تاریخ کی ہیروئن اور برطانوی راج کے لیے سب سے بڑے خطرے کی علامت تھی۔ اس کی بہادری کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ خود انگریزوں نے اسے ''جون آف آرک'' کے ہم پلہ قرار دیا اور ''باغی ملکہ'' ''باغی شہزادی'' و ''آتش مزاج ملکہ'' کے خطابات سے نوازا۔

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی یہ عظیم ہیروئن صرف 22 سال 7 ماہ زندہ رہی ۔ وہ اندھیری رات میں کسی جگنو کی طرح چمکی اور اچانک گل ہوگئی ۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ بیوہ ہوکر جھانسی کے تخت پر بیٹھی اور اگلے چار سال اس نے جھانسی کو چالاک ، عیار اور ظالم انگریزوں کی گرفت میں ہونے کے باوجود نہ صرف زندہ رکھا بلکہ جنگ آزادی کے مضبوط گڑھ میں بھی تبدیل کر دیا ۔ وہ حب الوطنی ، خود پرستی ، انا پسندی اور شجاعت و بہادری کا جیتا جاگتا شاہکار تھی ۔ وہ ایک چھوٹی سی ریاست کی مہارانی تھی لیکن مورخین بالاتفاق اسے عزت و شہرت کی وسیع و عریض سلطنت کی ملکہ کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

تاریخ دان لکھتے ہیں کہ رانی لکشمی بائی ایک دھان پان سی ، نرم و نازک اور بے انتہا خوبصورت ''دوشیزہ'' تھی لیکن اس کے سینے میں شیر کا دل دھڑکتا تھا ۔ اس کے حوصلے پہاڑوں سے زیادہ بلند اور ارادے چٹانوں سے زیادہ سخت تھے ۔ دوسری تمام عورتوں کی طرح وہ بھی کمزور تھی لیکن جب لڑائی کے میدان میں کودی ، اپنی فوجوں کی کمان کی اور ہتھیار اٹھائے تو پھر دیکھنے والوں نے اسے ''جنگ کی دیوی'' کا خطاب دیا ۔ وہ بے حد حسین و جمیل اور کانچ کی طرح نازک تھی لیکن اس کی سختی کے سامنے مرد بھی ماند پڑ گئے ۔ وہ نوجوان تھی لیکن دور اندیشی اور فیصلوں کی پختگی میں انتہائی تجربہ کاروں کو بھی نیچا دکھاتی تھی ۔

پہلے اس نے اپنے باپ کے محبت بھرے اور گھنیرے سائے تلے ، مرہٹہ شاہزادوں کی طرح پرورش پائی لیکن جب وہ اپنے شوہر کے محل میں آئی تو ''قابل تقلید اور قابل مثال'' عورت ثابت ہوئی ۔ شوہر کے مرنے پر زندگی سے اس کی دلچسپی ختم ہوگئی لیکن اس نے اپنی ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کیا کیونکہ اب ریاست کی تقدیر اس سے وابستہ تھی ۔ وہ ایک کٹر ہندو تھی لیکن دوسرے تمام مذاہب کے لیے اس کے دل میں بھرپور احترام موجود تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے عظیم جنگ میں اپنی فوجوں کی قیادت کی تو ہندوؤں سے پہلے مسلمانوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا ۔

رانی ، ایک بہترین شمشیر زن اور بے مثال گھڑ سوار تھی لیکن اس کی نجی زندگی کے بارے میں زیادہ تر معلومات اب بھی صیغۂ راز میں ہیں ۔ بعض انگریز مورخ اسے ایک ظالم حکمران قرار دیتے ہیں ۔ کچھ نے یہاں تک لکھا ہے کہ وہ ایک عیاش عورت تھی اور اس نے اپنے حرم میں مضبوط اور توانا قسم کے مرد پال رکھے تھے جو ہر رات اس کا دل بہلایا کرتے تھے ۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی بلکہ وہ ایک باکردار، باعصمت، قابل احترام خاتون، بے انتہا محبت کے قابل اور جانوروں پر بے حد مہربان تھی۔ دن میں کئی بار عبادت کرتی اور شیشے لگے کمرے میں اپنے جھولے میں بیٹھی ہلکورے لیتی رہتی تھی۔ رانی بننے سے پہلے وہ نہایت سخت دل تھی لیکن پھر اس نے خود کو یکسر تبدیل کرلیا۔ وہ اپنی رعایا کا بے حد وحساب خیال رکھتی لیکن جرائم پیشہ افراد کو سخت سزائیں دیتی تھی۔

تمام تر مغربی ومشرقی مورخین بلاتفریق اس امر پر متفق ہیں کہ وہ ایک دلیر اور شجیع عورت تھی جس کا ہندوستان کی تاریخ میں کوئی ثانی نہ تھا۔ برطانوی جنرل سر ہوگ روز جو خود کئی بار رانی کے مقابلے پر آیا اور بار بار اس سے شکست کھائی لیکن بالآخر (حالات سے مجبور) رانی کے خلاف فتح یاب ہوا، خود ان الفاظ میں اس کی عظمت کی گواہی دیتا ہے کہ

''رانی، تمام باغیوں میں سے بہادر ترین جنگ جو اور عظیم ترین وبہترین سپہ سالار تھی۔''

''رانی جھانسی'' اسی دلیر، بہادر اور خوبصورت رانی کی داستان ہے جس کا کہا ہوا جملہ ''ہم اپنے جھانسی سے دست بردار نہیں ہوں گے۔'' ہندوستانی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

''رانی جھانسی'' دو حصوں پر مشتمل ہے اس کا پہلا حصہ ''فلیش مین اور جھانسی کی رانی۔'' ایک انگریزی کتاب ''فلیش مین ان دی گریٹ گیم'' (Flashman In The Great Game) کا ترجمہ ہے جسے جارج میکڈونلڈ فریزر George Macdonald Fraser نے ان کاغذات کی مدد سے ترتیب دیا جو کرنل ہیری پیگٹ فلیش مین (بعد ازاں بریگیڈئر جنرل.....) وکٹوریہ کراس، کے سی بی، کے سی آئی ای کے سفر ہندوستان (1856-58) کی یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔ جارج فریزر نے کتاب کے ابتدائی صفحے پر فلیش مین کا جو تعارف درج کیا ہے اس کے مطابق، اس گھڑ سوار فوجی افسر کو یو ایس میڈل آف آنر، سان سرافینو آرڈر آف پیوریٹی اینڈ ٹرتھ فورتھ کلاس کے اعزازات بھی ملے۔

کرنل ہیری فلیش مین 1822ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام ایچ فلیش مین ایش بی اور والدہ کا ایلشیا پیگٹ تھا۔ تعلیم رگبی اسکول میں حاصل کی۔ بیوی کا نام الزبتھ اپنی موریسن تھا جو لارڈ پلیسلے کی بیٹی تھی۔ خود فلیش مین کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ اس نے افغانستان 42-1841 میڈلز

،پارلیمنٹ کا اظہار تشکر) کریمیا (اسٹاف) ہندوستانی بغاوت (لکھنؤ وغیرہ، وکٹوریہ کراس) چین ،تاپے کی بغاوت میں نمایاں خدمات انجام دیں۔اس کے علاوہ یو ایس آرمی (میجر، یونین فورسز 1962ء) کرنل (اسٹاف) آرمی آف دی کانیڈریسی (1863ء) بھی رہا۔اس نے فوجی اور عام شہری کی حیثیت سے کئی طویل سفر اختیار کیے۔وہ میکسیکو کے شہر میکسی میلین کا اے ڈی سی، مدغاسکر کی ملکہ رانا والونا کا ملٹری ایڈوائزر، راہ سراوک کا چیف آف اسٹاف، ڈائریکٹر برٹش آف شور ٹریڈنگ کمپنی، گورنر رگبی اسکول، اعزازی صدر مشن فار دی گلی مشن آف دی ڈیوسڈنی میلز بھی رہا۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف بھی تھا۔

فلیش مین نے اپنی ان یادداشتوں میں دعویٰ کیا ہے کہ رانی جھانسی اور اس کے مابین معرکے کا عشق تھا اور وہ نہ صرف ایک دوسرے کی شدید محبت میں گرفتار ہو گئے تھے بلکہ رانی نے اس کے ساتھ ایک حویلی میں رات بھر قربت کے انتہائی لمحات بھی گزارے تھے لیکن رانی جھانسی کے ساتھ فلیش مین کی داستان محبت کی کسی اور تاریخی یا غیر جانبدار ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی۔

بلکہ متعدد انگریز مصنفین اور رانی جھانسی کے کٹر مخالفوں کے بقول عورتوں کے سلسلے میں فلیش مین کا رویہ نہایت افسوسناک اور شرم ناک رہا لیکن ان میں چند ایک ایسی تھیں جن سے وہ لگاؤ حتیٰ کہ احترام کا جذبہ محسوس کرتا تھا اور رانی جھانسی کا شمار انہی خواتین میں تھا۔بقول ان کے، بے شک رانی نے اس کا دل موہ لیا تھا لیکن رانی نے اس کے لگاؤ کا جواب کہاں تک دیا یہ بات آج تک مشکوک ہے، ممکن ہے کہ اسے حویلی میں آنے کی دعوت ملی ہو لیکن یہ بات قطعی قرین قیاس نہیں کہ رانی جھانسی نے اس حویلی میں فلیش مین کے ساتھ رات گزاری تھی۔

انگریز مورخین نے اس بات کو سنجیدگی سے مدنظر رکھا ہے کہ اس موقع پر فلیش مین قطعی طور پر اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ وہ نقاب میں پوشیدہ تھا۔فلیش مین نے اس رات کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کی روشنی میں یہ امکان زیادہ ہے کہ رات کو اس سے حویلی میں ملنے والی رانی نہیں بلکہ کوئی پیشہ ور رقاصہ یا اس کی کوئی مصاحب عورت رہی ہو گی۔

بدقسمتی سے یہ درست ہے کہ رانی لکشمی بائی نے 1857ء کی جنگ آزادی یا بغاوت میں مرکزی کردار ادا کیا لیکن اس بات کی کوئی شہادت کسی تاریخ میں موجود نہیں کہ اس کی نجی زندگی یا حسن سلوک قابل احترام نہ تھا۔تمام تواریخ اور مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ رانی ایک باکردار

اور باعصمت عورت تھی۔ اسی طرح فلیش مین پر رانی کے حملے کی کوئی شہادت بھی سوائے اس کی اپنی یادداشتوں کے کہیں اور نہیں ملتی۔

''رانی جھانسی'' کا دوسرا حصہ ''مانی کارنیک سے لکشمی بائی تک'' اس کے بارے میں دستیاب مختصر لیکن مستند حقائق پر مبنی ہے اور انہیں، جھانسی گزٹیئر، جھانسی (ڈاکٹر روڈا پانڈے) اور جل ویکاس پتریکا (1996-97) جھانسی کی مدد سے تحریر کیا گیا ہے۔

ان دونوں حصوں کو ایک ہی کتاب میں شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے کہ انگریزوں نے صرف برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کو ہی غلام نہیں بنایا بلکہ اس خطے کی تاریخ اور اس سرزمین کے ہیروز کے کردار مسخ کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اس حوالے سے میں نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز کا بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے رانی جھانسی کی داستان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی اجازت دی۔ نئے افق ڈائجسٹ کراچی کے مدیر اعلیٰ اور میرے محترم بزرگ جناب مشتاق احمد قریشی اور نئے افق کے مدیر جناب عمران احمد کا اس سلسلے میں تعاون بلاشک وشبہ لائق تحسین ہے۔

کیونکہ ''رانی جھانسی'' کا پہلا حصہ یعنی ''فلیش مین اور جھانسی کی رانی'' ماہنامہ نیا رخ، کراچی (جون تا ستمبر 1991ء) میں ''رانی جھانسی'' کے عنوان سے اور دوسرا حصہ یعنی ''مانی کارنیک سے لکشمی بائی تک'' ماہنامہ نئے اُفق کے اپریل 2005ء کے شمارے میں بہ عنوان ''باغی ملکہ'' شائع ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ کو داستان کی صورت دینا ایک پیچیدہ اور مشکل امر ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ اس کی ترتیب و تسلسل میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ البتہ میری اس کوشش کی کامیابی یا ناکامی کی کسوٹی آپ ہیں۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ذوالفقار ارشد گیلانی

12 مارچ 2005ء

Zulfiqargilani@gamil.com

www.gilani.com.pk

فلیش مین اور جھانسی کی رانی

''وزیراعظم کا فرستادہ آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔سر!'' خادم خاص نے کہا اور میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔رات کا یہ پہر اور وزیراعظم کی طلبی؟ وزیراعظم کے دفتر سے آنے والے شخص سے ملاقات سے پہلے ہی میں بہت سے نتائج اخذ کر لینا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔

''ٹھیک ہے، اسے بٹھاؤ۔میں آتا ہوں۔''

اسٹڈی سے نکل کر میں نے بیڈروم کا رخ کیا۔اس امید پر کہ شاید الزبتھ سو چکی ہو گی لیکن وہ جاگ رہی تھی۔میں نے اس سے مختصراً بتایا کہ وزیراعظم کا پیامبر نیچے میرا منتظر ہے۔وہ بھی چونک اٹھی۔اس کی آنکھوں میں کئی سوال تیرنے لگے لیکن میں ان سوالوں کو خاموشی کا جواب دے کر نیچے اتر آیا۔

''میرا نام ہوٹن ہے، کرنل فلیش مین''۔لونگ روم کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی طویل قامت اجنبی نے اٹھ کر مجھے تعظیم دی۔''لارڈ پالمرسن آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

اس نے کسی قسم کی تمہید کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔بلاوے کا تو اندازہ میں لگا ہی چکا تھا لیکن اس نوعیت کی دعوت بہرحال حیران کن تھی۔

میں اس وقت بالمورل میں تھا اور وزیراعظم سے ملاقات کے لیے لندن جانا پڑتا۔ابھی میں اس شش و پنج میں تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔وہ خود ہی بول اٹھا۔

''لارڈ شپ، اس وقت بالمورل میں ہی موجود ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ چلیں۔میں آپ کے لیے کوچ بھی ہمراہ لایا ہوں۔''

''لل..... لیکن.....اتنی ہنگامی نوعیت.....

''اس کا تو مجھے علم نہیں سر''۔ہوٹن نے کسی قدر بدتمیزی سے میرا جملہ کاٹا ''لیکن مجھے حکم تھا

کہ میں آپ کو آگاہ کروں کہ وزیراعظم ابھی اور اسی وقت آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی تیار ہوا جاتا ہوں''۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے میں پلٹا۔

میرا ذہن مختلف سوالوں کی آماجگاہ بن گیا۔ ان میں سے کسی سوال کا میرے پاس جواب موجود نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوال در سوال نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ رہی سہی کسر الزبتھ نے پوری کر دی۔ اس کی سوالیہ نگاہوں سے میں جھلا اٹھا۔

''ابھی مجھے خود بھی علم نہیں ڈارلنگ!'' میں نے دھیرے سے اپنی بیوی کی ٹھوڑی انگلیوں سے اوپر اٹھائی۔ ''تم سو جاؤ، میں وزیراعظم سے مل کر واپس آتا ہوں۔'' تبھی کچھ بتا سکوں گا کہ ایک ایسی مملکت کے وزیراعظم، جس کی حدود میں سورج غروب نہ ہوتا ہو، کو فوج کے ایک ریزرو کرنل کی ضرورت کیونکر پیش آ گئی ہے؟''

الزبتھ نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی اور اثباتی انداز میں سر ہلا کر الگ ہو گئی۔

دس منٹ بعد میں کوچ میں تھا اور کوچ بالمورل کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

تین میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے میرے ذہن میں متعدد بار یہ مثل گونجی تھی کہ گھوڑے کی پچھاڑی اور حاکم کی اگاڑی سے بچ کر رہنا چاہیے۔ کچھ معلوم نہیں کب کس کا موڈ بدل جائے۔ اس کے باوجود میں وزیراعظم سے ملنے کے لیے چل پڑا تھا اگر دیکھا جائے تو میرے پاس اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟

قلعے پر پہنچ کر میں ایک بار پھر جھجکا۔ ہوٹن نے مرکزی دورے کے بجائے بگھی کو ایک بغلی دروازے کے سامنے رکوایا اور ہم چوروں کی طرح عقبی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر بھاری دروازے کے سامنے مجھے ایک پہرے دار بھی دکھائی دیا جو سویلین کپڑوں میں مجھے گھور رہا تھا، جیسے میں چوری کے ارادے سے اندر داخل ہوا ہوں۔

جس کمرے میں مجھے لے جایا گیا وہ خاصا بڑا تھا لیکن نفاست سے سجا ہوا تھا۔ ہر شے سے امارت کا اظہار ہو رہا تھا۔ آتش دان میں آگ دہک رہی تھی جس کی روشنی قریبی میز پر رکھے فائلوں کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ اس ڈھیر کے عقب سے مجھے ایک صورت جھانکتی ہوئی دکھائی دی جو لارڈ

پالمرسن کے سیکرٹری بیرنگٹن کی تھی۔

اس سے ذرا فاصلے پر تین اور افراد براجمان تھے۔ میں سب کو پہچانتا تھا۔ پہلا ایلن بورگ تھا، دوسرا وڈ اور تیسرا سلطنت برطانیہ کا وزیر اعظم لارڈ پالمرسن تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا اس وقت پالمرسن اپنی پاٹ دار آواز میں شاید کوئی لیکچر جھاڑ رہا تھا۔ اس نے جونہی مجھے دیکھا اپنی بات ادھوری چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔[1]

''آؤ، دوست!'' وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ ''ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔'' پھر وہ اپنے سیکرٹری سے مخاطب ہوا۔ ''بیرنگٹن! ہمارے دوست کے لیے کرسی فراہم کرو۔''

بیرنگٹن اسپرنگ کی طرح اچھلا، اس نے کسی ملازم کو بلانے کے بجائے خود ہی ایک کرسی اٹھا کر اس میز کے ساتھ رکھ دی جس کے عقب میں پالمرسن اور اس کے دونوں ساتھی موجود تھے۔

میری آمد سے ان کی بات ادھوری رہ گئی تھی لیکن ان کے چہروں سے ناخوش گواری کا کوئی تاثر نہ تھا بلکہ مجھے دیکھ کر وہ پرجوش ہو گئے تھے۔

''خوش آمدید، نوجوان کرنل فلیش مین'' میرے بیٹھنے کے بعد لارڈ پالمرسن دوبارہ گویا ہوا۔ ''اسٹاف کرنل آف ہاف پے منٹ''۔ وہ دھیرے سے مسکرایا ''لیکن ابھی اور اسی وقت سے تمہیں پوری تنخواہ ادا کرنے کے احکامات جاری کیے جا رہے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ آج رات اس کمرے میں جو تم سنو گے اس کی خبر تمہارے سائے کو بھی نہیں ہو گی اور تم اپنی زبان سے کبھی کوئی بات نہیں دہراؤ گے۔''

میں اس کی بات سن کر چونکا ضرور مگر اگلے ہی لمحے پرسکون ہو گیا۔ وہ سلطنت برطانیہ کا طاقت ور ترین شخص تھا۔ اس کے احکامات سے روگردانی ممکن نہ تھی۔

''ایسا ہی ہو گا، مائی لارڈ''۔ میں نے سر کو تعظیم کے انداز میں جھکا کر جواب دیا۔

''ویری گڈ''۔ وہ میرے ایک ہی جملے سے گویا مطمئن ہو گیا۔ ''اس سے پہلے کہ میں تم سے مزید بات چیت کروں، لارڈ ایلن بورگ تمہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں اور تمہارا نکتہ نظر سننے کے خواہش مند ہیں۔''

اس نے سر کی جنبش سے بیرنگٹن کو اشارہ کیا اور وہ دوبارہ اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چوبی ڈبہ موجود تھا۔ اس نے ڈبہ مجھے تھما دیا۔ لارڈ ایلن

بورگ نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اپنے ہاتھ سے ڈبہ کھول ڈالوں۔ میں نے جھجکتے ہوئے ڈبہ کھول ڈالا جیسے مجھے اندیشہ ہو کہ اندر سے کوئی مہلک یا زہریلا سانپ برآمد ہوگا لیکن ڈبے کے اندر ایک کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی شے رکھی تھی جو پہلی نگاہ میں مجھے بڑے سائز کے بسکٹ لگے تھے۔

''لارڈ ایلن کو بتاؤ، کرنل یہ کیا ہے؟'' لارڈ پالمرسن کی آواز سنائی دی۔

تب تک میرے نتھنے ایک مخصوص مشرقی خوشبو سے آشنا ہو چکے تھے۔ میں نے مزید تصدیق کے لیے کاغذ ہٹا دیا اور پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''یہ چپاتیاں ہیں، مائی لارڈ''۔ مسکراہٹ اب بھی میرے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی ''ہندوستانی چپاتیاں''

ایلن بورگ نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ''یعنی ایک قسم کا مقامی کیک.....''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

''کیا یہ چپاتیاں دیکھ کر تمہیں کوئی مخصوص واقعہ یاد آتا ہے؟'' یہ ووڈ تھا۔ وہ بغور میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''یہ پورے ہندوستان میں خوراک کے طور پر استعمال ہوتی ہیں''۔ میں نے عام سے لہجے میں کہا اور تینوں نے اس انداز سے سر ہلائے جیسے انہیں میرے جواب سے خاصی مایوسی ہوئی ہو۔

''یہ چپاتیاں ایک تیز رفتار بحری جہاز سے گزشتہ ہفتے ہندوستان سے آئی ہیں، کرنل''۔ لارڈ ایلن بورگ چند ثانیوں کے توقف کے بعد بولا۔ ''یہ جھانسی نام کی ایک جگہ سے ہمارے پولیٹکل ایجنٹ نے بھجوائی ہیں، تم جانتے ہو، اس مقام کو؟ یہ مرہٹہ علاقے میں جمنا کی اترائی کے پاس واقع ہے۔ گزشتہ کئی ہفتوں سے اسی قسم کی چپاتیاں جھانسی میں مقیم ہمارے مقامی بھارتی گیریژن کے سپاہیوں میں تقسیم کی جا رہی ہیں لیکن کھانے کے طور پر نہیں بلکہ سپاہی اسے ایک دوسرے کو ٹوکن کے طور پر دے رہے ہیں .....''

''کیا تم نے پہلے کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ سنا ہے؟'' ووڈ نے لارڈ ایلن کا جملہ کاٹ کر مجھ سے دریافت کیا۔

''نہیں'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' لارڈ ایلن نے قطع کلامی کا برا مانے بغیر بات دوبارہ

شروع کی۔ ''ہمارا ایجنٹ جانتا ہے کہ یہ کہاں سے آتی ہیں۔ مقامی دیہاتی کانسٹیبل جنہیں چوکیدار کہا جاتا ہے انہیں دس دس کی تعداد میں پکاتے ہیں اور ایک ایک، دس سپاہیوں کو بھجوا دیتے ہیں۔ پھر یہ اس سپاہی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مزید دس چپاتیاں پکائے اور اتنی ہی تعداد میں اپنے دوستوں تک پہنچائے۔ یہ طریقہ کار نیا نہیں بلکہ ہندوستان میں چپاتیوں کے ذریعے پیغام رسانی کا عمل خاصا پرانا ہے مگر اس بارے میں تین باتیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ پہلی یہ کہ ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوئے ہیں۔ دوسری یہ کہ مقامی خود بھی نہیں جانتے کہ پیغام رسانی چپاتیوں کے ذریعے ہی کیوں؟ وہ بس اسی قدر جانتے ہیں کہ انہیں چپاتیاں پکا کر آگے تقسیم کرنا ہیں، اور تیسری .....'' لارڈ ایلن نے رک کر چپاتیوں کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا جو اب میز پر رکھا ہوا تھا۔

''وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ چپاتیوں کی تقسیم کسی اہم واقعے کا مظہر ہوتی ہے۔''

میں لارڈ کی طویل تقریر سے خاصا مرعوب تھا لیکن اس کی باتوں پر مجھے حیرت نہ تھی۔ ہندوستان کو میں قریب سے جانتا تھا اور مجھے علم تھا کہ وہ تحیر و تجسس کی دنیا تھی۔ وہ اسرار رموز کی سر زمین تھی اور وہاں کسی بھی وقت کوئی پراسرار واقعہ رونما ہو سکتا تھا۔

لیکن اس بار اس واقعے کی پراسراریت کچھ زیادہ ہی تھی ورنہ سلطنت برطانیہ کے دو وزیر اور ہندوستان کا ایک سابق گورنر جنرل یوں بند دروازوں کے پیچھے بیٹھ کر رازداری سے مجھے طلب نہ کرتے۔

''مگر اس سلسلے میں ایک اور مسئلہ بھی ہے''۔ لارڈ ایلن نے اپنی بات پھر شروع کی۔ ''اور اس مسئلے کی وجہ سے ہمارا ایجنٹ اسے خاصی اہمیت دے رہا ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں صرف تین مواقع پر اس طرح کی چپاتیاں مقامی فوجیوں میں تقسیم کی گئی ہیں ..... 1856ء میں ولور کے مقام پر، پھر بکسر میں اور آخر میں بارک پور میں۔ شاید تم نہیں جانتے کہ ان تینوں مواقع پر چپاتیوں کی تقسیم کے بعد صرف ایک ہی واقعہ رونما ہوا ہے .....'' وہ ڈرامائی انداز میں رکا پھر بولا۔ ''یعنی فوجی بغاوت یا غدر''۔

میں جھانسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کی ذہانت کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ معاملہ واقعی اتنا اہم تھا کہ اسے بند دروازوں کے پیچھے ہی زیر بحث لایا جا سکتا تھا۔ گزشتہ تین واقعات کو مدنظر رکھ کر اگر

لارڈ ایلن یا دوسرے لوگ ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر کسی بغاوت کی بو سونگھ رہے تھے تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہ تھی۔

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں وہ ایسی ہی سرزمین ہے جہاں کسی بھی پراسرار واقعے کی توقع کی جاسکتی ہے۔'' میں نے دوبارہ اپنا جملہ دہرایا۔

میری بات مکمل ہونے کے بعد کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ اچانک پالمرسن بول اٹھا۔

''آل رائٹ، بیرنگٹن!'' اس نے اپنے سیکرٹری کو مخاطب کیا۔ ''تم اور تمہارے ماتحت جا سکتے ہیں''۔

کاغذات سرکانے، کرسیاں کھسکانے اور پھر قدموں کی مدہم سی آہٹ ابھری۔ چند ہی ثانیوں بعد کمرے میں ہم چاروں کے سوا کوئی بھی موجود نہ تھا۔

لارڈ پالمرسن پھر میری طرف متوجہ ہوگیا۔ ''ہندوستان گیریژن میں انقلاب کے ان ٹوکنوں کی تقسیم سے میرے ذہن میں تمہاری وہ رپورٹ تازہ ہوگئی ہے جس میں تم نے بتایا تھا کہ روس، ہندوستان میں مداخلت کا ارادہ رکھتا ہے''۔

میرے ذہن میں ماضی کے بعض واقعات تازہ ہوگئے۔ میں ان دنوں روس میں قید تھا جب یہ منصوبہ مجھ پر منکشف ہوا تھا اور میں نے اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کو اس بارے میں مطلع کر دیا تھا۔

مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق روسی فوجیں پیش قدمی کرتے ہوئے خیبر تک آ پہنچتیں اور ہندوستان میں موجود اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مقامی فوجیوں کو برطانوی حکومت کے خلاف بھڑکا کر بغاوت کرواتیں۔ پھر وہ صورت حال کا فائدہ اٹھا کر بڑی آسانی سے اپنے مقاصد حاصل کر لیتیں لیکن اس بات کو پورا ایک سال ہوگیا تھا اور میرے خیال میں اب روس، برطانیہ اور ہندوستان کے لیے خطرے کا باعث نہیں رہ گیا تھا۔

''روس اب بھی ہندوستان میں دلچسپی رکھتا ہے''۔ پالمرسن کے الفاظ نے میری تمام توقعات اور اندازوں پر پانی پھیر دیا۔ ''ہمیں شبہ ہے کہ چپاتیوں کے اس معاملے میں بھی کہیں نہ کہیں روسی ہاتھ ملوث ہے''۔ وہ چند ثانیے کے لیے چپاتیوں کے بکس کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ''کیا تم جانتے ہو کرنل کہ ہندوستانی نجومیوں اور جوتشیوں نے پیش گوئی کی ہے کہ ہندوستان میں برطانوی راج

جنگ پلاسی کے ٹھیک سو سال بعد ختم ہو جائے گا؟'' اس نے بکس میں سے ایک چپاتی نکالی اور بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔'' اور اگلے جون کی تیئیس تاریخ کو جنگ پلاسی کو پورے سو سال ہو جائیں گے .....اب تم مجھے بتاؤ کیا تم کاؤنٹ نکولس اگنتیف نامی ایک روسی معزز آدمی کے بارے میں کچھ جانتے ہو!''

میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ بات چیت، جھانسی میں تقسیم ہونے والی چپاتیوں سے شروع ہوئی تھی اور مختلف مراحل سے ہوتی ہوئی جانے کہاں پہنچ گئی تھی۔ اب لارڈ پالمرسن مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کاؤنٹ نکولس کو جانتا ہوں۔

لارڈ نکولس، زار روس کے قابل اعتماد مشیروں میں سے ایک تھا اور اس کا شمار بہترین پولیٹکل ایجنٹوں میں ہوتا تھا۔ میں نے فورٹ ولیم میں نہ صرف اسے دیکھا تھا بلکہ اس سے ملاقات بھی کی تھی۔

میں نے اس کے بارے میں لارڈ پالمرسن کو بتایا تو اس نے ناک سکیڑی۔'' وہی ہندوستان میں روسی مداخلت کے منصوبے کا روح رواں تھا''۔ وہ نفرت انگیز لہجے میں بولا۔ پھر وہ ایلن سے مخاطب ہوا۔'' ذرا، کرنل کو اس کے بارے میں مزید حقائق بتانا، مائی لارڈ''۔

ایلن بورگ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی چمکیلی آنکھیں مجھ پر مرتکز کر دیں۔'' کاؤنٹ نکولس گزشتہ سال کے دوران دو بار ہندوستان جا چکا ہے''۔ ایلن گویا ہوا۔'' ہمارے جاسوسوں نے سب سے پہلے اسے غزنی میں دیکھا جہاں سے وہ ایک آفریدی گھڑ سوار کے بہروپ میں پشاور پہنچا لیکن وہاں ہم اسے کھو بیٹھے۔ یقینی طور وہ مقامیوں کے ساتھ مل گیا تھا .....''

'' گستاخی معاف، مائی لارڈ'' میں نے ہمت کر کے دخل اندازی کی۔'' اس کا حلیہ کوئی بھی ہو لیکن نکولس کی آنکھیں ایسی ہیں جنہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ ان میں سے ایک، نصف نیلی اور نصف براؤن ہے''۔

'' وہ اس آنکھ پر پٹی بھی باندھ سکتا ہے''۔ ایلن بورگ نے فوراً ہی میرے استدلال کا جواب فراہم کر دیا۔'' ہندوستان میں بہت سے کانے بستے ہیں۔ بہر حال ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد دونوں مرتبہ اسے جھانسی جاتے دیکھا گیا ہے۔ اس نے دو ماہ وہاں گزارے، قطعاً چھپ کر اور ہمارے آدمی اس کی ان دو ماہ کی سرگرمیوں میں سے ایک لمحے کی رپورٹ بھی نہیں دے سکے کہ

وہ وہاں کس سازش میں مصروف تھا اور اب وہ سازش بھی سامنے آ گئی ہے۔ وہ جھانسی سے واپس جا چکا ہے لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ جھانسی میں اس کی دوبارہ آمد متوقع ہے۔ یہ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کب آنے کا ارادہ رکھتا ہے''۔

میں بدستور خاموشی سے برطانیہ کے ان اہم ترین وزراء کی باتیں سن رہا تھا۔ کچھ نہیں کہہ رہا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مجھے سنانے کے لیے بلایا گیا ہے۔

''صاف الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہو، کرنل''۔ اس بار لارڈ پالمرسن نے بات شروع کی۔ ''کہ ہندوستان میں ایک بارودی سرنگ جھانسی کی زمین تلے موجود ہے جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتی ہے۔ یہ تم جانتے ہو کہ ہندوستان خاصا بڑا علاقہ ہے۔ ہم صرف ایک ہی جھانسی کا سراغ لگا سکتے ہیں لیکن خدا بہتر جانتا ہے کہ وہاں کتنی جھانسیاں اور کتنے نکولس چھپے بیٹھے ہیں''۔

لارڈ پالمرسن یکا یک خاموش ہو گیا۔ یقیناً وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ شاید بات آگے بڑھانے کے لیے کسی فقرے کی تلاش میں تھا۔ بالآخر وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''ہمیں جھانسی اور روس کے مابین تعلقات کا چار سال پہلے علم ہوا تھا جب وہاں کے بوڑھے راجہ کا انتقال ہوا۔ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ جھانسی کا شمار ہندوستان کی امیر ترین ریاستوں میں ہوتا ہے۔ اب ہندوستان کی اس امیر ترین ریاست کا نظم و نسق ایک عورت کے ہاتھ میں ہے۔ اسے رانی کہا جاتا ہے اور وہ مرنے والے راجہ کی بیوہ ہے۔ راجہ کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لیے اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ تخت و تاج کی وارث قرار پائی۔ راجہ سے شادی کے وقت وہ خاصی بڑی عمر کی تھی۔ کہنے کو وہ ایک عورت ہے لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق وہ ان چند لوگوں میں سے ایک ہے جن سے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو زبردست خطرہ لاحق ہے''۔

لارڈ پالمرسن اب براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ''روسی اس رانی کو بارودی سرنگ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں''۔ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ ''لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے استعمال کریں، ہماری خواہش ہے کہ ہم اسے ناکارہ بنا دیں''۔

میں جانتا تھا کہ لارڈ پالمرسن کا مطلب کیا ہے۔ میں اس کا جملہ اپنے منہ سے ادا کر سکتا تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ خود اس کا اظہار کرے۔

پالمرسن چند لمحے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا، پھر بولا۔ ''گزشتہ ہفتے بورڈ آف کنٹرول

نے ایک غیر معمولی ایجنٹ جھانسی بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔اس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس بات کا پتا چلائے کہ روسی وہاں کیا کر رہے ہیں، بھارتی گیریژن کے مقامی سپاہیوں میں بے چینی کے اسباب کیا ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ رانی کو یہ باور کرائے کہ برطانوی راج سے وفاداری اس کے لیے دوسری تمام باتوں سے زیادہ فائدہ مند ہے''۔اس نے زور سے میز پر مکا مارا۔''اور یہ نکولس نامی ایجنٹ اگر دوبارہ جھانسی جائے تو ہمارا ایجنٹ اس سے بھی نمٹے۔کیا خیال ہے،تم اس سے متفق ہو؟''

یہ دیکھ کر میرے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں سکڑ گئے کہ پالمرسن نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور پھر شروع ہو گیا۔

''بورڈ آف کنٹرول نے متفقہ طور پر تمہیں ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے،کرنل ہیری فلیش مین''۔اس نے داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔''میں نے خود اس انتخاب کی منظوری دے دی ہے۔تم نہیں جانتے لیکن میں وزیر خارجہ کے زمانے سے تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔ میری نظر میں تم ایک کامیاب پولیٹکل ایجنٹ ہو اور اس کام کے لیے موثر ترین افسر ہو۔تم نہ صرف ہندوستان کو جانتے ہو بلکہ وہاں بولی جانے والی زبانوں،حتیٰ کہ روسی پر بھی عبور رکھتے ہو۔پھر تم اس کاؤنٹ نکولس کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔مجھے یقین ہے کہ تم ایک بار پھر برطانوی سلطنت کے ہیرو ثابت ہو گے .....''

اور میں دل ہی دل میں اپنی کامیابی کا حساب کرنے لگا۔ماضی میں بھی، میں اپنی انہی کامیابیوں کے باعث دھرا جا چکا تھا اور اب پھر وہی کہانی دہرائی جا رہی تھی۔میں جنگ کابل میں بچ کر آنے والا آخری برطانوی افسر تھا۔مجھے ملکہ کی طرف سے میڈل اور پارلیمنٹ کی جانب سے متعدد اعزازات مل چکے تھے۔

''میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی ہر ممکن صلاحیت بروئے کار لاؤں گا''۔میرے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز برآمد ہوئی۔

''گڈ'' پالمرسن خوشی سے تقریباً اچھل پڑا۔''تمہاری عمر ابھی صرف چونتیس سال ہے۔اگر اسی طرح تم کامیابیوں کے راستے پر گامزن رہے تو مجھے یقین ہے کہ ایک دن سلطنت برطانیہ میں اہم عہدہ حاصل کرو گے۔مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم اس سرزمین پر ہمارا بہترین انتخاب ثابت ہو

گے۔ وہاں جا کر تم اپنے طور پر بھی کام کرنا، ضروری نہیں کہ ہماری اطلاعات ہی درست ہوں اور روسی واقعی جھانسی سے کوئی گٹھ جوڑ کر رہے ہوں۔ ممکن ہے یہ مقامی حکمران کی ہی کوئی کوشش ہو اور وہی فوجیوں کو تاج برطانیہ کے خلاف اکسا رہی ہو''۔

لارڈ پالمرسن نے ہاتھ بڑھا کر کال بیل دبائی۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھلا اور بیرنگٹن اندر داخل ہوا۔

''ہندوستان کے لیے پہلا جہاز کب روانہ ہو رہا ہے؟'' لارڈ پالمرسن نے اپنے سیکرٹری سے دریافت کیا۔

''پیر کو سر!'' بیرنگٹن شاید سب کچھ حفظ کیے بیٹھا تھا۔

''تم جمعے کو لندن روانہ ہو جاؤ گے''۔ پالمرسن نے مجھے حکم سنایا۔ ''پیاری مسز فلیش مین کو یہیں ملکہ کے سائے میں چھوڑ جانا۔ وہاں جانے سے پہلے تم دونوں میرے ساتھ ڈنر کرنا مت بھولنا''۔

ظاہر ہے میرے پاس سوائے اثبات میں سر ہلانے کے چارہ بھی کیا تھا۔

اگلے تین روز بھی میں نے بالمورل میں ہی گزارے سب سے زیادہ وقت بورڈ آف کنٹرول کے ایک نمائندے کے ساتھ گزرا جنہوں نے مجھے میرے جھانسی کے مشن کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا اور جھانسی کی رانی کے بارے میں خاص خاص باتیں بتائیں۔

بالآخر پیر کا دن آ پہنچا اور میں اپنی پیاری بیوی الزبتھ کی آنکھوں کو آنسوؤں کا تحفہ دے کر ایک تیز رفتار بحری جہاز کے ذریعے ہندوستان روانہ ہو گیا۔

فیلڈ مارشل فریڈ رابرٹس نے اپنی جوانی کے دنوں میں ایک بار کہا تھا کہ ''ہر شخص پہلے ایک مہینے کے دوران ہندوستان سے بھرپور نفرت کرتا ہے لیکن پھر اسے اس سرزمین سے اتنا پیار ہو جاتا ہے کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا''۔

میں ذاتی طور پر اس بات سے متفق نہ تھا لیکن ہندوستان کی زندگی مجھے پسند بہت تھی۔ اگر آپ کے پاس دولت ہے تو آپ زندگی بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر نہ صرف خود کھا سکتے ہیں بلکہ ایک فوج ظفر موج کے رازق بھی بن سکتے ہیں۔ اگر آپ زمیندار ہیں تو مزارعوں کی پوری فوج دن

رات آپ کے لیے غلہ اگاتی ہے اور آپ عیش کرتے ہیں لیکن برطانیہ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو ہندوستان کو برطانیہ سے منفرد کر سکتی۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ ہندوستان ایک متوسط ملک ہے جہاں انگریز اپنی روایات کا پرچم بلند نہیں رکھ سکتا۔ یہ میری نوجوانی کے اندازے تھے۔ اسی لیے 1856ء میں جب میں بمبئی میں جہاز سے اترا تو مجھے بہت کچھ بدلا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سولہ سال پہلے ہندوستان کا سفر کیا تھا تو مجھے چار ماہ لگے تھے لیکن اس بار اس سے نصف وقت صرف ہوا تھا۔

بمبئی سے ہی مجھے تہذیب کی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ ٹیلی گراف کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی پہلی ریلوے چلنے لگی تھی۔ سفید چہرے پہلے سے نسبتاً زیادہ تھے اور ہندوستان جسے پہلے ایک خوفناک جنگل سے تشبیہہ دی جاتی تھی اب ایک ترقی پذیر ملک محسوس ہونے لگا تھا۔

جب میں پہلے یہاں آیا تھا تو کلکتہ سے پشاور تک کا سفر دنیا کا نصف چکر لگانے کے برابر تھا لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ اسی طرح سکھوں، مرہٹوں اور افغانوں کے ساتھ لڑائیاں قصہ پارینہ بن چکی تھیں بلکہ اب یہ ایک ایسی بادشاہت تھی جو تاج برطانیہ کے لیے منفرد منفعت کا باعث تھی۔

بمبئی میں میرا سب سے پہلا واسطہ ایک مقامی بیسوا اور اس کے ساتھی سے پڑا۔ مدرسوسا میں بیٹھ کر ان سے بات چیت کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہندوستان کا ماحول ہی نہیں یہاں کے رہنے والوں کا انداز بھی بدل گیا ہے۔

''لاہور اور الہ آباد میں کئی نئی فیکٹریاں لگائی گئی ہیں جو ایسٹر سے پہلے کام شروع کر دیں گی۔'' لڑکے نے مجھے بتایا۔ ''کئی نئے چرچ تعمیر ہوئے ہیں اور جب مختلف شہروں میں یونیورسٹیاں .....''

یونیورسٹیاں؟'' میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن کیا کالوں کے لیے؟''

لڑکے کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا کیونکہ وہ بھی مقامی ہی تھا۔

''ہاں'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''یہ یونیورسٹیاں مقامیوں کے لیے ہی ہیں اور یقین رکھو، گورے مغرور ہم بہت جلد اس دھرتی کے سینے پر آباد دوسرے ملکوں سے بے حد آگے نکل جائیں گے''۔

میں نے اس کے انداز تخاطب کا برا نہیں منایا کیونکہ میں نے پہلے اس کی انا پر ضرب لگائی تھی۔ میری جگہ کوئی اور انگریز ہوتا تو وہ یقیناً اسے گولی مار دیتا لیکن میری نظر میں وہ بہر حال انسان تھا۔

''کیا مقامی اب بھی فوج میں جانے سے خوفزدہ ہیں؟'' میں نے موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا۔

''مقامی کبھی فوج میں جانے سے نہیں گھبراتے''۔ وہ بھڑک اٹھا۔ ''ہندوستانی بزدل نہیں۔ وہ فوج میں صرف انگریز کی غلامی کی وجہ سے نہیں جاتے۔ تمہاری آنکھیں اگر کھلی ہوں تو تم دیکھ سکتے ہو کہ اب بھی محاذ جنگ پر سب سے پہلے گولی کھانے والے ہندوستانی ہی ہوتے ہیں''۔

''خواہ وہ جھانسی ہی کیوں نہ ہو؟'' میں نے اپنی بات کا ردعمل اس کے چہرے پر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ سپاٹ تھا۔ یعنی لڑکا جھانسی یا اس کے بدلتے ہوئے حالات کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہ تھا۔

بعد میں جب ہمیں تنہائی ملی تو میں نے لڑکی سے دریافت کیا کہ ہندوستان میں چپاتیاں کھانے کے علاوہ کس کام آتی ہیں۔ تو اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور مجھے پرلے درجے کا شرارتی قرار دیا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اس سے مزید بات چیت، وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

اگلے دو روز میں نے بمبئی میں ادھر ادھر آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارے۔ میں اچھی خاصی ہندی بول لیتا تھا۔ چنانچہ میں نے سر پر پگڑی باندھی، کوٹ اور پاجامہ پہنا اور بند بازار میں نکل گیا۔ میرا حلیہ ساحل مکران سے آنے والے کسی تاجر کا سا تھا۔ جب کہ انداز ایسا تھا کہ پہلی بار بمبئی آیا ہوں۔

میں ہر چھوٹے بڑے علاقے میں گیا اور وہاں کے لوگوں سے بات چیت کر کے ہندوستان کے عمومی حالات دریافت کیے۔ میری خواہش تھی کہ میں جلد از جلد جھانسی کی اس بوڑھی عورت کے بارے میں معلومات حاصل کروں، مشن انجام دوں اور یہاں سے نکل بھاگوں۔ بمبئی میں سر کھپانے کی وجہ یہ تھی کہ بقول لارڈ ایلن بورگ، جھانسی اس وقت بھیڑیوں کا بھٹ تھا اور میں اس بھٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہر قسم کے خطرات سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔

تیسرے دن میں ایک چھکڑے کے ذریعے شمال مشرق میں واقع جھانسی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں دوران سفر سڑک کے کنارے بنی ہوئی سرایوں اور مسافر خانوں میں ٹھہرتا اور کان کھلے رکھ کر زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا لیکن اب تک کسی نے بھی اس سازش کے بارے میں کوئی بات نہ کی تھی جو میں بالمورل کے ایوانوں میں سن کر آیا تھا۔

———◈◈◈———

مہو میں، میں میک جانی نکلسن کے پاس رکا [2] جسے میں نے پندرہ سال قبل جنگ افغانستان کے موقع پر دیکھا تھا لیکن طویل عرصے کے بعد ملنے کے باوجود اس نے مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہ کی۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح ملے اور ہم نے بہت سی باتیں کیں جن میں قدرتی طور پر رانی جھانسی کے بارے میں حوالے بھی شامل تھے۔

میں نے اسے بتایا کہ میری منزل جھانسی ہے کیونکہ وہاں چپاتیوں اور روسیوں کا شاخسانہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ وہ میری بات خاموشی سے سنتا رہا۔ جب میں بات مکمل کر چکا تو اس نے یوں سر ہلایا جیسے معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہو۔

''جھانسی'' اس نے ایک طویل سانس لی ''ڈاکوؤں اور ٹھگوں [3] کا دیس ہے۔ وہاں کے رہنے والے درہ خیبر کے باسیوں کی طرح سخت جان ہیں۔ مجھے یہ سن کر بھی قطعی کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ وہاں روسی ایجنٹ مصروف کار ہیں۔ ویسے ہماری اطلاع کے مطابق گزشتہ کئی سالوں سے وہاں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود وہاں سپاہیوں مین چپاتیوں کی تقسیم کا معاملہ گھمبیر معلوم ہوتا ہے''۔

جانی کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جھانسی کو دوسرا افغانستان سمجھ رہا ہے۔ جب میں نے اس بارے میں اسے بتایا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ جھانسی دوسرا افغانستان بن رہا ہے یا نہیں'' وہ پرسوچ انداز میں بولا۔ ''لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ان دنوں پورے ملک کی فضا ہی بدلی بدلی سی دکھائی دے رہی ہے۔ بمبئی اور کلکتہ میں بیٹھ کر صورت حال کی سنگینی کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن جب ہم اندرونی علاقوں میں جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہم ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھے ہوئے ہیں جو کسی بھی لمحے پھٹ

سکتا ہے۔ ذرا اپنے اردگرد کی صورت حال پر نگاہ دوڑاؤ، شمالی سرحدوں پر ہمارا مقابلہ دنیا کی مضبوط ترین قوموں یعنی پٹھانوں، سکھوں اور بلوچوں سے ہے۔ اندرون ملک رجواڑوں اور ریاستوں میں بٹے ہوئے وہ شہزادے اور راجے، مہاراجے ہیں جو تینوں وقت کھانے میں انگریزوں کے سر مانگتے ہیں۔ یہ دشمنیاں اس وجہ سے نہیں ہیں کہ ہم نے ان کی سرزمین پر زبردستی قبضہ کیا ہے بلکہ اس کی بنیاد انگریز کی وہ پالیسیاں ہیں جن کے تحت وہ اس علاقے کو تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنانا چاہتا ہے ہم نے یہاں اصلاحات کی ہیں .....''

وہ بول رہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ تہذیب وتمدن کا گہوارہ تو مشرق کو کہا جاتا ہے' بھلا انگریز اس کے امین کیسے ہو گئے۔ جس زمانے میں بغداد کی شاہراہیں روشنیوں سے منور ہوتی تھیں لندن کی گلیاں بدبودار کیچڑ سے لتھڑی ہوتی تھیں۔ جب سلطنت اسلامیہ میں علم کے چراغ جلتے تھے اُس وقت یورپ کے کتب خانوں پر ہو کا عالم طاری تھا لیکن اب جانی کہہ رہا تھا کہ ہندوستانی اسی وجہ سے ہمارے دشمن ہو گئے ہیں کہ ہم نے انہیں تہذیب سکھانے کی کوشش کی تھی' ہونہہ' بے وقوف!

جانی' جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن اُس کی ان باتوں سے میرے مشن کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اُس نے ایک طویل عرصہ ہندوستان میں گزارا تھا۔ اس لیے شاید وہ یہاں کی مٹی سے کوئی جذباتی وابستگی پیدا کر بیٹھا تھا لیکن میں نے اُس پر اُن خدشات کا اظہار نہیں کیا' شاید اخلاق غالب آ گیا تھا یا آدابِ میزبانی کا لحاظ مجھے روک گیا تھا۔

لیکن جب میں بندھیل کھنڈ میں داخل ہوا تو مجھے جانی کی بہت سی باتوں میں سچائی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ ایک پہاڑی اور سنگلاخ علاقہ تھا جس میں جنگل' ڈھلانیں اور وادیاں بھی موجود تھیں مجھے یہاں کوئی سفید فام دکھائی نہیں دیا۔ تہذیب کی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ صرف وہ قلعے جو مرہٹوں نے جابجا پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنا رکھے تھے دور سے انتہائی خوفناک اور ہیبت ناک منظر پیش کرتے تھے۔ اگر یہی ان کی تہذیب تھی، تو بے حد خوفناک تھی۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ خیبر اور جھانسی میں کوئی فرق نہیں۔

میں حقیقی معنوں میں خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن صرف اس امید کو گرہ میں باندھے آگے بڑھتا رہا کہ ہم اس ملک کے حاکم ہیں۔ یہ الگ بات تھی کہ مجھے ہر قدم پر اپنی حاکمیت کسی نہ کسی پہاڑی قلعے

کے عقب میں غروب ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

گومگو کی اس کیفیت میں جھانسی آ گیا۔ پہاڑوں میں چکراتی سڑک ایک موڑ گھومی اور جھانسی میرے سامنے تھا۔ پہاڑوں کی چوٹی پر بنا ہوا ایک عظیم الشان قلعہ اور کسی دیوتا کے قدموں میں بیٹھی ہوئی دیوی کے مانند اس کی فصیلوں کے آس پاس بسا ہوا شہر۔

یہ میری توقعات سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ قلعہ کی دیواریں کوئی چار میل کے رقبے کو گھیرے میں لیے ہوئے تھیں جبکہ اس کے اوپر کی فضا ہزاروں مکانوں سے اٹھنے والے دھوئیں کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھی۔ شہر کی ایک جانب برطانوی کیمپ اور چھاؤنی واقع تھی لیکن یہ اس عظیم الشان قلعے کے سامنے بہت چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔

میرے ذہن نے فوراً قلابازی کھائی۔ کابل میرے سامنے تھا۔ حصار کی شکست یاد آ گئی۔ ہم دس ہزار کی نفری لے کر گئے تھے اور مٹھی بھر لوگ بچ کر واپس آ سکے تھے۔ جھانسی اور بالا حصار میں کوئی فرق نہ تھا لیکن میں نے خود کو تسلی دی کہ یہاں صورت حال مختلف ہوگی۔ جھانسی برطانوی سرکار کے اندر واقع تھا اور پھر یہاں سے کوئی سو میل کے فاصلے پر جی ٹی روڈ کے ساتھ برطانیہ کی عظیم فوجی چھاؤنی تھی جہاں سے مدد آنے کی صورت میں ہم رانی کو تو کیا اس کی آنے والی سات نسلوں تک کو کچل سکتے تھے۔

میں نے سر جھٹکا اور اسکین کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جس کی رپورٹوں سے یہ سارا شاخسانہ شروع ہوا تھا۔ میرا رخ چھاؤنی کی طرف تھا جو بہ مشکل چالیس بنگلوں پر مشتمل تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ صورت حال سے بری طرح خوفزدہ ہوگا لیکن جب میں دفتر میں داخل ہوا تو ایک نوجوان آفیسر کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر خود میری بھی تھکن اتر گئی۔ اس نے خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور میرا سامان ملازمین کے ذریعے میری رہائش گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ میں بھی اجازت لے کر غسل وغیرہ کے لیے چلا گیا۔ ڈنر مجھے اسکین کے ساتھ ہی کرنا تھا اس لیے فراغت پا کر میں اس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔

وہ میرا ہی منتظر تھا۔ ڈنر پر اس نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً ہی اصل موضوع پر آ گیا۔

''میرے علاوہ اور کوئی شخص آپ کی یہاں آمد کا مقصد نہیں جانتا۔'' وہ بولا ''یا پھر کلکتہ میں

مسٹر کرشور کو شبہ ہوگا لیکن وہ بھلا آدمی ہے اور کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔ اس کے علاوہ سنگلور کے کمشنر ارسکائن کو بھی اس مشن کے بارے میں علم ہے .....'' وہ ایک لمحے کے لیے جھجکا لیکن پھر بول اٹھا۔ ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ انہوں نے کلکتہ سے کسی کو بھیجنے کے بجائے آپ کو کیوں بھیجا ہے؟''

''اس لیے کہ وہ قتل کروانا چاہتے ہیں۔'' میں بلا جھجک کہہ گیا۔ اس علاقے میں بعض روسی جاسوس سرگرم عمل تھے اور ان سے نمٹنا کس عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ یہ بات صحیح بھی تھی کیونکہ لارڈ پالمرسن نے خود اس طرف اشارہ کیا تھا۔ ''اس کے علاوہ ان کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ کلکتہ والے، تم اور کمشنر ارسکائن اب تک اس عورت کو قابو میں کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ پھر ان چپاتیوں کا معاملہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لارڈ پالمرسن نے مجھے بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''لارڈ پالمرسن؟'' اس کی کھلی آنکھوں میں حیرت منجمد ہوگئی تھی ''تو معاملہ اتنی دور تک جا پہنچا۔''

''جن معاملات کی بازگشت حکومت کے ایوانوں تک جا پہنچے وہ عام نہیں ہوا کرتے۔'' میں نے فلاسفرانہ انداز میں کہا اور اسکین صرف پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔

''کیا تم نے روسیوں کو اس علاقے میں داخل ہوتے دیکھا ہے؟'' میں نے چند ثانیے اُس کی حالت سے محظوظ ہونے کے بعد دریافت کیا۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ پریشان ہوگیا تھا۔ ''یہ .....درست ہے۔'' وہ ہکلانے لگا۔ ''مجھے اس بارے میں کلکتہ سے خبر ملی تھی۔ ہمارے سرحدی جاسوسوں نے انہیں تین بار اس علاقے میں داخل ہوتے دیکھا ہے اور ہر بار مجھے مطلع کیا گیا ہے لیکن اگر وہ نہ بتاتے تو مجھے کبھی اس بارے میں علم نہ ہو سکتا تھا۔''

''اوہ!'' میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ ''تو تم کلکتہ کے اتنے ہی دست نگر ہو؟''

''نن .....نہیں .....مم.....میرا یہ مطلب نہ تھا بلکہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جونہی کوئی مشکوک شخص سرحد پار کرتا ہے مجھے اس بارے میں آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ میرے مقامی جاسوس بھی ہیں جو پل پل کی خبریں مجھے فراہم کرتے ہیں۔'' اس نے شرمندگی سے سر جھکا

لیا تھا۔

''کیا ان میں کوئی یک چشم بھی شامل ہے؟''

''یس سر!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اس کی ایک آنکھ آدھی نیلی آدھی بھوری ہے۔ اس لیے وہ اس پر پٹی باندھے رہتا ہے۔''

''میں اُسی کو قتل کرنے یہاں آیا ہوں' کیپٹن اسکین۔'' میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ ''اگر تمہارا کوئی تیز طرار آدمی یہ کام کر سکتا ہو تو میں اُسے بھی اس کی اجازت دے دوں گا۔''

''کیوں نہیں سر! میرے آدمیوں میں بعض پنداری ڈاکو بھی شامل ہیں۔ وہ یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ہمیں ان روسی جاسوسوں کے بارے میں قبل از وقت معلوم ہو جائے۔''

میرے منہ کا ذائقہ ایک بار پھر کڑوا ہو گیا۔ دل ہی دل میں' میں نے اسکین کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا۔ اُسے پولیٹکل ایجنٹ کے بجائے کسی اصطبل کا نگراں ہونا چاہیے تھا۔

''تو کیا کلکتہ والوں نے تمہیں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا؟'' میں نے کسی قدر ناراضگی سے پوچھا۔

''اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ یہاں موجود ہیں۔'' اسکین نے اعتراف کیا۔ ''ہمیں از خود اس بات کا یقین تھا کہ وہ چپاتیوں کے معاملے میں ملوث ہیں لیکن پھر یہ شاخسانہ بھی دم توڑ گیا۔ اکتوبر کے بعد سے ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اور بارہویں این آئی رجمنٹ جس کے سپاہیوں میں چپاتیاں تقسیم کی گئی تھیں اب مکمل طور پر پرسکون ہے۔ رجمنٹ کا کرنل یہ سن کر ہی پریشان ہو گیا تھا کہ میں نے کلکتہ کو چپاتیوں کے معاملے کی رپورٹ دے دی ہے چنانچہ اس نے حلفیہ طور پر ہمیں یقین دلایا ہے کہ اس کے سپاہی سلطنت برطانیہ کے وفادار رہیں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ اُس کا اعتماد بجا ہے کیونکہ میرے اپنے آدمیوں نے ہی رجمنٹ کے سپاہیوں کی سن گن لی ہے اور انہیں بھی کوئی مشکوک بات نظر نہیں آئی۔''

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ اسکین خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا اُس نے مجھے بلانے کی کوشش نہیں کی تھی کچھ دیر کے بعد میں خود ہی گویا ہوا۔

''لیکن میری نظر میں معاملہ ختم نہیں ہوا۔'' میرا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ ''اس کے علاوہ ایک

اور چیز بے حد اہم ہے اور وہ ہے رانی۔ میں اُس سے ملاقات کی کوشش بھی کروں گا۔ ممکن ہے میں اس سلسلے میں کوئی قابل قدر کام انجام نہ دے سکوں کیونکہ وہ تمہیں اور ارسکائن کو اپنے غیر دوستانہ رویے سے متاثر کر چکی ہے لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟ اس لیے میں چاہوں گا کہ تم پرسوں رانی سے میری ملاقات کا اہتمام کرو۔ تب تک میں آرام کروں گا اور شہر دیکھوں گا۔ فی الحال تم اس کے بارے میں مجھے اپنی ذاتی رائے سے آگاہ کرو۔"

کیپٹن اسکین کے جسم میں تناؤ سا آ گیا۔ اس نے بیئر کی بوتل کھولی اور میرا اور اپنا گلاس بھرنے کے بعد دو تین چسکیاں لے کر چپ بیٹھ گیا۔ شاید وہ بات شروع کرنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

"ممکن ہے کہ آپ کو یہ بات عجیب سی لگے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں جب سے یہاں ہوں، میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے متعدد مرتبہ محل میں اس سے ملاقات کی ہے لیکن وہ ہمیشہ پردے کے پیچھے رہی ہے۔ اور بسا اوقات اس کا دیوان ہی اس کی طرف سے بات کرتا رہا ہے۔ اس کے باوجود کہ اس کے شوہر کے مرنے کے بعد حکومت نے اُسے خاصی مراعات دی ہیں ہم صحیح طور پر اُس سے معاملات طے نہیں کر پائے۔ ایک زمانے میں ارسکائن کے ساتھ اس کا رویہ خاصا دوستانہ رہا ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں رانی کو اس کے خول سے باہر نہیں نکال سکا۔ وہ کسی اور ہی فطرت کی مالک ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس کے شوہر بوڑھے راجہ گنگا دھر کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اور وہ خود یعنی راجہ بھی عجیب و غریب کردار کا مالک رہا ہے۔ وہ عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کیا کرتا تھا حتیٰ کہ کبھی کبھار تو چوڑیاں بھی پہنا کرتا تھا ....."

اسکین نے چند ثانیے رک کر میرا ردعمل جاننے کی کوشش کی لیکن میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"راجہ گنگا دھر نے ایک لڑکے کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔" اسکین نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ "لیکن گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے اسے تخت نشین ہونے کی اجازت نہیں دی۔ البتہ ڈلہوزی نے رانی کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ملکہ کے سامنے اپنا کیس پیش کرے لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا اور اس کے منہ بولے بیٹے دامودھر کو تخت پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی لیکن سرکاری طور پر رانی لکشمی بائی کو جھانسی کا حکمران تسلیم کر لیا گیا اور ہم نے اپنا سیٹ اپ اس انداز میں ترتیب دیا کہ رانی کو کوئی بات ناگوار نہ گزرے۔ ہمارے پاس یہاں سپاہیوں کی صرف ایک ہی بٹالین

موجود ہے جب کہ سرکاری انتظامی امور نمٹانے کے لیے تیس برطانوی سویلین ہیں لیکن قانون رانی کا ہی چلتا ہے اور یہاں کے رہنے والے اُسی کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں۔''

''تو کیا وہ اس سے مطمئن نہیں؟''

''نہیں۔'' اسکین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ یہ بات جانتی ہے کہ اُس کے اختیارات برطانوی سرکار کی مٹھی میں ہیں اور وہ انہیں اُسی قدر استعمال کر سکتی ہے جس قدر مٹھی کھلے گی۔ اس کے علاوہ وہ اب بھی اپنے آنجہانی راجہ کی خواہش پوری کرنا چاہتی ہے۔ کلکتہ والوں نے جھانسی کے خزانے کا ایک چوتھائی حصہ اور رانی کے زیورات بھی اپنے قبضے میں کر رکھے ہیں اور رانی انہیں بھی بھولنے کو تیار نہیں۔''

''دلچسپ خاتون ہے۔'' میں نے تبصرہ کیا۔ ''اور اس کے ساتھ بہت خطرناک بھی۔''

''سیاسی طور پر یقیناً خطرناک ہے۔'' کیپٹن اسکین نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ''اسے جب بھی موقع ملا ہم پر کاری ضرب لگائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ چپاتیوں کی تقسیم کے معاملے نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اُس کی اپنی کوئی فوج نہیں لیکن اس حقیقت سے تاج برطانیہ کو بھی انکار نہیں کہ جھانسی کا ہر شخص پیدائشی لڑاکا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے اشارے پر صرف شہر میں بسنے والے ہی نہیں بلکہ پہاڑوں میں رہنے والے ڈاکو بھی جھانسی کے دفاع کے لیے میدان میں کود پڑیں گے۔ کیونکہ وہ اپنی رعایا کا بے حد خیال رکھتی ہے۔ غریبوں کے لیے اس کے دل میں بہت جگہ ہے۔ اپنے دربار میں کسی پر ظلم نہیں کرتی۔ اُس کی خدا ترسی جھانسی میں ایک مثال کا درجہ رکھتی ہے اور وہ دن بھر میں کم و بیش پانچ گھنٹے رعایا کی شکایات سنتی اور ان پر احکامات صادر کرتی ہے حالانکہ کہتے ہیں کہ جب وہ لڑکی تھی تو بے حد سخت دل اور سفاک ہوا کرتی تھی لیکن اب اس نے خود کو یکسر بدل لیا ہے۔ اس کی تربیت بوڑھے پیشوا کے دربار میں کسی مرہٹہ شہزادے کے طور پر کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ نشانہ بازی، تلوار بازی اور گھڑ سواری میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ ہمیشہ بے حد نرم رہا۔ میں اس کے باوجود اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں اس لیے کہ اگر آپ نے اسے رام کر لیا تو ہندوستان میں انگریز ایک عرصے تک آرام کی نیند سوئے لگا۔''

کیپٹن اسکین کے اندیشے درست تھے۔ سیاسی لحاظ سے وہ واقعی انگریزوں کے لیے خطرہ بن کر اُبھر رہی تھی۔ جس کا قلع قمع پہلی فرصت میں ہی بے حد ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رات کو سونے

سے پہلے جب میں نے اپنے بنگلے کی کھڑکی سے قلعہ جھانسی کا جائزہ لیا تو میرے دل کی عجیب سی کیفیت ہوگئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں رانی سے ملاقات کے لیے جاتے وقت لانسرز کے ایک دستے کو بطور محافظ ساتھ لے جاؤں گا۔

◈◈◈

صبح اٹھ کر میں نے سوچا کہ میں کلکٹر کرشور اور مقامی رجمنٹ کے کرنل سے بھی ملاقات کرلوں تاکہ رانی کے بارے میں اُن کے خیالات بھی معلوم ہو جائیں۔ اس طرح مجھے وسطی ہندوستان کی آہنی خاتون کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

میں نے سائیس کو اپنی پونی تیار کرنے کے لیے کہا۔ میں نے وردی نکال کر زیب تن کی اور سائیس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ سائیس لوٹتا' اسکین آ گیا۔ اس کا چہرہ یوں لال بھبوکا ہو رہا تھا جیسے کئی میل بھاگ کر آیا ہو۔

''خیریت' اسکین؟'' میں بھی حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔ ''اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''وہ .....سر..... میں نے رانی کو پیغام بھیجا تھا کہ لندن سے آئے ہوئے ایک محترم کرنل فلیش مین اگلے روز آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں .....''

''تو کیا رانی نے انکار کر دیا؟'' میں نے بچوں کی طرح بے صبرے پن کا مظاہرہ کیا۔

''نہیں۔'' اسکین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''رانی نے حکم دیا ہے کہ کرنل فلیش مین چونکہ ملکہ معظمہ کے فرستادہ ہیں اس لیے آداب کا تقاضا ہے کہ انہیں فوراً شرفِ ملاقات بخشا جائے۔ آپ کو پہلی فرصت میں محل طلب کیا گیا ہے۔''

''اوہ!'' میں اسی قدر کہہ سکا در حقیقت مجھے تو ملاقات ہی مشکوک دکھائی دیتی تھی۔ کہاں یہ کہ رانی نے خود ہی اذنِ باریابی بخش دیا تھا۔ میں خاموش رہ کر رانی کے سیاسی قد و قامت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ بے شک وہ ذہین تھی اور اس قابل تھی کہ جھانسی جیسے علاقے پر بلاشرکت غیرے حکومت کر سکتی۔ اُس نے انگریزوں کو یعنی ہمیں' ہماری ذہانت سے مارنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر میں بول اٹھا۔ ''میں ملنے جاؤں گا' تم مجھے محل میں جانے کے لیے لانسرز کا ایک محافظ دستہ فراہم کر دو۔''

''آئی ایم سوری سر!'' ہمارے پاس گھڑ سوار دستہ نہیں لیکن اگر ہوتا بھی تو ہم اُسے شہر کے اندر بھیجنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس کے علاوہ رانی کی طرف سے ملنے والی دعوت صرف آپ کے لیے ہے۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکوں گا۔''

''کیا؟'' میں تقریباً چلا اُٹھا۔ ''بے وقوف قوم ہے یہ۔ یہاں کس کی حکومت ہے' سرکار کی یا اس معمولی سی رانی کی۔'' میں دراصل اس خطرناک قلعے میں تنہا نہیں جانا چاہتا تھا لیکن یہ بھی چاہتا تھا کہ میرے سیخ پا ہونے کو اسکین میری بزدلی سے تشبیہہ نہ دے۔ ''تم لوگوں نے اس عورت کو ضرورت سے زیادہ سر چڑھا لیا ہے۔ وہ ہماری ملکہ تو نہیں۔''

''وہ یہی سمجھتی ہے۔'' اسکین نے نپے تلے انداز میں کہا اور میں بھنا کر رہ گیا لیکن ظاہر ہے کہ کیا کر سکتا تھا۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔

بہر حال تھوڑی دیر بعد میں ایک بار پھر وردی تبدیل کر رہا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اپنا لانسر یونیفارم پہنا تھا۔ ساتھ ہی میں نے اپنا ریوالور اور تمام تمغے بھی سجائے تھے۔ سرحدی علاقوں میں انسان کو اُس کی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر پرکھا جاتا تھا لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی اور انسان کی حیثیت کا انداز اُس کی دولت سے اور تمغوں سے ہی لگایا جاتا تھا۔ یہ درست تھا کہ صرف ایک گھڑ سوار پوری سلطنتِ برطانیہ کے جاہ و حشم کا ترجمان نہیں بن سکتا تھا لیکن وہ اپنی ذاتی حیثیت میں کسی ایک کو تو متاثر کر ہی سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں پوری توجہ سے تیار ہوا تھا۔

پھر میں نے اپنے صندوق سے دو پیکٹ نکالے اور انہیں سنبھال کر اپنی خرجین میں رکھا اور ایک سائیس کو ساتھ لے کر بنگلے سے باہر نکل آیا۔ سائیس بھی اس لیے ہمراہ لیا تھا کہ وہ مجھے راستہ بتا سکے۔

جھانسی شہر چھاؤنی سے دو ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ میں نے رفتار سست ہی رکھی تھی تاکہ دوران سفر اپنے ماحول کا بغور جائزہ لیتا رہوں۔ جس شاہراہ پر ہم سفر کر رہے تھے وہ دونوں طرف سے چھوٹی بڑی عمارتوں اور مندروں میں گھری ہوئی تھی۔ بہت سے چھکڑے اور پالکیاں بھی رواں دواں تھیں جن سے فضا گرد آلود ہو رہی تھی۔ سفر کرنے والوں میں سے زیادہ تر دیہاتی تھے جو خریداری کرنے شہر آئے تھے۔

ایک جگہ خوبصورت لباس پہنے ہوئے کوئی درجن بھر افراد دکھائی دیے تو میرے سائیس نے

مجھے بتایا کہ یہ رانی کے ذاتی باڈی گارڈ ہیں۔ وہ سب سرحدی پٹھان تھے۔ اُن کے لباس ایک جیسے تھے اور انہوں نے پگڑیوں پر سرخ رنگ کے اسکارف لپیٹ رکھے تھے۔ مجھے اسکین نے بتایا تھا کہ رانی کے پاس اپنی فوج نہیں ہے لیکن ان باڈی گارڈوں کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ جھانسی کی اس حکمراں کے پاس ایسے بہت سے افراد موجود ہوں گے۔

پھر جھانسی شہر کا دفاعی نظام بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ قلعے کی فصیل کم و بیش بیس فٹ بلند تھی۔ اس کے ساتھ ایک خندق تھی۔ فصیل پر جابجا برجیاں بنی ہوئی تھیں جن میں بیٹھے ہوئے تیر انداز اور توپچی پوری فوج کا صفایا کر سکتے تھے۔

شہر کے داخلی دروازے پر ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا اور ہم نہایت اطمینان سے محل کی سمت چل پڑے۔ راستہ ایک بارونق بازار سے ہو کر گزرتا تھا جہاں اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ میں نے جھانسی کے بارے میں جو تصور قائم کیا تھا وہ ایک دم ہی ختم ہو گیا۔

لیکن جب ہم محل تک پہنچے تو مجھے اپنے اگلے پچھلے تمام اندازوں پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ کیا خوبصورت نظارہ تھا۔ محل، فصیل شہر سے خاصے فاصلے پر ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے تعمیر کیا گیا تھا۔ اُس کے اردگرد ایک باغ تھا۔ محل کی بلند و بالا دیواروں پر جنگ اور شکار کے مناظر کی عکاسی کی گئی تھی۔

محل کے بیرونی دروازے پر ایک دراز قد پٹھان نے ہمارا راستہ روکا۔ جو لباس سے گائیڈز (4) کا سابق سپاہی لگتا تھا۔

''کرنل صاحب، رانی سے ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں۔'' میرے سائیس نے دراز قد پٹھان کو بتایا ''انہیں رانی نے خود طلب کیا ہے۔''

پٹھان نے کھا جانے والی نگاہوں سے کئی مرتبہ سرتاپا میرا جائزہ لیا۔ اس کی نظروں سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دل میں گوروں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

''کیا میں کرنل صاحب کا اسم گرامی پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟'' پٹھان نے بہ ظاہر خاصے ادب کا مظاہرہ کیا تھا لیکن انداز ایسا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اس گدھے کا نام کیا ہے؟

''کرنل ہیری فلیش مین'' سائیس کے بجائے میں نے خود جواب دیا۔ ''میں لندن سے آیا ہوں اور وزیر اعظم برطانیہ کا خصوصی پیغام میرے پاس موجود ہے۔''

''اوہ!'' پٹھان کے لہجے میں واضح تبدیلی آ گئی۔ ''میں ابھی دیوان صاحب کو خبر کرتا ہوں۔''

وہ اُس کوٹھی کی طرف بڑھ گیا جو پہرے داروں کے لیے بنائی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور پہرے دار کوٹھی سے نکل کر محل کی اندرونی سمت جاتا دکھائی دیا۔ وہ بھی پہلے کی طرح پٹھان ہی تھا۔

وہ پٹھان کوٹھی میں ہی رک گیا جب کہ میں گھوڑے سے اُتر کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے کسی نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔ مجھے توہین کا احساس تو ہوا لیکن میں اپنی خفت مٹانے کے لیے یوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے یہ بات میرے لیے کوئی اہمیت ہی نہ رکھتی ہوں۔

محل کا اندرونی باغ میرے سامنے تھا۔ پائیں باغ کے ایک کونے میں شاید کوئی شعبدہ باز اپنے کمالات دکھا رہا تھا۔ اس کے اردگرد چند ایک عورتیں بھی پالکی میں موجود تھی۔ قدرتی طور پر میری نگاہیں ان پر جیسے جم سی گئیں۔ وہ مرہٹہ عورتیں تھیں اور ان میں سے چار تو اس قدر خوبصورت تھیں کہ میں انہی قدموں پر کھڑے کھڑے ان کی تعریف میں پورا دیوان مرتب کر سکتا تھا۔

اُن میں سے ایک دبلی پتلی خوبصورت سی لڑکی جس نے سنہری ساڑھی باندھ رکھی تھی ایک جھولے نما پالکی میں بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر غضب کا وقار اور تمکنت تھی۔ وہ مجھے کسی یونانی دیو مالائی کہانی کی حسین دیوی لگی تھی۔

باقی تینوں لڑکیاں بھی اُس کی مانند آسمان سے اتری ہوئی اپسرائیں لگتی تھیں۔ ایک اُس کے برابر بیٹھی تھی جب کہ دوسری نے پالکی کے نزدیک ہی پڑی کرسی سنبھال رکھی تھی۔ اس کے سر پر ایک ننھا منا تاج تھا جس میں لگے ہوئے صرف ایک ہیرے کی قیمت میری سال بھر کی تنخواہ سے زیادہ تھی۔

چوتھی لڑکی سفید ساڑھی میں ملبوس ان کے نزدیک کھڑی تھی۔ لباس سے وہ خادمہ نظر آ رہی تھی لیکن وہ بھی اتنی خوبصورت تھی کہ کوئی شہزادہ آدھی سلطنت اس پر نچھاور کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر تو میں مسحور کن انداز میں انہیں دیکھتا رہا لیکن پھر میرا ہاتھ انہیں تعظیم دینے کے لیے اپنے ہیٹ کی جانب بڑھا۔ ابھی میری انگلیوں نے ہیٹ کا گوشہ چھوا ہی تھا کہ پٹھان مجھے کوٹھی سے نکلتا دکھائی دیا۔ وہ انتہائی کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

پٹھان نے مجھے تولنے کے انداز میں میرے گرد ایک چکر لگایا اور پھر میرے سائے پر زور سے تھوک دیا۔ خادمہ شاید اس وقت ہماری ہی طرف متوجہ تھی۔ میں نے اس کے نقرئی قہقہے کی آواز سنی اور باقی تینوں لڑکیوں نے چونک کر میری سمت دیکھا۔

میں نے توجہ بانٹنے کے لیے رانی کے محل کے در و دیوار کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ باہر دھول مٹی اور بے پناہ گرمی تھی لیکن محل کی دیواروں کے اندر تو جیسے دنیا ہی دوسری تھی۔ ایسا خوبصورت باغ اس سے پہلے میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ دور دور تک پھل اور پھول دار درخت اور پودے نظر آ رہے تھے۔ درختوں پر بندر اٹکھیلیاں کر رہے تھے جب کہ بعض دوسرے رنگ برنگے اور خوبصورت پرندے اِدھر سے اُدھر اڑتے پھر رہے تھے۔ باغ کے بیچوں بیچ سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک فوارہ تھا جو پانی کی پھواریں چاروں طرف پھینک رہا تھا۔ دیواروں میں منقش محراب بنے ہوئے تھے۔ جبکہ زرق برق اور قیمتی لباس پہنے ہوئے خادم اور خادمائیں اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔

جس وقت لارڈ پالمرسن نے جھانسی کو ہندوستان کی دولت مند ترین ریاست قرار دیا تھا' میں نے یقین نہیں کیا تھا لیکن محل کی شان و شوکت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ لارڈ کی بات درست تھی۔

کوئی نصف گھنٹے تک میں بے چینی سے ٹہلتا رہا لیکن مجھے کوئی پُرسانِ حال دکھائی نہ دیا۔ وہ پٹھان جس نے مجھ پر تھوک دیا تھا، دوبارہ کوٹھی میں جا چکا تھا۔ سائیس نے گھوڑے کو ایک تھان پر باندھ دیا اور خود ایک سنگی بنچ پر جا بیٹھا جو قریبی درخت کے سائے تلے تھی۔

بالآخر محل کی جانب سے ایک گرانڈیل شخص مجھے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔

''کرنل فلیش مین؟'' اس نے آتے ہی دریافت کیا۔ میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میرے ساتھ تشریف لائیے۔'' جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پلٹ کر محل کی جانب چل دیا۔ ظاہر ہے مجھے بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔

اندرونی دروازے اور طویل راہداریوں سے گزر کر ہم پہلی منزل پر واقع دربار ہال میں جا پہنچے۔ وہاں ایک بار پھر مجھ پر دولت کا رعب طاری ہو گیا۔ کمرہ کیا، اچھا خاصا عجائب گھر تھا۔ ہر جانب امارت کا اظہار نظر آ رہا تھا۔ دیواروں پر ریشمیں پردے لہرا رہے تھے۔ خم دار چھت سے

ہیرے لگے فانوس اور جھالر لٹک رہے تھے۔ فرش پر قیمتی قالین بچھے تھے۔ جابجا سجاوٹ کی مختلف اشیاء رکھی تھیں جو تمام کی تمام سونے، چاندی یا ہاتھی دانت کی تھیں۔ اس بار میرے ساتھ اتنا کرم ضرور کیا گیا کہ بیٹھنے کو نشست فراہم کر دی گئی تھی۔ میرے علاوہ بھی درجن بھر مرد اور عورتیں گدیلوں پر بیٹھے ہوئے تھے جو سب کے سب خوبصورتی کے بے مثال شاہکار تھے۔

میں ابھی دائیں کونے میں موجود ایک حسین مجسمے کا پورا جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا کہ کہیں ایک گانگ بج اٹھا جس کی گونج یقینی طور پر پورے محل میں سنائی دی ہوگی۔

گانگ بجتے ہی ہر ایک مشینی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اُن کی تقلید میں اپنی نشست چھوڑ دی۔ چند ہی ثانیوں بعد ایک دروازہ کھلا اور درباری لباس پہنے ہوئے چھوٹے قد کا مرہٹہ اندر داخل ہوا۔

''باادب' باملاحظہ' ہوشیار' آبروئے ہندوستان' مہارانی جھانسی' رانی لکشمی بائی جلوہ افروز ہوتی ہیں .....باادب' باملاحظہ .....''

چوبدار کی آواز کے ساتھ ہی دھیمے سروں میں موسیقی بجنی شروع ہوگئی اور دربار میں موجود تمام افراد نے ایک دیوار کی طرف رخ کر کے سر خم کر دیے۔

میں نے بھی پلٹ کر دیوار کو دیکھا اور اُسی وقت یہ راز مجھ پر منکشف ہوا کہ وہ دیوار نہ تھی بلکہ ہاتھی دانت سے تراشا ہوا ایک مہین سا پردہ تھا جس نے دربار کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ رانی اسی پردے کی آڑ سے دربار منعقد کرتی ہوگی۔

زرق برق لباس پہنے ہوئے ایک اور شخص پردے کے برابر کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے حاضرین کو بیٹھنے کے لیے کہا اور خود پردے کے عقب سے کچھ سننے لگا۔ وہ ریاست کا دیوان تھا۔

''کرنل ہیری فلیش مین'' اچانک وہ میری طرف مڑا۔ ''میں جھانسی کی حکمران مہارانی لکشمی بائی کی جانب سے آپ کو دربار میں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

''میں شرفِ ملاقات بخشے جانے پر عظیم راجپوت مہارانی کا شکر گزار ہوں' دیوان محترم!'' میں نے بھی جواباً اسی خلوص کا مظاہرہ کیا تھا۔

''ہمیں امید ہے کہ جھانسی کا سفر اور یہاں قیام آپ کے لیے خوش گوار تجربہ ہوگا۔'' دیوان

دوبارہ بولا۔ ''مہارانی دریافت فرماتی ہیں کہ آپ کے اس سفر کی غرض وغایت کیا ہے؟''

''میں سلطنتِ برطانیہ کی ملکہ معظمہ کی جانب سے مہارانی کے لیے نیک تمناؤں کا پیغام لے کر آیا ہوں۔'' انہوں نے مہارانی کی خدمت میں اپنے تحفوں کے پھول روانہ کیے ہیں اور دعا کی ہے کہ مہارانی کے اقبال کا سورج ہمیشہ بلند رہے اگر مہارانی کی اجازت ہو تو میں تحفے پیش کرنے کی جسارت کروں۔''

دیوان پردے کی طرف مڑا۔ اس نے مہارانی سے سرگوشیوں میں کچھ کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''مہارانی دریافت فرماتی ہیں کہ تحفے کی نوعیت کیا ہے؟''

''یہ ملکہ معظمہ، پرنس آف ویلز اور شہزادہ البرٹ کا ایک فوٹوگراف ہے جو دونوں حکمرانوں کے درمیان دوستانہ جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔''

میں نے آگے بڑھ کر تصویر دیوان کو تھما دی۔ دیوان فوراً پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ مجھے تصویر کی پیکنگ کھولے جانے کی آواز سنائی دی۔ کچھ اور سرگوشیاں بھی ابھریں اور بالآخر دیوان دوبارہ نمودار ہوا۔

''مہارانی فرما رہی ہیں کہ تصویر میں نظر آنے والا بچہ کون ہے؟''

''ولی عہد سلطنتِ برطانیہ، پرنس آف ویلز۔''

دیوان نے میرا جواب مہارانی تک پہنچایا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''مہارانی اپنی حکمران بہن کے اس گرانقدر تحفے پر شکریہ ادا کرتی ہیں۔''

ٹھیک اُسی لمحے پردے کے عقب سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے تصویر زمین پر گر گئی ہو یا جان بوجھ کر اُسے پھینک دیا گیا ہو۔ میں ایک لمحے کے لیے چونکا لیکن پھر پرسکون ہو گیا۔ کچھ کہنا یا کسی ردعمل کا اظہار کرنا سفارتی اور سیاسی آداب کے خلاف تھا۔

دیوان ایک بار پھر رانی سے گفت وشنید میں مصروف ہو گیا۔ ذرا دیر بعد جب وہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے اُس سے پوچھا۔ ''کیا مہارانی مجھے نجی ملاقات کا شرف بخشیں گی؟''

اس بار دیوان نے مہارانی سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ''رانی کسی سے نجی طور پر ملاقات نہیں کرتیں۔ تمام ملاقاتیں دربار میں ہوتی ہیں۔''

''لیکن یہ ایک اہم مسئلہ ہے جسے میں بھرے دربار میں بیان نہیں کر سکتا۔''

''جھانسی کی حدود میں کسی ایسے مسئلے کو اہمیت نہیں دی جاتی کرنل! جسے دربار میں موجود کسی شخص سے چھپایا جائے''۔ دیوان سپاٹ انداز میں بولا۔

''میری ملاقات کا تعلق جھانسی اور سلطنتِ برطانیہ کے باہمی تعلقات سے ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس کے نتیجے میں صورتِ حال میں ایک بڑی تبدیلی آئے گی۔''

دیوان نے ہدایت کے لیے پردے کے پیچھے دیکھا اور پھر پر امید نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''کیا اس کا تعلق ہز ہائی نیس کے تخت کی بحالی' اُن کے متبنیٰ بیٹے کی تخت نشینی اور جھانسی کی دولت کی واگزاری سے ہے؟'' دیوان نے پر جوش انداز میں پوچھا۔ ''کیا آپ اس سلسلے میں نئی تجاویز لے کر آئے ہیں؟''

میں نے دل ہی دل میں دیوان کو بُرا بھلا کہا۔ ظالم نے ایک ہی جملے میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔

''جو کچھ میں نے کہنا ہے، تنہائی میں کہوں گا۔'' میں نے فوری طور پر دامن چھڑانے کی غرض سے کہا۔

''کیا آپ کے پاس ایسی تجاویز موجود ہیں؟'' دیوان نے ایک بار پھر پردے کے پیچھے جھانک کر پوچھا۔

''میں بھرے دربار میں کوئی بات نہیں کر سکتا'' میں نے رانی کے شوق کو ہوا دی۔

دیوان رانی سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ وہ آپس میں میری بات پر صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ مجھے بھی سنائی دے رہی تھی۔

''آپ ایسی کون سی بات کہنا چاہتے ہیں۔ جو آپ سے پہلے کیپٹن اسکین نے نہیں کہی؟'' دیوان نے مجھ سے پوچھا۔

''میں رانی کے علاوہ کسی کو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔''

دیوان پھر پردے کے عقب میں غائب ہو گیا۔ میں چشم تصور سے پردے کے پیچھے کا حال دیکھنے لگا۔ کرخت چہرے اور سخت لہجے کی مالک رانی' ریشمی شال اوڑھے اپنے دیوان کو ہدایت دے رہی ہو گی۔ میں شاید ابھی مزید اندازے لگاتا لیکن دیوان برآمد ہو چکا تھا۔ اس کے تیور کچھ

بدلے بدلے دکھائی دے رہے تھے۔

''رانی فرماتی ہیں کہ انہیں موجودہ ملاقات جاری رہنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی۔''

دیوان کے جملے سے مجھے جھٹکا سا لگا۔ دوسرے الفاظ میں رانی مجھے کہہ رہی تھی کہ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' اگر آپ کے پاس رانی کے لیے سرکار کی جانب سے کوئی نئی خبر نہیں ہے تو آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا مجھے خاصی مایوسی ہوئی تھی لیکن اس عالم میں بھی میں پروٹوکول کے تقاضے نہیں بھولا تھا۔ میں نے ایڑیاں بجا کر پردے کے عقب مین براجمان رانی کو سیلوٹ پیش کیا۔

''سلطنت برطانیہ کا یہ خادم شرف ملاقات بخشے جانے پر رانی کا بے حد مشکور ہے۔''

میں نے اپنے برابر رکھا ہوا دوسرا پیکٹ اٹھایا اور مڑ کر خارجی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر موجود پہرے دار نے فوراً پٹ میرے لیے وا کر دیا لیکن ابھی میں نے دو چار قدم ہی اٹھائے تھے کہ دیوان کی آواز سنائی دی۔

''کرنل! میں بڑی معذرت کے ساتھ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کے ہاتھ میں موجود پیکٹ میں کیا ہے؟''

مجھے اسی سوال کی توقع تھی ''یہ میری اپنی ملکیت ہے دیوان محترم!'' میں نے مڑ کر جواب دیا۔

''لیکن یہ اُسی طرح لپٹا ہوا ہے جیسے رانی کی خدمت میں پیش کیا جانے والا پیکٹ لپٹا ہوا تھا۔'' دیوان نے ٹٹولنے والی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''کیا یہ بھی کوئی تحفہ ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔ ''یہ بھی ایک تحفہ ہی تھا۔''

وہ مجھے کچھ کہنے کے بجائے پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ رانی سے چند جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے دوبارہ باہر جھانکا۔ ''کیا آپ اسے بھی رانی کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لائے تھے؟''

میں ایک لمحے کے لیے جھجکا لیکن پھر میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں دیوان محترم'' میں نے لہجہ بدستور دھیما ہی رکھا تھا۔ ''یہ رانی کے لیے میرا ذاتی تحفہ تھا لیکن میرے ملک میں ایسے نجی تحائف باہمی ملاقات کے موقع پر ہی دیے جاتے ہیں کیونکہ اس سے دونوں فریقین کی عزت و

توقیر میں اضافہ ہوتا ہے۔''

میں نے جھک کر دیوان اور پردے کو تعظیم دی اور پھر دروازے کی طرف بڑھا۔

''ذرا ٹھہریئے' کرنل!'' دیوان تقریباً چلا اٹھا۔ پردے کے عقب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی جو ظاہر ہے کہ رانی کی تھی۔ دیوان مزید مشورے کے لیے پردے کے پیچھے چلا گیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ برآمد ہوا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''دربار برخاست کیا جاتا ہے، خواتین وحضرات!'' اُس نے کمرے میں موجود لوگوں سے کہا اور پھر میری طرف مڑا ''آپ یہیں رکیں گے' کرنل!''

اُس نے جھک کر پردے کو تعظیم دی اور پھر ایک محرابی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند ہی لمحوں میں دربار میں موجود تمام افراد ایک ایک کر کے باہر چلے گئے اور میں اپنے تحفے سمیت وہاں تنہا رہ گیا۔

میں آہستہ روی سے پردے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے پردے پر انگلی سے دستک دی لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے چند ثانیے انتظار کیا لیکن جب کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو میں نے دوبارہ ہاتھی دانت کے مہین پردے کو کھٹکھٹایا۔

''یور ہائی نیس!'' میں نے انگریزی میں پردے کے عقب میں موجود رانی کو مخاطب کیا۔ جواب میں مجھے دھیمے سروں کی موسیقی ہی سنائی دیتی رہی۔

میں نے مزید کچھ دیر انتظار کیا۔ جب کوئی بات ظہور پذیر نہ ہوئی تو میں نے ایک جرأت مندانہ اقدام کا فیصلہ کیا۔ میں نے تلے قدموں سے آگے بڑھا اور پردہ سرکا دیا۔

وہاں میری توقعات کے برعکس کوئی سنہرا تخت نہیں تھا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی قیمتی فرنیچر تھا۔ فرش پر ویسے ہی قالین بچھے تھے جیسے دربار کے خارجی حصے میں تھے۔ شیشے کی دیواروں اور چھت کے بارے میں بھی میرے اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔

وہاں صرف ایک ہی شے موجود تھی۔ ریشمی رسیوں کے سہارے ایک بہت بڑا جھولا چھت سے لٹک رہا تھا جس پر خوبصورت اور نرم گدیلے بچھے ہوئے تھے۔ ان گدیلوں پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جو میرے علاوہ اس کمرے کی واحد متنفس تھی۔

لڑکی کی خوبصورتی دیکھ کر میں وہیں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے ایسے لگا جیسے

آسمان سے کوئی اپسرا اتر کر جھولے پر آ بیٹھی ہو۔ اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ رنگت دودھ ملی کافی جیسی تھی۔ کھڑی اور ستواں ناک' سیب کی قاشوں جیسے باریک اور سرخ ہونٹ' رات کی تاریکی ایسی سیاہ زلفیں جو بڑی نفاست سے ایک چٹیا میں گوندھی گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرصت میں بیٹھ کر بنایا تھا۔

وہ سفید رنگ کی ساڑھی اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ جس سے اُس کا ملکوتی حسن اور زیادہ تابناک ہو گیا تھا۔ اُس کے سر پر ایک خوبصورت سا طلائی تاج تھا جس کے وسط میں ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔

میں کھڑا رہا اور وہ اطمینان سے جھولا جھولتی رہی۔ کچھ دیر اسی طرح گزری' پھر اُس کا ایک سبک پیر آگے بڑھا جسے اُس نے قالین پر ٹکا کر جھولا ایک جگہ روک دیا۔ اُس نے اپنا ایک بازو اُٹھا کر ریشمی رسی پکڑی اور میرا سراپا جائزہ لینے لگی۔

میں نے فوراً اُسے پہچان لیا۔ یہ اُن چار لڑکیوں میں سے ایک تھی جنہیں میں نے محل کے پائیں باغ میں دیکھا تھا۔ وہ وہاں جھولے کے پاس کھڑی تھی۔ یقیناً رانی کی خادمہ ہوگی؟ تب پھر جھولے والی خاتون .....؟

''تمہاری مالکن کہاں ہے؟'' بالآخر میرے ہونٹوں نے جنبش کی۔

''مالکن؟'' جھولے پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے اپنی صراحی دار گردن کو جھٹکا دیا۔ اُس کے بولنے سے کمرے میں جیسے نقرئی گھنٹیاں بج اٹھی تھیں۔ ''میری کوئی مالکن نہیں' میرا نام لکشی بائی ہے اور میں جھانسی کی مہارانی ہوں۔''

میں یوں چونکا جیسے مجھے کسی نے بلندی سے نیچے دھکا دے دیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ یہ نوجوان لڑکی اور جھانسی کی مہارانی.....

گزشتہ تین ماہ میں' میں نے اُس کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اُس کے مطابق رانی کو ایک خشک مزاج اور اکھڑ قسم کی بڑھیا ہونا چاہیے تھا۔ لارڈ پالمرسن نے بھی مجھے یہی بتایا تھا کہ راجہ گنگا دھر سے شادی کے وقت رانی بڑی عمر کی لڑکی تھی لیکن اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کتنا عرصہ راجہ کی زوجیت میں رہی تھی اور شادی کے وقت اس کی صحیح عمر کیا تھی؟

میں نے خود کو سنبھال کر دوبارہ جھولے پر بیٹھی ہوئی لڑکی کا جائزہ لیا۔ اُس کے دعوے میں بہ

ظاہر کوئی جھوٹ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اُس کا لباس' تاج اور زرو جواہر چیخ چیخ کر اُس کی امارت کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اُس نے ..... زندگی محکومی میں نہیں' حاکمیت میں گزاری ہے۔ اُس کے خدوخال کی ایک ایک لکیر اُسے جھانسی کی بلاشرکتِ غیرے رانی ثابت کر رہی تھی۔

''تم کوئی تحفہ ہماری نذر کرنا چاہتے تھے۔ کرنل؟'' اُس آسمانی حور نے موسیقی کی مدھر تانوں سے ملتی جلتی آواز میں دریافت کیا۔

میں نے کسی معمول کی طرح اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے آگے بڑھ کر اپنا پیکٹ اُسے تھما دیا۔ میں رعبِ حسن سے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

رانی میرے تحفے کو ہاتھ میں لیے تولتی رہی۔ جب کہ نگاہیں مجھ پر ہی مرتکز رہیں۔ میں بھی یک ٹک اُسے گھورے جا رہا تھا۔ بالآخر اُسی کی تیز آواز سنائی دی۔

''یہ تم ہمیں اس طرح گھور کیوں رہے ہو' کرنل؟'' اُس نے اک ادائے بے نیازی سے پلکیں جھپکائیں۔

''مم..... معافی چاہتا ہوں' یور ہائی نیس'' میں ایک دم گڑبڑا گیا۔ ''دراصل مجھے توقع نہیں تھی کہ ایک ملکہ آپ جیسی .....'' میں کہنا چاہتا تھا کہ خوبصورت' دلربا اور نوجوان' لیکن جان بوجھ کر جملہ بدل دیا ..... ''زیرک' عقلمند اور قیافہ شناس ہوگی۔''

''..... کیا اس ملکہ کی طرح؟'' اس نے ایک کشن پر رکھی ملکہ وکٹوریہ اور شہزادہ البرٹ کی تصویر کی جانب اشارہ کیا۔

''آپ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں' ہر میجسٹی'' میں نے کمال سیاست سے کام لیا ''دونوں ہی اپنے اپنے ممالک میں کامیاب ترین ملکائیں ہیں۔''

رانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آئی۔ اس نے پیکٹ دوبارہ مجھے تھما دیا۔ ''اسے کھولو کرنل! ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ سلطنتِ برطانیہ کا سفیر ہمارے لیے کیا تحفہ لایا ہے؟''

میں نے پیکنگ پھاڑ کر ایک چھوٹا سا بکس نکالا اور پھر تحفہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ فرانسیسی پرفیوم کی ایک شیشی تھی۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یہ بات عجیب سی لگے کہ میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے لندن سے جھانسی، صرف یہ پرفیوم کی ایک شیشی دینے کے لیے پہنچا تھا

لیکن میرا تجربہ ہے کہ عورت کا سب سے پسندیدہ تحفہ پرفیوم ہی ہوتا ہے۔

رانی نے ڈھکن کھول کر اپنی ہتھیلی پر تھوڑا سا اسپرے کیا اور ہتھیلی کو ناک سے لگایا۔

''فرنچ؟'' اُس نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھ سے پوچھا۔ ''خاصے امیر آدمی لگتے ہو؟''

''پہلے نہیں تھا لیکن آج کے بعد شاید ہو جاؤں۔'' میں نے ذومعنی انداز اختیار کیا۔

''کیا مطلب؟''

''میں ایک خوبصورت ملکہ کے حضور جو لمحے گزار کر جا رہا ہوں وہی میری زندگی کی دولت ہیں؟''

''اوہ!'' رانی مسکرائی تو اُس کے گالوں میں گڑھے پڑنے لگے لیکن اگلے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''تمہیں براہِ راست ملاقات پر اصرار کیوں تھا کرنل؟'' سوال سے صاف ظاہر تھا کہ اُسے اچانک ہی میری اور اپنی حیثیت کے تفاوت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ''ایسی کون سی اہم بات تھی جو صرف تم ہم سے ہی کرنا چاہتے تھے۔''

میں جھجکا تو وہ ایک ہلکورا سا لے کر جھولے سے نیچے اتر آئی۔ ''آؤ ہمارے ساتھ''۔ وہ اپنی ساڑھی درست کرتے ہوئے ہولے ہولے ٹیرس کی سمت بڑھی۔ کیا قیامت کی چال پائی تھی اس خوبصورت رانی نے۔ میری نگاہیں جیسے اس سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ میں کسی معمول کی طرح اُس کے پیچھے چل دیا تھا۔

ویسے دل ہی دل میں، میں رانی کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ پالمرسن اور ایلن بورگ نے مجھے اُس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ محض خوشبو سے ہی اندازہ لگا گئی تھی کہ پرفیوم فرانسیسی ہے۔ ایسی عورت سیاسی لحاظ سے بھی خاصی زیرک ہو سکتی تھی اور محض ہوا کا رخ دیکھ کر حالات کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

میری سوچوں کا سفر زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ ٹیرس پر پہنچ کر وہ وہاں رکھے نرم و گداز گدیلوں پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی کیپ زمین پر رکھ دی اور باادب اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''یور ہائی نیس۔'' میں نے بصد احترام اُسے مخاطب کیا۔ ''میں مسٹر ارسکائن یا کیپٹن اسکین کی طرح نپے تلے جملے نہ بول پاؤں گا کیونکہ میں بنیادی طور پر ایک سپاہی ہوں، سفارت کار یا سیاستدان نہیں اور یہ بات آپ بھی جانتی ہوں گی کہ ایک سپاہی کبھی لفاظی کا ماہر نہیں ہو سکتا۔''

رانی نے اک ادائے خاص سے اثبات میں سر ہلایا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ میں چند ثانیے اُس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا لیکن اُس کی خاموشی کو اذنِ اظہار سمجھ کر اپنی جھانسی آمد کے مقاصد بیان کرتا چلا گیا۔

میں نے اُسے تفصیل کے ساتھ اُن عوامل کے بارے میں بتایا جو جھانسی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرکار کے درمیان وجہ تنازع بن گئے تھے۔ میں نے اُسے آگاہ کیا کہ گزشتہ چار سالوں سے جھانسی کے مسائل ملکہ معظمہ کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں اور اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ انہیں فوری طور پر حل کر دیا جائے۔ میں نے رانی کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر جھانسی اور تاج برطانیہ کے مابین مفاہمت ہو جاتی ہے تو وہ اور انگریز عرصہ دراز تک دوستوں کی مانند ہندوستان میں رہ سکیں گے۔

میں اپنی بات چیت کے دوران رانی کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بطور خاص دیکھتا رہا تھا لیکن جھانسی کی اس ملکہ نے حتی المقدور کوشش کی تھی کہ چہرے کی ایک لکیر بھی اُس کے اندرونی جذبات کی عکاسی نہ کرنے پائے۔

میں خاموش ہوا تو رانی نے ایک طویل سانس لی ''کیا جو کچھ ہو چکا ہے، تم اُس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے اختیارات رکھتے ہو؟''

میں گڑبڑا گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ رانی براہِ راست اس انداز میں حملہ کرے گی۔

''مم..... میں..... اپنی رپورٹ سے لارڈ پالمرسن کو آگاہ کر دوں گا۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''جھانسی کی سات پشتوں پر احسان کرو گے تم؟'' رانی کی غراہٹ بلند ہوئی۔ ''ارسکائن اور اسکین نے بھی ہمیں یہی یقین دہانی کرائی تھی۔ صرف یہی نہیں ہمارے نمائندوں نے لندن میں بورڈ آف کنٹرل سے مذاکرات کیے ہیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کسی نے نہیں سنی۔''

''مگر اب معاملہ خاصا مختلف ہے، یور ہائی نیس'' میں نے تول تول کر لفظ ادا کیے۔ ''میرا خیال کہ ہمیں نئے سرے سے تمام معاملات پر بات چیت.....''

''تم گوری چمڑی والے خود کو کیا سمجھتے ہو کرنل؟'' وہ بھڑک اٹھی۔ ''کیا جھانسی کی رانی کے پاس ان لغویات کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ ہمارے پاس بات چیت کے لیے اب کچھ نہیں۔ سب

کچھ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ تمہارے خیال میں کیا سرکار ہمارے مسائل نہیں جانتی؟ وہ ایک ایک لفظ سے آگاہ ہے اس لیے تم بھلا کیا.....''

''کیا میں ذاتی حیثیت میں کچھ پوچھ سکتا ہوں' مہارانی؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے قطع کلامی کی۔

اُس نے رک کر یوں مجھے دیکھا جیسے کوئی شیرنی اپنے شکار پر چھلانگ لگانے سے قبل اُسے نگاہوں میں تولتی ہے۔

''اب کیا پوچھنا چاہتے ہو تم؟'' اُس کا لہجہ اب بھی چٹانوں کی مانند سخت تھا۔

''صرف یہ کہ کیا مہارانی صرف اپنے متبنّٰی بیٹے کو ہی جھانسی کا راجہ بنانے پر اصرار کریں گی یا اس کے بدلے بعض دیگر مراعات کو بھی قبول کر لیں گی؟'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''اگر کوئی درمیانی راہ ہو تو بھی مجھے بتائیں، میں آپ کی گزارشات اُن تک پہنچانے میں فخر محسوس کروں گا۔''

رانی نے کہنی کے سہارے گدیلوں سے ٹیک لگالی۔ وہ پلکیں جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ میں نے بھی اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور موقع سے فائدہ اٹھا کر حسن کے اس مجسمے کو اپنی آنکھوں کے راستے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں بساتا رہا۔

میرا ذہن تیزی سے صورتِ حال کا تجزیہ بھی کر رہا تھا۔ رانی کا سیخ پا ہونا بجا تھا۔ چار سال ہو گئے تھے مختلف انداز سے مذاکرات ہوتے ہوئے لیکن رانی کے کسی ایک مطالبے کا بھی مثبت جواب نہیں دیا گیا تھا۔

میں اپنی سوچوں اور رانی کے حسن میں کچھ اس قدر کھویا ہوا تھا کہ جب اُس نے اچانک پلکیں اٹھائیں تو میں چوروں کی طرح گڑبڑا سا گیا لیکن رانی کی تیز نگاہوں سے میری گڑبڑاہٹ چھپی نہ رہ سکی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر محض چند ثانیے کے لیے مسکراہٹ آئی اور پھر اُس کے ابرو کمان کی مانند کھنچ گئے۔

''اب ساری باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ کرنل؟'' اس کا انداز طنزیہ تھا۔ ''انہیں میری گزارشات اور مطالبات بتائے جا چکے ہیں۔ ایک بار نہیں' چار سال میں متعدد مرتبہ ان کی توجہ جھانسی کے بحران کی جانب مبذول کرائی گئی ہے لیکن انہوں نے ہمیشہ اسے حل کرنے میں پہلوتہی سے کام لیا ہے۔''

''مایوس موکل کو نیا وکیل ڈھونڈنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔'' میں نے اپنی بہترین مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔ رانی تا دیر دلچسپ نگاہوں سے مجھے گھورتی رہی' بالآخر اٹھ کر ٹیرس کی جالی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی جہاں سے جھانسی شہر کا نظارہ ہوتا تھا۔ ''اگر یور ہائی نیس کھلے دل کے ساتھ مجھ سے بات کرنے کی زحمت کریں تو.....''

''ٹھہرو!'' اس نے مڑے بغیر کہا اور بدستور شہر کا نظارہ کرتی رہی۔ میں نے بھی اُس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنا مناسب سمجھا تھا۔

''اگر لارڈ پالمرسن.....؟'' بالآخر وہ گویا ہوئی.....جس انداز میں اس نے ولیڈ پیر سٹن کہا تھا اگر لارڈ پالمرسن خود سن لیتا تو اس پر قربان ہو کر فوری طور پر اُس کی مراعات بحال کرنے کا اعلان کر دیتا.....''اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جھانسی کے معاملے میں اُس سے بعض غلطیاں ہوئی ہیں تو اس کے اعتراف میں بھی اُس کا کوئی مفاد پوشیدہ ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ مفاد کیا ہے اور نہ ہی توقع کرتے ہیں کہ تم ہمیں بتاؤ گے لیکن ہمیں اس بات کا علم ضرور ہے کہ جھانسی کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی رضا کارانہ طور پر نہیں کی جا رہی.....'' رانی نے سر کو جنبش دی اور پلکوں کی جھالر اٹھا کر معنی خیز انداز میں مجھے گھورا''.....ہماری یہ بات پتھر پر لکیر ہے کرنل! لیکن اس کے باوجود اگر وہ واقعی جھانسی کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے میں سنجیدہ ہے تو اسے کہو کہ وہ جھانسی کا خزانہ بحال کر دے جو ہمارے شوہر کے دیہانت کے ساتھ ہی ہمارے تصرف میں آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن اُس پر سرکار برطانیہ نے غاصبانہ قبضہ جما لیا۔''

''اس کے علاوہ یور ہائی نیس؟'' میں نے اُسے شہ دی۔

''وہ پہلے یہ تو کر گزرے'' رانی کے لہجے میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔ ''کیا تمہارے خیال میں وہ اتنا عالی ظرف اور کھلے ذہن کا ہو سکتا ہے کرنل؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا' یور ہائی نیس۔'' میں نے نگاہیں جھکا کر جواب دیا لیکن اگر آپ کا مقدمہ مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے تو لارڈ پالمرسن.....''

''کیا ہمارا مقدمہ تم خود پیش کرو گے' کرنل؟''

''یہی میرا مشن ہے' یور ہائی نیس۔''

''تو اس کا مقصد یہ ہوا کہ پہلے ہمیں' سلطنتِ برطانیہ کے فرستادے کو قائل کرنا ہوگا؟'' اس

نے استفہامیہ انداز میں مجھے دیکھا ''اور پھر تم ہمیں بتاؤ گے کہ اس مقدمے کے کمزور پہلو کیا ہیں؟ ہمیں نصیحت کرو گے کہ کس طرح کے الفاظ استعمال کیے جائیں؟''

''یس' یور ہائی نیس'' میں نے اُس کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو وہ مسکرا رہی تھی۔ ''میں ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد کرنے کی کوشش.....''

اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں حیرت سے اُسے تکنے لگا۔

''یہ دلدل میں پھنسے ہاتھی کو نکالنے کی ناکام کوشش کے سوا کچھ نہ ہوگا' کرنل'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''لارڈ پالمرسن جھانسی کی رانی کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے تاکہ اپنی پراسرار حکمتِ عملی کو مکمل کر سکے۔ اسی لیے اس نے رانی کو دعوت دی ہے کہ وہی معاملات دوبارہ پیش کرے جن سے سرکار کئی سالوں سے منکر ہے لیکن کیا اُس نے کوئی وکیل بھیجا ہے؟ یا کمپنی کے کسی بااختیار وکیل کو روانہ کیا ہے.....نہیں.....ایک معمولی سے سپاہی کو بھیجا ہے کہ وہ رانی کے ساتھ مول تول کرے''

اُس نے دونوں ہاتھ باندھ کر اپنے سینے پر رکھ لیے اور تولنے والی نگاہوں سے مجھے سرتاپا گھورنے لگی۔ ''کیا اُس نے ایک خوبصورت بیوہ عورت کو ورغلانے کے لیے اپنے حسن خانے کا بہترین انتخاب بھیجا ہے؟ اس کا خیال ہوگا کہ جھانسی کی رانی سولہ سال کی ایک الہڑ دوشیزہ ہے جو کسی چہرے کی خوبصورتی میں کھو کر اپنا سب کچھ ہار جائے گی.....''

''.....آپ غلط سمجھ رہی ہیں' یور ہائی نیس۔'' میں پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا.....''

''کیا ہم یقین کر لیں گے؟'' وہ پھر ہنسنے لگی۔ ''ہم سولہ سال کی بالی عمر کے مالک نہیں اکیس سال کی سمجھدار خاتون ہیں۔ بے شک ہم لارڈ پالمرسن کے مقاصد نہیں سمجھ سکے لیکن اُس کے طریقہ کار کو ضرور سمجھتے ہیں.....''

''لارڈ نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔'' میں نے اپنے وزیراعظم کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''بلکہ یہ کہوں گا کہ پردہ نشین ہونے کے بعد سے زیادہ تر لوگوں نے آپ کو نہیں دیکھا۔''

''لیکن اتنے لوگوں نے ضرور دیکھا ہے جو اُسے بتا سکیں کہ ہم کس قسم کی شکل وصورت کے مالک ہیں۔ اُس نے تمہیں کیا ہدایت دے کر بھیجا ہے کہ جھانسی کی رانی کو رجھاؤ تاکہ وہ اپنے مطالبات سے دستبردار ہو جائے.....''

''نہیں' یور ہائی نیس۔'' میرا لہجہ بھی شاید آداب کی حد پار کر گیا تھا'' لارڈ پالمرسن نے مجھے اس لیے جھانسی بھیجا تھا کہ یہاں کی باجبروت ملکہ کے محل کے دروازے پر ایک پٹھان پہرے دار مجھ پر تھوک کر انگریز سے نفرت کا اظہار کرے۔''

''اوہ!'' اُس نے ہونٹ سکوڑے۔'' اُسے اس وقت اس جرم کی سزا مل رہی ہوگی۔'' وہ اچانک پلٹی اور دوبارہ دربار ہال میں داخل ہوگئی۔'' تم اگر چاہو تو اپنی توہین کے جرم میں اُس کی زبان گدی سے نوچ سکتے ہو۔'' اُس نے چلتے چلتے مڑ کر مجھ سے کہا اور آگے بڑھ کر پھر اُسی جھولے پر بیٹھ گئی جس سے اٹھ کر گئی تھی۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں' یور ہائی نیس۔'' میں نے اُس کے سامنے پوزیشن سنبھالتے ہوئے جواب دیا'' میں جھانسی کی عظیم اور بہادر رانی کے شانوں پر اپنے ذاتی انتقام یا عناد کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔''

اُس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور اپنی کلائی کے کڑے سے ایک نقرئی گانگ پر ضرب لگائی۔

''یہ ہمارے ظہرانے کا وقت ہے کرنل! جس کے بعد ہم دربار عام منعقد کریں گے۔ تم اگر چاہو تو کل تشریف لے آؤ' ہم اُن تجاویز پر بات کریں گے جو لارڈ پالمرسن نے تمہاری معرفت روانہ کی ہیں۔'' وہ الوداعی انداز میں مسکرائی'' اور ہاں! تمہارے تحفے کا شکریہ!''

ایک دروازہ کھلا اور پہلے دیوان اور پھر چند خادمائیں اندر داخل ہوئیں۔ وہ کچھ فاصلے پر مؤدب کھڑی ہوگئیں۔

''ناچیز رخصت کی اجازت چاہتا ہے' یور ہائی نیس۔'' میں نے تعظیماً سر جھکا کر کہا۔

اُس نے ایک ادائے خاص سے سر کو جنبش دی اور جھولے سے اتر کر عقبی دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے پلٹتے پلٹتے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ جھولے سے میرے دیے ہوئے پرفیوم کی شیشی اٹھانا نہیں بھولی تھی۔

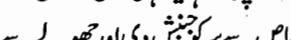

رانی سے میری پہلی ملاقات کا گو کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا تھا لیکن محل سے واپسی پر میں خود کو

ایک بڑا سفارت کار ضرور سمجھنے لگا تھا۔ اس کی وجہ بالکل سامنے تھی۔ رانی نے جتنا وقت مجھے دیا تھا یا جس انداز میں وہ میرے ساتھ پیش آئی تھی، سلطنت برطانیہ کے کسی اور فرستادے نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مگر اس کے باوجود مجھے اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ میں رانی سے کسی بھی قسم کا کوئی وعدہ کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ رانی کے جو مطالبات میری معرفت لندن پہنچیں گے، بورڈ آف کنٹرول ایک بار پھر انہیں مسترد کر دے گا۔

رانی کو اس بات کا علم نہیں تھا لیکن مجھے امید تھی کہ اگر میں دو ایک ہفتے اس راجپوت ملکہ کے ساتھ گزار لوں تو شاید اسے انگریز دوستی کی جانب راغب کر لوں۔ درحقیقت یہی پالمرسن کا مطمع نظر تھا اور اگر میں اس میں کامیاب ہو جاتا تو میری لندن واپسی کسی ہیرو کی مانند ہوتی۔

یہ تو فرائض منصبی کی بات تھی لیکن ذاتی طور پر مجھے رانی کے ملکوتی حسن نے بے حد متاثر کیا تھا اور میں اس کی اداؤں اور عشوہ طرازیوں پر دل ہار بیٹھا تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں مجھے یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ کچی عمر کی کوئی لڑکی نہیں جسے محض خواب دکھا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو لیکن جانے کیوں مجھے اعتماد سا تھا کہ میں بہت جلد اسے فتح کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

سہ پہر میں نے مقامی انفنٹری لائنز میں گزاری تا کہ سلطنتِ برطانیہ کے ساتھ سپاہیوں کی وفاداریوں کا ذاتی طور پر جائزہ لے سکوں۔

میں جوانوں میں گھل مل گیا اور ان سے بہت سے موضوعات پر بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے انہیں بتایا کہ بعض مذہبی فرقوں کے اس اعتراض کی بناء پر کہ سمندر پار کرنے سے ان کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے، فوجیوں پر سمندر پار لازمی خدمات کی پابندی ختم کر دی گئی ہے۔ تقریباً تمام ہی جوانوں نے اس فیصلے پر بے حد خوشی کا اظہار کیا تھا۔

میں ان سے گپ شپ کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ مجھے معائنہ کرانے والا آفیسر ٹرن بل میرے قریب آ گیا۔

''کیا آپ ہارس ٹروپ کا معائنہ کرنا پسند کریں گے، سر؟'' اس نے اپنی کیپ چھو کر پوچھا۔

''ان کے اصطبل قریب ہی واقع ہیں۔''

میں خود ایک کیولری مین تھا' چنانچہ فوراً اثبات میں سر ہلا دیا'' کیوں نہیں آفیسر!''

میں فوراً ہارس ٹروپس میں جا پہنچا۔ وہ سارے کے سارے پنجابی اور سرحدی پٹھان تھے۔ اصطبل میں میری آمد کی اطلاع ملتے ہی ان کا رسالدار آ پہنچا لیکن جونہی اس نے مجھے دیکھا وہ دروازے میں ہی ساکت ہو گیا۔ وہ یوں آنکھیں سٹپٹا رہا تھا جیسے جو کچھ دیکھ رہا ہو' ناقابل یقین ہو۔

وہ ایک قد آور پٹھان تھا۔ اس کے چوڑے چہرے پر گھنی داڑھی بہت جچ رہی تھی۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا اس کی ہنسی مجھے عجیب سی لگی تھی۔

''کیا چاہتے ہو' رسالدار؟'' کسی قدر ناگواری سے میں نے پوچھا۔

''آپ کی بائیں کلائی' سر!'' رسالدار نے میری ناگواری کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ ''کیا اس پر اس جیسا کوئی نشانہ نہیں؟'' اس نے اپنی آستین اوپر اٹھائی اور میں حیرت سے اس نشان کو دیکھنے لگا جسے گودنے والا پندرہ سال پہلے مارا جا چکا تھا۔ اس کا تعلق گل زئی قبیلے سے تھا۔ اس کا ماتھا زخمی تھا اور اس کا صدمے سے بے حال باپ شیر افضل ملکہ کو کوس رہا تھا جس پر اس کا بیٹا قربان ہو گیا تھا۔

''یلدرم؟'' میں تقریباً چلا اٹھا ''تم زندہ ہو یلدرم خان؟'' جواب میں وہ آگے بڑھا اور اس نے مجھے اپنی بانہوں کے حلقے میں قید کر لیا۔

''فلیش مین!'' اس نے میری کمر تھپتھپائی ''کتنے سالوں کے بعد ملے ہو تم؟ میں نے سنا ہے' کرنل ہو گئے ہو' ماشاءاللہ پہلے سے کس قدر صحت مند ہو۔''

وہ جذبات میں جانے کیا کیا کہتا رہا اور میں سنتا رہا، ہنستا رہا۔ وہ مجھے اپنے ساتھیوں سے ملواتا پھرا اور انہیں ان دنوں کے بارے میں بتاتا رہا جب ہم کابل کے محاذ پر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔

کوئی ایک گھنٹہ ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ تھوڑی سی تنہائی میسر آئی تو وہ مجھ سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ میں ہندوستان کیا لینے آیا ہوں۔ میں نے پہلے تو ٹالنے کی کوشش کی لیکن پھر اسے بتائے ہی بنی۔

''میں جھانسی کی رانی کے بارے میں ایک مشن پر یہاں آیا ہوں۔'' میں نے گول مول

جواب دیا۔

''.....یقیناً کوئی سیاسی مشن ہی ہوگا'' وہ فوراً بول اٹھا'' مجھے کچھ بتاؤ نہیں' صرف میری بات سنو اور یہ سوچ کر سننا کہ ایک دوست کہہ رہا ہے۔ جب رانی سے بات کرو تو ہوش وحواس قائم رکھنا اور ذہن میں رکھنا کہ وہ ایک ہندو عورت ہے جو عورت کے مفاد کو اچھی طرح جانتی ہے۔''

''تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''تھوڑا بہت'' وہ بولا'' لیکن یہ علم ضرور ہے کہ وہ خوبصورت' تیز طرار اور صاحبوں کی شوقین ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا۔ وہ کلکتہ کی حکومت کو نچائے ہوئے ہے، تم اس کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ تمہیں وہ کچا کھا جانے پر قادر ہے لیکن فکر نہ کرو جب تک جھانسی میں ہو' یلدرم، سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہے گا۔ اگر میں نہیں ہوا تو یہ چور اور جنگلی آدمی تمہارے محافظ رہیں گے۔''

اس نے اپنے ماتحتوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ جو کچھ اس نے کہا تھا، میں پہلے ہی جانتا تھا۔ پھر ایک پٹھان ہونے کے ناتے ہندو عورت کے بارے میں اس کی نفرت باعث حیرت نہ تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میں دنیا کے ہر انداز میں لکشمی بائی سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

◈ ◈ ◈

اگلے روز میں پھر دربار میں کھڑا تھا۔ وہ تخت پر بیٹھی رعایا کی شکایات سن رہی تھی اور درخواستوں پر احکامات صادر کر رہی تھی' وہ سفید ساڑھی میں ملبوس تھی جس پر طلائی کام ہوا تھا۔ میں اس کی ایک ایک حرکت پر یوں نظر رکھے ہوئے تھا جیسے وہ کوئی دیوی ہو اور میں اس کے چرنوں میں بیٹھا پجاری۔

جب آخری درخواست گزار بھی فارغ ہوگیا تو گانگ بجا کر دربار برخواست ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اس نے مطمئن انداز میں ایک طویل سانس لی اور کشن سے ٹیک لگالی۔ درباری جھک جھک کر تعظیم دیتے الٹے قدموں باہر جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ دربار خالی ہوگیا اور میرے علاوہ اس کے دو وزیر وہاں کھڑے رہ گئے۔

وہ بے نیازی کے ساتھ تخت سے اتری اور اپنے مخصوص جھولے پر آ بیٹھی۔

''اب ہم اطمینان سے بات چیت کر سکتے ہیں۔'' وہ گویا ہوئی۔ میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ اپنے وزیر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''کرنل کو تمام معاملات از سر نو بتا دیئے جائیں۔''

وزیر نے کاغذات کا ایک پلندہ اٹھایا اور انہیں کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ زبان فارسی تھی۔

وہی پرانی باتیں تھیں۔ جو پہلے سے میرے علم میں تھیں اور بورڈ آف کنٹرول کے سامنے پیش کی جا چکی تھیں۔ آنجہانی مہاراجہ گنگا دھر کے خزانے کی بحالی، بڑی تعداد میں گایوں کے قتل عام کا جرمانہ، ان مجرموں کی سزائے موت کی بحالی جسے سرکار نے مسترد کر دیا تھا، مندروں کے فنڈز کی بحالی اور ایک ملکہ کی حیثیت سے اسے اختیارات دینے کے مطالبات شامل تھے۔

میرے نزدیک یہ صرف وقت کا ضیاع تھا لیکن میری خواہش تھی کہ وہ ایک دو ہفتوں تک یونہی وقت ضائع کرتی رہے تاکہ میرے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو جائیں۔

میں نے اس کے مطالبات پر جب وزیر سے بحث شروع کی تو وہ خاموشی سے مسکراتی رہی۔ جب کبھی میں اس کی طرف دیکھتا اسے اپنی ہی طرف متوجہ پاتا۔ یہ بات بھی میں نے بطور خاص نوٹ کی تھی کہ اس نے میرا دیا ہوا پرفیوم لگا رکھا تھا اور چاہتی تھی کہ میں اس سے باخبر بھی رہوں۔

شاید وہ اس طرح مجھ سے سیاسی فائدے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب اس نے اپنے دونوں وزیروں کو رخصت کر دیا اور مخمور نگاہوں سے میری طرف متوجہ ہوئی۔ میری تجربہ کاری بتا رہی تھی کہ وہ شاید اس بات کی منتظر ہے کہ میں کوئی پیش قدمی کروں لیکن مجھے کوئی جلدی نہ تھی اور میں اس کھیر کو آہستہ آہستہ پورے اہتمام کے ساتھ کھانا چاہتا تھا۔

لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود یہ بات میں نے شدت سے محسوس کی کہ جب بھی جھانسی کا ذکر آیا اس کی تمام تر خود سپردگی رخصت ہوگئی اور وہ ایسی شیرنی نظر آنے لگی جس کے بچے خطرے میں ہوں۔

''پانچ سال پہلے سڑکوں پر کتنے فقیر دکھائی دیتے تھے۔!'' ایک بار میں نے جھانسی کی امارت کا حوالہ دیا تو وہ سیخ پا ہوگئی۔ ''آج کے دس فقیروں کے مقابلے میں صرف ایک۔ اور تم جانتے ہو کرنل کہ اس کا ذمے دار کون ہے؟ سرکار اور صرف سرکار کیونکہ اس نے ریاست کے

معاملات کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ جھانسی کی فوج کو غیر مسلح کر دیا گیا ہے۔ سپاہی بے روزگار ہو گئے ہیں۔ اب تم خود ہی بتاؤ کہ وہ ڈاکے ڈالیں، چوریاں کریں، بھوکے رہیں یا بھیک مانگیں.....؟''

''قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں، یور ہائی نس'' میں نے تمام تر ادب کے ساتھ اس کا جملہ کاٹا ''لیکن بہت سے الزامات کی کوئی حقیقت نہیں، سرکار جھانسی کی خیر خواہ ہے اس لیے اگر آپ کے بے روزگار فوجی سرکار یا کمپنی کی ملازمت میں آنا چاہیں تو انہیں خوش آمدید.....''

''غیر ملکی فوج میں؟'' اس نے تیکھے انداز سے پوچھا ''کیا انہیں ان کا جائز مقام مل جائے گا؟ کیا جھانسی کی تباہ حال معیشت سرکار کی اس نظر کرم سے بحال ہو جائے گی؟''

''آپ کو ہمیں کچھ وقت دینا ہوگا، مہارانی'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا ''اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس عرصے میں کیے جانے والے اقدامات سے جھانسی میں انقلابی تبدیلی آئے گی۔ رہزنی اور ڈکیتی کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ غریب عوام ڈاکوؤں اور ٹھگوں سے محفوظ ہو چکے ہیں۔ کاٹھے خان اور آرکا کے دیوان جیسے حریص پڑوسیوں سے آپ کا تخت محفوظ.....''

''ہمارا تخت محفوظ ہے؟'' رانی نے پیر ٹکا کر اپنے جھولے کو روکا اور کڑی نگاہوں سے مجھے گھورا ''بہت محفوظ ہے۔ سرکار کے لیے ہوگا کیونکہ وہ آزادی سے ہمارا خزانہ استعمال کر رہی ہے۔ اس نے ہمارے بیٹے کو وراثت سے محروم کر دیا ہے اور رہ گئی کاٹھے خان اور آرکا کے اس گیدڑ کی بات..... تو اگر ہمارے پاس اپنی فوج ہو اور ان دونوں میں سے کوئی ایک ہمارے مقابلے پر آئے تو اپنے ہاتھ پیر سلامت لے کر واپس نہیں جا سکے گا۔''

''اس میں کوئی شک نہیں مہارانی'' میں نے فوراً اس کی تائید کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود مختاری کے بعد جھانسی نہ تو ان دشمنوں سے نمٹ سکے گا اور نہ ہی ٹھگ.....''

''اوہ!'' رانی نے میرا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ ''ہم نے بھی ان کے بارے میں سنا ہے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ کمپنی اس وجہ سے ان کے خلاف کارروائی کر رہی ہے کیونکہ وہ ایک ہندو دیوی کے پجاری ہیں۔ ویسے اس میں بھی عیسائیوں کا کوئی مفاد ہی ہوگا!'' رانی کے لہجے میں دنیا بھر کی نفرت تھی۔

ایک لمحے کے لیے تو میں دانت کچکچا کر رہ گیا۔ مذہب سے میرا اتنا زیادہ تعلق نہ تھا لیکن شاید براہ راست عیسائیت کی توہین مجھ سے برداشت نہ ہو پائی تھی۔

''تو پھر ستی کے بارے میں کیا خیال ہے' مہارانی'' میں نے حتی المقدور نرم لہجہ اختیار کیا ''اس رسم میں نوجوان عورتوں کو بھی اپنے شوہر کے ساتھ نذر آتش ہونا پڑتا تھا۔ کیا اس پر پابندی میں بھی عیسائیوں کا کوئی مفاد وابستہ ہے؟ نہیں مہارانی! آپ کی سوچ درست نہیں۔ ہم صرف اس ظالمانہ اور غیر انسانی رسم کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر آپ کو تو یہ بات کہنا بھی نہیں چاہیے.....''

میں ایک لمحے کے لیے جھجکا کہ مجھے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں لیکن پھر فیصلہ کیا کہ اظہار کر دینا چاہیے۔ ''.....ایک بیوہ کی حیثیت سے آپ کو سرکار کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ اگر یہ رسم ختم نہ ہوئی ہوتی تو آج آپ جھانسی کی حکمران نہ ہوتیں۔''

میرا جملہ مکمل ہوتے ہی اس نے جھولا روک دیا میں غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جس کا رنگ رفتہ رفتہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

''ہمیں؟'' وہ تیز آواز میں بولی۔ ''یعنی ہمیں سرکار کا شکر گزار ہونا چاہیے؟'' وہ شاہانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی ''کیا تم یہی تجویز لے کر جھانسی آئے تھے'' اس کی آواز میں برف کی سی سردی اور چٹانوں جیسی سختی تھی ''ذہن میں رکھو کرنل! میں کسی سلسلے میں کمپنی یا سرکار کی احسان مند نہیں۔ اگر ستی پر پابندی نہ بھی ہوتی تو تمہارے خیال میں کیا میں راکھ کا ڈھیر ہو جانا پسند کرتی؟ قطعی نہیں.....''

''مجھے اس کا اعتراف ہے مہارانی'' میں دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میری کسی بات سے آپ کے جذبات مجروح ہوئے ہیں تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میرا خیال تھا کہ قانون تمام افراد کے لیے ہوتا ہے..... خاص طور پر خواتین.....''

''مہارانی کی زبان سے نکلا ہوا لفظ ہی قانون ہوتا ہے' کرنل!''

میں سر جھکا کر رہ گیا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ گفتگو' نادانستگی میں غلط رخ اختیار کر گئی تھی۔ رانی کچھ دیر غصے کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ پھر دوبارہ جھولے میں جا بیٹھی۔ وہ میرے بولنے کی منتظر رہی لیکن جب میں خاموش ہی رہا تو خود بول اٹھی۔

''ہم خاصی دور نکل آئے کرنل!'' اس نے ہنس کر ماحول کا کھنچاؤ کم کرنے کی کوشش کی ''کیا خیال ہے مندروں کے فنڈز کی بحالی کے معاملے پر بات کریں؟''

میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

◈◈◈

رانی میرے لیے بے حد مشکل ثابت ہو رہی تھی لیکن میں نے مختلف موضوعات پر اس سے بحث کرنا ترک نہیں کیا۔ کبھی وہ میری باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتی اور کبھی نہایت اطمینان اور بردباری سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی۔ کبھی اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں سی اٹھتی محسوس ہوتیں اور کبھی وہ انتہائی لگاوٹ کا مظاہرہ کرتی۔ وہ بجا طور پر آگ اور پانی کا خوبصورت سنگم تھی۔ اور مجھے اس کی قربت میں عجیب سے لطف کا احساس ہوتا تھا۔

رانی کے ساتھ ساتھ میں ان کاموں کی طرف سے بھی بے پروا نہیں تھا جو لارڈ پالمرسن نے تفویض کیے تھے۔ میں وقتاً فوقتاً اسکین اور کلکٹر کرشور سے بھی ملتا رہا جس سے یہ اطمینان بھی حاصل ہوا کہ سپاہیوں کا معاملہ ابھی قابو میں ہے۔ مجھے ابھی تو وہ خطرہ محسوس نہ ہوا تھا جو لارڈ نکولس کی جھانسی میں موجودگی سے ہونا چاہیے تھا۔ خود نکولس کی یہاں موجودگی کے کوئی آثار نہ ملتے تھے۔

اس عرصے میں، میں نے کرشور کے بنگلے پر ایک ڈنر میں بھی شرکت کی جس میں اس کے خاندان کے تمام افراد بھی شریک تھے۔ اسکین اور اس کی خوبصورت بیوی نے بھی میرے اعزاز میں ایسے ہی ایک عشائیے کا اہتمام کیا۔ میرے ذہن پر رانی کی طرف سے خاصا بوجھ تھا لیکن جب ان خاندانی تقریبات میں شریک ہونے کا موقع ملا تو ذرا دیر کے لیے سارے مسائل بھول گیا۔ میں نے دونوں مواقع پر دل کھول کر قہقہے لگائے اور کسی کو محسوس بھی نہیں ہونے دیا کہ میں کسی گھمبیر قسم کے مشن پر جھانسی آیا ہوں۔

دوسری طرف رانی سے بھی ملاقاتیں جاری تھیں۔ بیشتر اوقات ہم محل سے باہر ملتے۔ اسکین نے مجھے بتایا تھا کہ رانی ایک بہترین شہسوار ہے۔ ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر محل سے نکلتے اور شہر کے قریب سے بہنے والے ایک دریا پر چلے جاتے جو درختوں کے جھنڈ میں گھرا ہوا تھا۔

دریا کنارے رانی کی ایک چھوٹی سی حویلی بھی تھی جس کی دو منزلوں پر درجن بھر کمرے تھے۔ حویلی مکمل طور پر درختوں میں چھپی ہوئی تھی۔ مجھے ایک آدھ بار رانی کے درباریوں اور اس کے مصاحبوں کی معیت میں وہاں جانے کا اتفاق بھی ہوا تھا۔ میں تنہا بھی کئی بار رانی کے ساتھ

وہاں گیا۔ کبھی ہم محل کے پائیں باغ میں بیٹھ کر باتیں کرتے۔

ایک بار مجھے دربار ہال میں ہونے والی ایک مخصوص پارٹی میں شرکت کا موقع بھی ملا جس میں رانی نے جھانسی کی تمام معزز اور سربرآوردہ شخصیات کی بیگمات کو چائے پر بلایا تھا۔ میں اپنے مغربی لباس میں پچاس ساٹھ مشرقی خواتین کے درمیان خود کو راجہ اندر محسوس کر رہا تھا۔ وہ تمام کی تمام ساڑھیوں میں ملبوس تھیں اور ایک دوسری سے بڑھ کر خوبصورت تھیں۔

رانی وقتاً فوقتاً اس طرح کی پارٹیاں منعقد کرتی رہتی تھی لیکن وہ سب سے زیادہ خوش اس وقت ہوتی جب وہ اپنے آٹھ سالہ منہ بولے بیٹے دامودھر کے ساتھ کھیلنے یا گھڑسواری میں مشغول ہوتی یا اپنے محافظوں کے تربیتی مراحل کا معائنہ کرنے میں مصروف ہوتی۔ اس نے ایک بار ان کی کشتی دیکھی اور ریس کے موقع پر انعامات تقسیم کیے جس میں ہمارے گیریژن کے بعض افسران نے بھی شرکت کی تھی۔ وہ اس موقع پر نقاب اوڑھے ہوئے تھی جبکہ جسم پر ڈھیلا ڈھالا لبادہ تھا جس سے اس کے بدن کے تمام خطوط چھپ گئے تھے۔ حالانکہ محل میں وہ بے پردہ گھومتی تھی۔

وہ اپنے آٹھ سالہ بیٹے کی خوشیوں کے لیے محل کے لان پر جھانسی کے بچوں کی پارٹیاں بھی منعقد کرتی اور ان کے ساتھ یوں گھل مل جاتی جیسے انہی کو ہم عمر ہو۔ ایسے میں مجھے وہ ایک ایسی گڑیا دکھائی دیتی جسے ابھی ابھی شوکیس سے نکال کر مینٹل پر سجایا گیا ہو۔

لیکن وہ ایسی گڑیا تھی جو دوسرے کھلونوں کے برعکس اپنی زبان سے زہر میں بجھے تیر چلانے پر قادر تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم دونوں دریا کے کنارے والی حویلی جا رہے تھے۔ حسبِ معمول باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ موضوع ہندوستان کی پسماندگی اور یہاں کے عوام کی غربت تھا اچانک میرے منہ سے نکل گیا کہ برصغیر کی ترقی کے لیے بعض کلیسائی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ یہ سننا تھا کہ رانی' زین پر بیٹھے بیٹھے میری طرف مڑی اور ایک دم پھٹ پڑی۔

''کیا تمہاری کھوپڑی میں یہ بات نہیں سماتی کرنل کہ ہمارے اور تمہارے راستے جدا ہیں؟''

وہ ہونٹوں کے گوشوں سے جھاگ اڑاتے ہوئے بولی ''تم اپنی اصلاحات، برطانوی قانون کے فائدوں اور سرکار کے کردار کی بات کرتے ہو لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ضروری نہیں جو چیز تمہارے لیے بہتر ہو' وہ دوسروں کے لیے بھی ہو۔ ہمارے اپنے قاعدے قوانین ہیں، رسوم و روایات ہیں' مذاہب و عقائد ہیں لیکن تم انہیں عجیب و غریب اور بے وقوفانہ سمجھتے ہو..... ممکن ہے یہ واقعی

ایسے ہوں .....لیکن یہ ہمارے ہیں .....ہمارے اپنے .....تم لوگ .....غاصب انگریز یخ بستہ پہاڑوں سے اتر کر اس گرمائی جنت پر قابض ہو گئے ہو اور اب چاہتے ہو کہ یہاں تمہارے قوانین چلیں۔ تمہاری خواہش ہے کہ تم ہندوستان کے عوام کو اپنے سپاہی بنا ڈالو تا کہ ان پر آسانی سے حکم چلا سکو تم اسے تمدن کا نام دیتے ہو لیکن ہمارے نزدیک یہ زبردستی ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ تم ہمیں اپنا اچھا برا سوچنے کے لیے تنہا چھوڑ دو۔''

وہ بے حد ناراض تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے انہی قدموں پر تہ تیغ کر دے۔

''مم .....میرا یہ مطلب نہیں تھا مہارانی!'' میں اس کے شدید ردعمل پر گڑ بڑا گیا۔

''دراصل مجھ سے اس شہر کی بھوک اور افلاس دیکھی نہیں گئی۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا نظام وضع کر دیا جائے جس سے ان کا رہن سہن نسبتاً زیادہ بہتر اور آسان ہو جائے۔''

''کس نظام کی بات کرتے ہو تم؟'' وہ بدستور غصے میں تھی ''ہم ان نظاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو تم نے اختیار کر رکھے ہیں لیکن ہم انہیں خود پر مسلط کرنا قطعی پسند نہیں کرتے۔ تمہیں یاد ہے کہ ہم نے کہا تھا کہ بارہ ہندوستانی بابو ایک سفید فام کلرک جتنا کام .....''

''یہی افرادی قوت کا ضیاع ہے' مہارانی'' میں نے بصدِ احترام کہا ''غربت اور افلاس کی وجہ یہی .....''

''اگر عوام خوش ہیں تو اس ضیاع کی کوئی اہمیت نہیں۔'' رانی بے صبرے پن سے بولی ''تمہاری ترقی تمہیں مبارک ہو ہم اپنے پھٹے پرانے جوتوں اور فرسودہ چھکڑوں میں ہی بے حد خوش ہیں۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ آپ کے صرف ایک جوڑی جوتے کی قیمت سے جھانسی کے سو غریب زندگی بھر پیٹ کا جہنم سرد کر سکتے ہیں' لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی۔

''ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ مہارانی!'' میں نے خالص سیاسی اور سفارتی انداز اپنایا ''ہم نے اس ملک کی تقدیر بدلنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ ریل گاڑیاں' ٹیلی گراف' یونیورسٹیاں' ہسپتال.....''

''تا کہ تم ہمیں وہ فلسفہ پڑھا سکو جو ہمارے لئے سودمند نہیں۔ وہ سائنس پڑھا سکو جس کی ہمیں ضرورت نہیں اور ایسا قانون دے سکو جو ہمارے لیے اجنبی ہو اور ہمارے عوام اسے سمجھ نہ

پائیں۔"

"ہم اس ملک کے ساتھ مخلص ہیں، مہارانی"

"بکواس" رانی نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ صادر کیا۔ "انگریز صرف لالچ میں اندھا ہو کر یہاں آیا ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کو غلام بنا کر تم لوگ اپنے مفادات حاصل کر رہے ہو۔ جو کوئی تمہارے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیتے ہو۔ تم خود ہی بتاؤ یہ مخلصی ہے یا لالچ، ظلم ہے یا انصاف۔"

"یہ لالچ اور ظلم نہیں مہارانی!" میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی "اگر کسی کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہو تو قانون کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ اسے ظلم نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سے غلطیاں نہیں ہوتیں۔ بالکل ہوتی ہیں، البتہ جب ہمیں ان کا ادراک ہوتا ہے تو ان کے ازالے کے لیے کارروائی بھی کرتے ہیں۔" میں ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر گویا ہوا "جھانسی میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ جونہی ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا ہم نے اس کی تلافی کی کوششیں شروع کر دیں۔ میری یہاں آمد اسی سلسلے میں ہے تاکہ آپ کے ساتھ انصاف ہو سکے۔"

"کیا تمہارے خیال میں سارا معاملہ اسی قدر ہے؟" رانی نے تیکھے انداز میں پوچھا۔ ہم اس وقت حویلی کے پائیں باغ میں پہنچ چکے تھے۔ گھوڑے سائیسوں کے حوالے کر دیئے گئے تھے اور رانی کے خدمت گار اتنے فاصلے پر موجود تھے کہ ہماری باتوں کی آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی "تم سمجھتے ہو کہ کیا مجھے صرف اپنے خزانے، ہیرے جواہرات یا اپنے بیٹے کے حقوق سے ہی غرض ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا ازالہ ممکن ہی نہیں۔ اس سرزمین، اس کے باسیوں اور اس ملک کا کیا ہوگا جنہیں تم بدلنا چاہتے ہو؟ تم لوگوں نے آج تک جس چیز کو بھی چھوا ہے وہ اپنی اصلیت کھو بیٹھی ہے۔ آج یہ سرزمین روشن ہے، لیکن تم اسے تاریک کر دو گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تمہاری مزاحمت کر رہے ہیں۔" شدت جذبات سے رانی کی آواز کانپنے لگی تھی "جب تم وطن واپس جاؤ تو اپنے لارڈ پالمرسن کو بتا دینا کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں، ہم اپنے جھانسی سے دستبردار نہیں ہوں گے۔"

میں سن ہو گیا۔ مجھے اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ اس خوبصورت عورت کے پیچھے ایک شیرنی چھپی بیٹھی ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زخمی ہو کر آدم خور بن چکی ہے۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ شاید اس طرح میں اپنے ذہن کی سنسناہٹ کو کم کرنا چاہتا تھا۔ ''آپ کو یہ سب مجھے کہنے کی ضرورت نہیں تھی' مہارانی! آپ خود لندن تشریف لے جائیں اور لارڈ پالمرسن سے کہیں۔ میں حلفیہ طور پر کہتا ہوں کہ وہ آپ کو صرف جھانسی ہی نہیں، بمبئی اور اردگرد کی دوسری ریاستیں بھی دے دے گا..... اگر یہ نہیں تو آپ ملکہ معظمہ سے براہِ راست مل سکتی ہیں۔''

وہ چند لمحوں کے لیے دور خلاؤں میں گھورتی رہی' پھر خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''ملکہ معظمہ..... اللہ ملکہ کی حفاظت کرے..... تم برطانوی کس قدر عجیب ہو؟''

آپ کو برطانویوں کے بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے مسکرا کر باہمی تناؤ کم کرنے کی ناکام کوشش کی ''وہ خود یہ ترانہ گاتے ہیں کہ اللہ' ملکہ کی حفاظت کرے لیکن اس وقت وہ جھانسی کی ملکہ کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔''

''یہ وفاداری تو نہیں کرنل!'' اس کے چہرے کی بشاشت اور ہونٹوں کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔

میرے حلق سے بے اختیار اطمینان کی ایک سانس خارج ہو گئی تھی۔

جھانسی میں میری آمد کو دو ہفتے پورے ہو چکے تھے لیکن حویلی میں ہونے والی تلخ و شیریں ملاقات کے بعد حالات اتنی تیزی سے بدلے کہ میں خود حیران رہ گیا۔

اگلی صبح جب میں دربار پہنچا تو مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ نہ کچھ ہو چکا ہے لیکن میں اس کی نوعیت نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی' سنہری ساڑھی میں اس کا حسن کھلا جا رہا تھا۔ وہ معمول کے امور نمٹا رہی تھی لیکن اس کے انداز میں بے دلی تھی۔ میں بظاہر اِدھر اُدھر متوجہ تھا لیکن چور نگاہوں سے رانی کو ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک آدھ بار میں نے اس کی طرف منہ کیا تو اسے بھی اپنی طرف دیکھتے ہی پایا۔ ایسے موقعوں پر وہ فوراً مسکرا دیتی اور میں یہی سمجھتا کہ وہ خفت مٹانے کے لیے ایسا کر رہی ہے۔

بالآخر اس نے درباری امور کے اختتام کا اعلان کیا۔ اور مجھے دعوت دی کہ بالکونی سے محل

کے باغ میں پہرے داروں کے درمیان ہونے والے تلوار بازی کے مقابلے دیکھیں۔

ہم دونوں بالکونی میں جا کھڑے ہوئے۔ نیچے پٹھان شمشیر زنی میں مصروف تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ رانی ان کی طرف متوجہ نہیں بلکہ وہ بالکونی کی گگر پر سر تال کے انداز میں انگلیاں مار رہی تھی جبکہ اس کی آنکھیں خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑی رہی لیکن پھر پہرے داروں کی طرف دیکھنے لگی۔ ساتھ ہی اس نے شمشیر زنی کے رموز پر بات چیت شروع کر دی میں ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہا تھا۔

اچانک ہی وہ میری سمت مڑی۔ ''کیا تم شہسوار کی طرح اچھے شمشیر زن بھی ہو' کرنل؟'' اس نے دریافت کیا۔

''میں تلوار کو بھی گھوڑے کی طرح استعمال کرتا ہوں' مہارانی!'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ!'' وہ مسکرا اٹھی ''تو آؤ پھر تم سے دو دو ہاتھ ہو جائیں''

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پلٹ کر دربار ہال کی طرف چل دی۔ مجھے ظاہر ہے اس کی تقلید کرنا پڑی تھی۔

مجھے دربار میں چھوڑ کر وہ کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گئی۔ اب وہ چست لباس میں تھی جبکہ اس نے اپنے بال ایک اسکارف سے باندھ لئے تھے۔ خادموں نے دو تلواریں ہمیں تھمائیں اور رانی کے حکم پر کمرے سے باہر چلے گئے۔ اب ہم دونوں کمرے میں تنہا تھے۔

میں اب بھی یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن رانی کے حکم اور خواہش پر تلوار لے کر سامنے آ گیا۔ آغاز اسی نے کیا اور اس کے قدموں کی پہلی جنبش سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس شعبے میں بھی باکمال ہے لیکن ظاہر ہے میں بھی اناڑی نہ تھا۔ پہلے منٹ میں اس کی تلوار نے تین بار مجھے چھوا۔ میں مزید محتاط ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے منٹ میں صرف ایک بار اس کی تلوار میرے بدن سے لگی۔

میں شاید اب تک اس کے مرتبے کا لحاظ کر رہا تھا لیکن جب اس نے ہنس ہنس کر مجھے مزید محنت کرنے اور کوشش کرنے کا مشورہ دیا تو مجھے تاؤ آ گیا چنانچہ میں نے سب کچھ پس پشت ڈال کر جارحانہ انداز اختیار کر لیا۔ میں ایک اچھا شمشیر زن تھا لیکن عملی تجربہ زیادہ نہ تھا اس کے باوجود میں

اسے پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ اپنے نازک جسم کے باوجود ایک اچھی مدمقابل ثابت ہو رہی تھی اور کسی بلی کی طرح پھرتیلے پن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں اسے مسلسل دھکیل رہا تھا حتیٰ کہ وہ شیشے کی ایک دیوار سے جا لگی۔ اس نے دیوار سے پشت ٹکا کر جمنے کی کوشش کی لیکن میں نے غچہ دے کر اس کی تلوار پر ایک زوردار وار کیا اور اس کی تلوار ایک چھناکے کے ساتھ زمین پر جا گری۔

ہم ایک دوسرے سے محض چند انچ کے فاصلے پر تھے۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی لیکن وہ بدستور مسکرا رہی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں..... وہ شاید اس کی قربت کا نشہ تھا کہ میں نے بھی اپنی تلوار نیچے پھینک دی اور اگلے ہی لمحے رانی میری بانہوں کے حصار میں تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بری طرح چونکی لیکن اس سے پہلے کہ کوئی جدوجہد کرتی' میرے ہونٹوں نے اس کے گلاب کی پتیوں کو چھو لیا۔

میں نے اس کے بدن میں واضح طور پر کپکپاہٹ محسوس کی۔ صرف ایک ثانیے کے لیے اس پر خودسپردگی کی کیفیت طاری ہوئی لیکن پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے دو ایک لمبی لمبی سانسیں لیں اور اپنی ہرنی جیسی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔

''تم ایک اچھے شکاری ہو' کرنل!'' اس نے گنگناتی ہوئی آواز میں کہا اور تیز تیز قدموں سے اپنے نجی کمرے کے دروازے کی طرف چل دی۔

میں نے بھی اسی طرف بڑھنا چاہا لیکن اس نے مڑے بغیر ایک ہاتھ اٹھا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور سخت لہجے میں بولی ''دربار ختم ہو چکا ہے' کرنل۔''

دروازہ اس کے عقب میں بند ہو گیا اور میں وہیں ہونقوں کی طرح کھڑا گری ہوئی تلواروں کو تکتا رہا۔

جب اس کا دیوان دربار میں داخل ہوا تو اس نے حیرت سے پہلے نیچے گری ہوئی دونوں تلواروں کو دیکھا پھر میری طرف متوجہ ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا' یا میری حالت گزرے لمحوں کا فسانہ سناتی' میں نے اجازت لی اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔

میں دربار سے خاصا مایوس اور دل گرفتہ واپس آیا تھا۔ رہ رہ کر مجھے رانی کے جانے' دروازہ بند کرنے اور ہاتھ اٹھا کر دربار برخواست ہونے کے حکم سنانے کا انداز یاد آتا تھا۔ اگر میرے پیش نظر مشن کی اہمیت نہ ہوتی تو میں رانی اور جھانسی دونوں پر لعنت بھیج کر فوراً واپس چل دیتا۔

لیکن اس کے ساتھ مجھے رانی کا وہ جملہ بھی یاد آ رہا تھا جو اس نے میرے بازوؤں سے رہائی پاتے وقت ادا کیا تھا کہ تم ایک اچھے شکاری ہو کرنل! اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی نہ کوئی نرم گوشہ ضرور موجود ہے مسئلہ صرف اسے بے نقاب کرنے کا تھا۔

شام ہوئی تو یلدرم ملنے آ گیا اور ہم دونوں دیر تک ماضی کو کھنگالتے رہے لیکن اس کے باوجود میرا ذہن بدستور رانی میں الجھا ہوا تھا۔ تاریکی ہوئے کوئی تین چار گھنٹے گزرے تھے کہ بنگلے کے عقبی دروازے پر دستک سنائی دی اور کچھ دیر بعد خدمت گار نے آ کر بتایا کہ ایک بی بی مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

یلدرم نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا جیسے اسے سارے معاملے کا علم رہا ہو' لیکن میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ کر عقبی دروازے پر آ گیا۔

ساڑھی میں ملبوس ایک نقاب پوش عورت میری منتظر تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر تین پہرے دار بھی موجود تھے۔ وہ اپنے حلیے سے کوئی ایسی عورت بھی دکھائی نہ دیتی تھی جو رات کے اس پہر ضرورتاً میرے دروازے پر آئی ہو۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ بی بی!'' میں نے اس کے قریب پہنچ کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

اس نے کچھ کہے بغیر چمڑے کی ایک تھیلی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے قدرے حیران ہو کر تھیلی اس کے ہاتھ سے لے لی اور کھول ڈالی۔ اندر ایک رومال موجود تھا جو پرفیوم سے مہک رہا تھا۔ میں اس کی خوشبو سے پہچان گیا کہ یہ وہی پرفیوم تھا۔ جو میں نے رانی کو دیا تھا۔

''یہ میری مالکن نے بھیجا ہے۔'' وہ گویا ہوئی۔

''اوہ!'' میں نے رومال کو ناک کے قریب لے جا کر سونگھا ''اس کا کوئی نام.....''

''کوئی نام نہیں مالک'' عورت نے فوراً مجھے ٹوک دیا ''مالکن نے کہا ہے کہ آپ ایک گھنٹے بعد دریا کنارے والی حویلی میں آ جائیں۔''

اس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا اور واپس ہو گئی۔ میں نے اسے پکارا بھی لیکن وہ سنی ان سنی کرتی ہوئی اپنے محافظوں کے ساتھ تاریکی میں مدغم ہو گئی۔

میں کافی دیر حیران حیران سا وہاں کھڑا رہا۔ رانی نے اپنی نشانی بھیج کر مجھے حویلی آنے کی دعوت دی تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہاں جانا چاہیے یا نہیں۔ ذہن و دل کی جنگ جاری تھی۔ بالآخر دل نے ذہن کے سارے وسوسے رد کر دیے اور میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

''سائیس!'' میں نے وہیں سے چلا کر کہا۔ ''میرا گھوڑا تیار کر دو۔''

واپس کمرے میں آیا تو یلدرم نے فوراً پوچھا ''کیا رات کے اس پہر بازار جا رہے ہو؟''

''نہیں برادر!'' میں نے مسکرا کر جواب دیا ''اس سے کہیں زیادہ اچھی جگہ جا رہا ہوں۔''

پھر میں نے دبے لفظوں میں اسے رانی کی دعوت سے آگاہ کر دیا۔

''یہ بے وقوفی ہے۔'' وہ فوراً کہہ اٹھا ''تنہا جانا خطرے سے خالی نہیں۔''

میں معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ ''تمہارے اندازے غلط بھی تو ہو سکتے ہیں'' میں نے آہستگی سے کہا ''ضروری نہیں کہ ایک ریاست کی مطلق العنان حکمران' برطانوی فوج کے ایک کرنل کی جھولی میں گرنے کے لیے بے تاب ..... ہو اور میں تنہا بھی نہیں جا رہا۔ سائیس میرے ساتھ ہو گا۔''

حالانکہ سائیس کو میں اپنی حفاظت کے لیے نہیں لے جا رہا تھا بلکہ خطرہ یہ تھا کہ میں کہیں راستہ نہ بھول جاؤں۔

تھوڑی دیر بعد یلدرم برآمدے میں کھڑا مجھے اور سائیس کو رخصت کر رہا تھا۔

◈ ◈ ◈

میں رانی سے ملنے کے تصورات میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ سفر کا پتا بھی نہ چلا۔ اس وقت چونکا جب سائیس نے میرا بازو ہلا کر مجھے بتایا کہ ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ حویلی چند سو گز کے فاصلے پر درختوں میں گھری کھڑی تھی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ سائیس میری مخبری کرے چنانچہ اسے گھوڑے سمیت وہیں رکنے کا حکم دے کر میں تنہا حویلی کی سمت بڑھا۔

دل و دماغ کی جنگ اچانک ہی پھر شروع ہوگئی دل یہ کہتا تھا کہ رانی نے میری بہادری، جوانمردی اور وجاہت کے پیش نظر مجھے رات کی تاریکی میں ملاقات کے لیے بلایا ہے۔ وہ یقینی طور پر دن کے اجالے میں کسی اجنبی اور وہ بھی گورے آدمی کے ساتھ بند دروازوں کے عقب میں نہیں مل سکتی تھی۔ اس سے ایک جانب تو اس کا وقار خاک میں مل جاتا اور دوسری جانب ان لوگوں کی نظروں میں اس کا کردار مشکوک ہو جاتا جو پرستش کی حد تک اس کا احترام کرتے تھے۔

دماغ یہ کہتا تھا کہ دل کی سوچیں محض خوش فہمی ہے۔ رانی ایک مضبوط اور بے داغ کردار کی مالک تھی۔ لوگوں نے اس کے بارے میں بڑے قصے مشہور کر رکھے تھے لیکن وہ ایسی نہ تھی۔

دل و دماغ کی اس جنگ میں بعض حقائق بھی میرے سامنے تھے۔ لارڈ پالمرسن نے رانی کا تعارف کراتے ہوئے اسے بڑھیا بتایا تھا۔ لیکن اس کے برعکس جب میں ذاتی طور پر اس سے ملا اور وہ بغیر نقاب کے میرے سامنے آئی تو اندازہ ہوا کہ انگریزوں کی جاسوسی اس سلسلے میں مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی تھی۔

رانی ایک نوجوان اور خوبصورت عورت تھی۔ اگر مجھے اس کے پس منظر کا علم نہ ہوتا تو میں اسے ایک ایسی الہڑ دوشیزہ ہی سمجھتا جس کے بدن پر ابھی اس کے محبوب کی پہلی نظر بھی نہ پڑی ہو۔ یہ درست ہے کہ اس کا انداز اور ادائیں ایسی تھیں جو کسی بھی زاہد کو زہد کا چولا اتارنے پر مجبور کر سکتی تھیں لیکن خود رانی کو میں نے ایسا نہیں پایا تھا کہ وہ خود ورغلانے والی کا کردار ادا کرنا پسند کرتی۔

میں نے ہندوستانی عورتوں کی وفاداری کے بارے میں بہت سی کہانیاں سن رکھی تھیں لیکن ان میں بھی کوئی داستان ایسی نہ تھی جس میں عورت کو کسی مرد کے سامنے اپنا سب کچھ ہارتے دکھایا گیا ہو۔ میری نظر میں رانی بھی ایسی عورت نہ تھی جو انگریز سرکار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے ایک معمولی سے کرنل کے سامنے خود کو کھول کر رکھ دیتی۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو اس کام کے لیے مجھ سے بہتر کئی آدمی تھے جو اسے حاصل کرنے کے بعد اس کی مرضی کی مراعات اسے دے دیتے۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر رانی کی طرف سے مجھے رات کے وقت تنہا اس حویلی میں آنے کی دعوت کیونکر دی گئی تھی؟ ممکن ہے کہ رانی کی کوئی ہم شکل یا راز دار کنیز یہاں مجھ سے ملتی اور میں یہی سمجھتا رہتا کہ میں نے رانی سے ملاقات کی ہے۔ اس طرح رانی کو دہرا فائدہ ہوتا۔ ایک

جانب تو وہ مجھے زیر بار کر لیتی اور دوسری جانب میرے دل و دماغ کا احوال اسے معلوم ہو جاتا۔ اس طرح اسے آئندہ فیصلے کرنے میں زیادہ آسانیاں پیدا ہو جاتیں۔

اگر واقعی یہ بات تھی تو ہم نے یعنی انگریزوں نے اس کی ذہانت کے بارے میں بڑے غلط اندازے لگائے تھے۔ وہ ہمارے تصورات سے بڑھ کر خوبصورت اور اندازوں سے بڑھ کر چالاک و ہوشیار تھی۔ یہ سوچ کر دماغ نے فیصلہ دیا کہ لوٹ جاؤں لیکن دل آڑے آ گیا۔ وہ مصر تھا کہ نہیں پردے کے پیچھے تو دیکھ لو کون ہے؟ حالانکہ میں جانتا تھا کہ ایسے موقعوں پر انسان اندھا ہوتا ہے اور اسے محض اپنی خواہشوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا' میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آگے بڑھوں۔

سوچوں کی یلغار نے میرے قدم روک دیے تھے لیکن جونہی میرے دل و دماغ کی جنگ ختم ہوئی میں ایک بار پھر دروازے کی سمت بڑھا۔ مرکزی دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ ذرا سے دباؤ پر وہ چوپٹ کھل گیا اور میں دبے قدموں اندر داخل ہو گیا۔

میرے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ پہلی منزل پر مدھم روشنی تھی اور دور کہیں سے ساز بجتے سنائی دے رہے تھے۔ میں ایک لمحے کے لیے جھجکا اور ٹھوڑی کھجاتے ہوئے ماحول کا جائزہ لیتا رہا پھر دبے قدموں ان سیڑھیوں کی طرف بڑھا جو بالائی منزل کے کمروں تک جاتی تھیں۔

رانی کا کمرہ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ میں سیدھا وہیں پہنچا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ دیواروں کے ساتھ زمین پر گلابی رنگ کی شمعیں جل رہی تھیں جن کی روشنی میں سامنے والے کونے کے ساتھ ایک مسہری دکھائی دے رہی تھی۔

مسہری مچھروں سے بچاؤ کی جالی میں پوشیدہ تھی لیکن مجھے وہ تکیوں کے سہارے بیٹھی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ جالی سے باہر نکلی ہوئی تھی جبکہ چوڑیوں کی کھنکھناہٹ بتا رہی تھی کہ وہ ہولے ہولے اپنے بازوؤں کو حرکت دے رہی ہے۔ میں لکڑی کے ایک ستون کے سہارے کھڑا ہو گیا اور آہستگی سے اسے پکارا۔

''لکشمی!'' میں نے پہلی مرتبہ اس کا نام لیا ''میں آ گیا ہوں ڈارلنگ۔''

اس نے چوڑیوں سے بھری ہوئی کلائیوں سے جالی ہٹائی اور باہر نکل آئی۔ چند ثانیے وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی رہی اور اس کے بعد وہ رقص کے سے انداز میں میری طرف بڑھی۔

میں نے اس گلاب کے پھول کو ہاتھوں پر تھاما اور اسے سہارا دے کر آہستہ آہستہ مسہری کی طرف لے چلا۔ اس عشوہ طراز نے مجھے پہلے بٹھایا لیکن خود میرے پہلو میں بیٹھنے کے بجائے ایک میز کی طرف بڑھی جس پر جگ اور گلاس رکھے تھے۔ اس نے جگ سے کوئی مشروب گلاس میں انڈیلا اور اسے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

میں اس وقت اس قدر مدہوش ہو رہا تھا کہ بلا سوچے سمجھے پورا گلاس غٹا غٹ پی گیا۔ اس کا ذائقہ ہلکا سا ترش تھا لیکن خاصا سریع الاثر تھا کیونکہ ذرا ہی دیر میں مجھ پر نشہ طاری ہونے لگا اور میں خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

کمرے کی مدھم روشنی، تاریکی میں بدل گئی یا شاید میرا ذہن ہی رفتہ رفتہ تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ آخری بات جو مجھے یاد تھی وہ رانی کا قرب تھا۔ اس کا نصف چہرے نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ سر پر چھوٹا سا تاج تھا جس کے وسط میں بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ اس کے بدن سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور میرے بازوؤں کی گرفت رفتہ رفتہ اس کے گرد سخت ہوتی جا رہی تھی۔

پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔

آہستہ آہستہ میری نیند ٹوٹنی شروع ہوئی۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ کہاں ہوں۔ تاریکی میں کہیں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل تمام سر گھما کر اپنے پہلو کا جائزہ لیا لیکن بستر خالی تھا۔ وہ موجود نہیں تھی۔

اسی وقت ہلکی سی آہٹ ہوئی اور میکانکی انداز میں میرا سر اس طرف گھوم گیا۔ ایک سایہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے خطوط نسوانی نہ تھے۔ سر پر تاج بھی نہیں تھا بلکہ اس کے بجائے سفید رنگ کی پگڑی دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی آدمی تھا شاید۔ اس نے ہاتھ میں کچھ پکڑ رکھا تھا شاید چھڑی تھی۔ اس کے عقب میں ایک اور شخص تھا جس نے اپنے دائیں ہاتھ میں کپڑا ابھی تھام رکھا تھا۔

کوئی دس سیکنڈ میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اب تک میرے ذہن میں یہی تھا کہ یہ کوئی خواب ہے۔ لیکن جب میرے سر پر پہلی ضرب پڑی اور درد کی لہر نے پورے بدن کو ہلا کر رکھ دیا تو احساس ہوا کہ یہی حقیقت ہے۔

میں چیخا۔ دونوں سائے اب بستر کے پاس موجود تھے۔ چھڑی بردار نے دوبارہ ضرب لگانے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن میں کروٹ لے کر بستر کی دوسری جانب جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں گھوم کر مجھ تک پہنچتے، میں نے اپنی ساری طاقت مجتمع کی اور اٹھ کر باہر دوڑ لگا دی۔

مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی قوت کہاں سے آ گئی تھی۔ شاید موت سامنے دیکھ کر تمام ترحسیات بیدار ہو گئی تھیں۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اتر کر برآمدے میں آیا تو وہ دونوں شور مچاتے میری طرف لپکے۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی ایسی شے دکھائی نہ دی جس سے میں اپنا دفاع کر سکتا۔

میری چھٹی حس نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ میری جان کے درپے ہیں۔ ایک درخت حویلی کے صحن میں اُگا ہوا تھا جس کی شاخیں برآمدے کے اندر تک جھک آئی تھیں۔ مجھے فوری طور پر کچھ اور نہ سوجھا تو میں تیزی سے درخت پر چڑھ گیا۔ دونوں آدمیوں نے میری تقلید کی لیکن جونہی وہ اوپر پہنچے میں نے دوبارہ نیچے چھلانگ لگا دی۔

پشت کے بل زمین پر گرنے سے مجھے چوٹ تو خاصی آئی لیکن اس وقت یہ بھی گوارا تھی میں ابھی اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دونوں بلند آواز میں گالیاں دیتے مجھ پر آ رہے ان میں سے ایک بالکل میرے چہرے کے قریب گرا اور اگلے ہی لمحے کوئی چمکتی ہوئی شے میری آنکھوں کے سامنے لہرا گئی۔ وہ چاقو تھا۔

اس سے پہلے کہ چاقو میرے سینے میں ترازو ہوتا میں نے اپنا دایاں ہاتھ اندھا دھند اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ الٹ کر گرا تو ایک مکا اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا' لیکن تب تک دوسرا مجھ پر آ رہا۔ اس کے ہاتھوں میں رومال تھا جسے اس نے بڑی چابکدستی اور مہارت سے میرے گلے میں ڈال دیا۔

میری سانس رکنے لگی اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب روح نے جسم چھوڑا کہ تب چھوڑا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں..... لیکن پھر اچانک ہی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے بڑی دقت سے اپنی آنکھیں تھوڑی سی وا کیں تو مجھے ایک اور شخص اس سے نبرد آزما نظر آیا۔

میں نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ رومال میرے گلے سے نکال لیا گیا۔ پھر مجھے زور سے کوئی شے زمین پر پٹخے جانے کی آواز سنائی دی۔ کسی نے میرے گال تھپتھپائے تو میں نے کراہ کر

دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو ایک دھندلا سا سایہ خود پر جھکا نظر آیا لیکن چند ہی ثانیوں بعد میں نے اسے یلدرم خان کی حیثیت سے شناخت کرلیا۔

''فلیش مین!'' مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی انگلیاں میرے حلق کو سہلا رہی تھیں۔ ''دیکھا اس عورت سے ملاقات کے لیے آنے کا کیا نتیجہ نکلا؟ مجھے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو یہ تمہاری گردن توڑ چکا ہوتا''

میں نے سر گھما کر ادھر دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔ ایک شخص مجھے گھاس پر آڑا ترچھا پڑا دکھائی دیا۔

''کک.....کیا ہوا تھا؟'' میں نے مردہ سی آواز میں کہا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

''یہ پوچھو کہ کیوں ہوا؟'' یلدرم نے سہارا دے کر مجھے بٹھا دیا۔ ''کیا اس کا کوئی حاسد شوہر بھی موجود ہے؟ ہم نے حویلی میں روشنی دیکھی اور مدھم موسیقی سنی تھی لیکن پھر بعد میں بہت سے لوگ حویلی سے نکل کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک پالکی بھی تھی جس میں عورتیں سفر کرتی ہیں۔ اب حویلی سنسان پڑی ہے۔ ہم نے ان دو بدمعاشوں کو بھی دیکھ لیا تھا.....''

میں نے دوبارہ ادھر دیکھا۔ اب مجھے دوسرا بھی نظر آ گیا۔ وہ ہل رہا تھا اور اس کے حلق سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں اس کے قریب ہی یلدرم کا ایک سوار کھڑا اپنے خون آلود چاقو کو اسی کے کپڑوں سے صاف کر رہا تھا یقیناً اس نے حملہ آور پر چاقو سے وار کیا تھا۔

ذرا ہی دیر میں ایک تیسرا شخص بھی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا۔ لالٹین اس کے ہاتھ میں تھی۔

''صاحب کے سائیس کو قتل کر دیا گیا ہے' خان!'' اس نے آتے ہی بتایا ''اسے ایک مخصوص ہتھوڑے سے مارا گیا ہے۔''

''کیا؟'' یلدرم نے کہا اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ تیزی سے اس شخص کی طرف بڑھا جو زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس نے اپنے آدمی سے لالٹین لی اور مرنے والے کے چہرہ کا جائزہ لینے لگا۔

''ادھر آؤ' فلیش مین۔'' اس نے مجھ پکارا تو میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا ''دیکھو!''۔ یلدرم نے مرنے والے کے پپوٹے نیچے کو کھینچے۔ لالٹین کی زرد اور مردہ روشنی

میں بھی مجھے ان پپوٹوں پر وہ مخصوص نشان نظر آ گیا تھا جو ٹھگوں کی پہچان تھا۔

''ٹھگ!'' یلدرم تنفر آمیز لہجے میں بولا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا فلیش مین؟''

میرا سر گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں رانی کے ساتھ ہواؤں میں اڑ رہا تھا اور اب میں پیشہ ور قاتلوں کے ہاتھوں بال بال بچنے کے بعد یہ سوچ رہا تھا کہ رانی اور ٹھگوں میں کیا تعلق ہے؟

''یہ ہمیں کچھ نہ کچھ ضرور بتائے گا۔'' یلدرم اٹھ کر زخمی کی طرف بڑھا اور اس کا حلق گرفت میں لے لیا ''دیکھو گدھے! میں اگر چاہوں تو تمہیں اسی وقت موت کے گھاٹ اتار دوں لیکن اگر چاہتے ہو کہ زندہ رہو تو بتاؤ تمہیں کس نے اور کیوں بھیجا تھا؟''

ٹھگ چند ثانیے کھا جانے والی نگاہوں سے یلدرم خان کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے نفرت بھرے انداز میں زمین پر تھوک دیا۔

یلدرم اپنے آدمیوں سے مخاطب ہوا ''اسے درختوں کے جھنڈ میں لے چلو۔''

وہ تینوں اسے لے کر ادھر چل دیے لیکن میں وہیں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں، میں نے شدید کرب میں ڈوبی ہوئی انسانی چیخوں کی آواز سنی۔ میں دل ہی دل میں صورتِ حال کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔

یقیناً لکشمی بائی مجھے بے ہوشی، مدہوشی یا نیند کے عالم میں چھوڑ کر چلی گئی تھی جس کے بعد ٹھگ آ گئے تھے۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہ میری موت کی خواہش مند کیوں تھی۔ اگر اس نے مجھے مروانا ہوتا تو اتنے تردد کی ضرورت ہی کیا تھی۔ حویلی کے راستے ہی میں میرا قصہ پاک ہو سکتا تھا۔ وہاں بلا کر میرے ساتھ کچھ رنگین لمحے گزارنے کی بھلا کیا تک تھی۔

بے شک میں بعض ایسی عورتوں کو جانتا تھا جو اپنے محبوبوں کو ضرورت پوری ہونے کے بعد قتل کروا دیتی تھیں۔ لیکن لکشمی ایسی نہ تھی۔ میں اس بارے میں قسم بھی کھا سکتا تھا مگر اس کے باوجود یہ گرہ بدستور میرے ذہن میں موجود تھی کہ ٹھگوں کو کس نے بھیجا اور رانی مجھے تنہا چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ یلدرم واپس آ گیا۔ ''تم پر قاتلانہ حملہ کروانے والے کا پتا چل گیا ہے۔ کرنل'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا جیسے خدشہ ہو کہ کوئی اور بھی سن لے گا۔

''کیا وہ رانی ہی ہے؟'' میرا لاشعور بول اٹھا۔

''نہیں۔'' یلدرم نے نفی میں سر ہلایا تو میرے سینے سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ ''ان دونوں میں سے ایک ٹھگ سردار تھا۔ وہ چھ راتیں پہلے فیروز آباد میں تھا جہاں ایک فقیر نے اس سے ملاقات کر کے اس مقصد کے لیے سونے کی پیشکش کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ راج جلد ختم ہو جائے گا اور ٹھگی کے قوانین دوبارہ رائج کر دیئے جائیں گے۔ مجھے تو یہ کوئی سیاسی واردات لگتی ہے۔'' (5)

میں یوں چپ ہو گیا جیسے اگر بولا تو آسمان ٹوٹ کر زمین پر آ گرے گا۔ میں یلدرم سے ایک سوال کرنا چاہتا تھا لیکن خوفزدہ تھا کہ جواب اگر ہاں میں ہوا تو کیا ہو گا۔ کچھ دیر میں غور کرتا رہا' پھر ہمت کر کے بول ہی اٹھا۔

''وہ فقیر کون تھا؟''

''کوئی نہیں جانتا۔'' یلدرم نے جواب دیا ''البتہ کہتے ہیں کہ وہ شمال کا رہنے والا ہے۔ وہ گوری چمڑی اور ایک آنکھ کا مالک ہے۔ لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ اس کی پہنچ بہت دور دور تک ہے۔ وہ صاحب لوگوں کا دشمن.....''

یلدرم جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن میرے دل و دماغ میں جیسے آندھیاں چلنے لگی تھیں۔ میں پہچان گیا تھا کہ میرے قتل کے لئے ٹھگوں کو سونے کی پیشکش کرنے والا کون ہے؟

کاؤنٹ نکولس اگنتیف۔

تو اس کا مطلب تھا کہ وہ جھانسی میں موجود ہے اور جانتا ہے کہ میں کس مشن پر یہاں آیا ہوں۔ اس کے ایجنٹ بھی اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے جو اسے پل پل کی خبریں فراہم کر رہے تھے۔ مجھے پسینے آنے لگے۔ جھانسی میں میرا رہنا مخدوش ہو گیا تھا اور پھر ایک سوچ میرے ذہن کے دروازوں پر دستک دینے لگی۔

کیا رانی بھی اس سازش میں شریک تھی؟ لیکن جب میں نے اس پر مزید غور کیا تو دل نے فوراً اس کی تردید کر دی۔ میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میں ہندوستان چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا لیکن میں نے اسکین کو یقین دلایا تھا کہ اگر مقامی طور پر کوئی بحران پیدا ہوا تو میں غائب ہو جاؤں گا اور نکولس سے اپنے طور پر نمٹنے کی ترکیب کروں گا۔

میں نے فوراً ہی حکمت عملی طے کر لی اور یلدرم کی طرف مڑا ''دیکھو برادر! میں ایک بہت

بڑے سیاسی معاملے کو طے کرانے یہاں آیا تھا۔'' میں نے لہجہ دھیما رکھا تھا ''لیکن اس کی تفصیل تمہیں نہیں بتا سکتا اور نہ ہی فی الحال ہندوستان چھوڑ سکتا ہوں.....''

''تب پھر تم مارے گئے'' یلدرم نے ہنستے ہوئے کہا ''ہندوستان میں کالی کے ہاتھ بہت دراز ہیں'' اس کا اشارہ ٹھگوں کی طرف تھا جو کالی دیوی کے پیروکار تھے۔

''ایک منٹ!'' میں نے پرخیال انداز میں کہا ''وہ لوگ کرنل فلیش مین کی تلاش میں ہیں لیکن اگر فلیش مین کسی پٹھان کا روپ دھار لے تو کیسا رہے؟ میں تمہارے لہجے میں پشتو بول سکتا ہوں اور اردو بھی جانتا ہوں۔ میں صرف کوئی محفوظ ٹھکانہ چاہتا ہوں جہاں کچھ عرصہ اطمینان سے گزار سکوں اور پھر تازہ دم ہو کر اپنی کارروائی شروع کر سکوں تب اس نکولس کو دیکھیں گے.....''

میں نے یلدرم کو بتایا کہ مجھے اس کے سواروں جیسا لباس اور ایک گھوڑا درکار ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری مطلوبہ اشیاء فراہم کر دے گا۔

''اور میرے بارے میں اسکین کو بتا دینا کہ وقت آ گیا تھا' غائب ہونے کا' وہ خود ہی سمجھ جائے گا'' میں نے یلدرم کو ہدایت کی ''اور اسے یہ بھی کہہ دینا کہ اگر رانی میرے بارے میں اس سے کچھ دریافت کرے تو یہی کہے کہ کرنل ضروری کام سے کچھ عرصے کے لیے جھانسی سے باہر چلا گیا ہے۔''

یلدرم نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے ایک آدمی کی طرف مڑا۔ ''رفیق تموار کے پاس جاؤ اور اسے کہنا کہ مجھے اس کے کپڑے' خنجر اور گھوڑا درکار ہے۔''

رفیق شاید انہی دو میں سے ایک کا نام تھا جو یلدرم کے ساتھ آئے تھے کیونکہ چند ہی ثانیوں بعد درختوں کے جھنڈ سے یلدرم کا دوسرا ساتھی برآمد ہوا اور اس نے یلدرم کی مطلوبہ چیزیں اس کے حوالے کر دیں' میں نے بھیس بدلنے میں دیر نہیں کی۔ کچھ دیر بعد جب میں درخت کی آڑ سے نکلا تو ایک پٹھان لگ رہا تھا۔

''تمہارے خیال میں مجھے کہاں جانا چاہیے؟'' میں نے یونہی یلدرم سے پوچھ لیا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ذرا دیر وہ خاموش رہا پھر وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر پرجوش انداز میں میری طرف بڑھا۔

''.....تم سرکار کی فوج میں شامل کیوں نہیں ہو جاتے ؟'' وہ بلند آواز میں بولا'' زبردست آئیڈیا ہے۔تم اگر ریکروٹ کی حیثیت سے کیولری میں جاؤ تو ایک ہی مہینے میں دفعدار بن جاؤ گے۔یاممکن ہے رسالدار ہو جاؤ۔''

''پاگل ہو گئے ہو؟''میں نے جواب دیا''ایسا بھلا کس طرح ہو سکتا ہے؟''

''بڑی آسانی سے۔'' یلدرم اپنے ذہن میں شاید کوئی منصوبہ ترتیب دے چکا تھا۔''تم میرٹھ چلے جاؤ!میری والدہ کا ایک کزن ہے،غلام بیگ۔وہ ایک گاؤں کا مالک تھا لیکن ان دنوں گیریژن میں تھرڈ کیولری کا وردی میجر (ایڈ جوٹنٹ) ہے۔تم اسے جا کر کہنا کہ مجھے یلدرم خان نے بھیجا ہے۔وہ تمہیں آنکھیں بند کر کے بھرتی کر لے گا.....اپنے بارے میں بتانا کہ تمہارا تعلق کوہ سیاہ کے حسن زئی قبیلے سے ہے.....اپنا نام.....اپنا نام مکرم خان (6) بتانا اور کہنا کہ میں پشاور پولیس میں بھی کام کر چکا ہوں.....'' وہ اپنے آدمی کی طرف مڑا۔''کرنل کے سر پر یہ پگڑی باندھ دو۔اس طرح کہ یہ پٹھان لگے.....''

ہندوستان کی مختلف زبانیں مقامی لہجوں میں بولنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے دل کھول کر مجھے عطا کی تھی۔یہی وجہ تھی کہ میں ابھی میرٹھ سے ایک دن کے فاصلے پر تھا کہ مکمل پٹھان بن گیا۔ میں اس وقت ایک مشہور کابلی لوک گیت گنگنا رہا تھا اور پٹھانوں کے سے انداز میں سر کو جنبش دے رہا تھا۔

جھانسی سے روانہ ہونے اور یہاں تک پہنچنے میں کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ میری اصلیت یہ نہیں،لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر پہلے تین دن میں نے منہ سر لپیٹ کر سفر کیا تھا۔جب حالات پرسکون رہے تو میں نے بے خوف ہو کر سفر شروع کر دیا جس وقت میرٹھ میں داخلے کا وقت آیا اس وقت میں خود کو واقعی حسن زئی محسوس کر رہا تھا نہ صرف میری زبان پر پشتو الفاظ تھے بلکہ میں سوچ بھی پشتو میں رہا تھا میرے ذہن میں انگریزی کھانوں کا بھی کوئی تصور موجود نہ تھا بلکہ یہی سوچ رہا تھا کہ موقع پاتے ہی کہیں سے گوشت کا سالن اور ابلے ہوئے چاول کھاؤں گا۔

البتہ یلدرم کے کزن غلام بیگ کی طرف سے میں تھوڑا سا پریشان ضرور تھا۔مقامی کیولری

لائنز میرٹھ کی دوسرے جانب واقع تھیں جہاں جا کر مجھے غلام بیگ سے ملنا تھا۔ نئے ریکروٹ کی حیثیت سے وہ پوری طرح اپنی تسلی کرتا اور ممکن ہے کہ کہیں میری پول کھل جاتی۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میرے ساتھ یلدرم بھی مارا جائے گا۔

یہی کچھ سوچتا میں نالے کا پل پار کر کے مال پر آ گیا جو برٹش ٹاؤن کی طرف جاتی تھی۔ گھوڑے پر سوار میں ایک ایسی انگریز عورت کے قریب سے گزرا جو اپنے دو بچوں کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی۔ اس نے یوں اپنے بچوں کو میری جانب متوجہ کیا جیسے میں علی بابا چالیس چور والی کہانی کا کوئی کردار ہوں۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ انگریز عورت کافی دیر کھڑی مجھے دیکھتی رہی تھی۔

تھرڈ لائٹ کیولری کے ہیڈ کوارٹرز پہنچ کر میں نے وردی میجر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور مجھے فوراً غلام بیگ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اس سے مل کر میرے وہ تمام خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے جو راستے بھر کالے سانپوں کی طرح مجھے ڈستے رہے تھے۔

میں نے اسے وہی کہانی سنائی جو یلدرم نے میرے لیے مرتب کی تھی۔ غلام بیگ نے بغیر کسی اعتراض کے اسے من وعن قبول کر لیا تھا۔

''میرے لیے یہی کافی ہے کہ تمہیں یلدرم خان نے بھیجا ہے کہ مکرم خان!'' اس نے مجھے نئے نام سے مخاطب کیا ''تم خود کو کیولری کا سپاہی سمجھو لیکن دوپہر کو کرنل صاحب سے ملاقات کے لیے تیار رہنا۔''

میں اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل آیا۔

دوپہر کو اردلی روم کے برآمدے میں کرنل صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ جب میں نے انہیں سلیوٹ کیا تو انہیں نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور پھر انگریزی میں وردی میجر سے مخاطب ہوئے۔

''تم صحیح کہتے تھے۔ غلام بیگ! اس کا واسطہ پہلے بھی فوجی بوٹوں اور گھوڑوں سے رہ چکا ہے۔''

وردی میجر نے یقینی طور پر میرے بارے میں انہیں اپنی رائے سے آگاہ کیا تھا۔ وہ پھر میری طرف مڑے ''ٹھیک ہے جوان، کمپنی کیولری آپ کا مانگتا!''

کرنل نے اردو کی خوب ریڑھ ماری تھی۔ بمشکل خود کو ہنسنے سے باز رکھ سکا تھا لیکن مقصد بھی

سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کیا میں کیولری میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں دانت نکال دیے اور اثبات میں سر ہلا دیا ''ہاں' صاحب!''

کرنل نے فوری طور پر میری تقرری کے احکامات صادر کر دیے۔

غلام بیگ مجھے واپس لے آیا۔ میں نے حلف اٹھایا اور نمک کی ایک ڈلی کھائی۔ مجھے بتایا گیا کہ اب میں تھرڈ مقامی لائٹ کیولری کا ایک سوار ہوں۔ میرا دفعدار قدرت علی ہوگا۔ تنخواہ ایک روپیہ روز ہوگی۔ چوتھائی آنہ دھلائی الاؤنس ملے گا اور اگر میرا رویہ شریفانہ اور دوستانہ رہا تو ترقی بھی ملے گی۔

مجھے ایک نئی پگڑی' ہاف بوٹس اور سلور گرے رنگ کی یونیفارم دے دی گئی۔ ایک زائفل فراہم کی گئی۔ میرے مطالبے پر ایک خنجر بھی میرے حوالے کر دیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں اپنا یونیفارم پہن کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو خود پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

گیارہویں حصار' سترہویں لانسرز کا تجربے کار سوار اور کمانڈر انچیف کا سابق ایڈی، کرنل ہیری پیگٹ فلیش مین اب تھرڈ کیولری کا ایک قائم مقام سوار تھا۔

میں مسکراتا ہوا اپنی اس کوٹھری میں آ گیا جو رہائش کے لیے مجھے دے گئی تھی۔ میرے علاوہ بھی کئی فوجی وہاں مقیم تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنی چارپائی بچھائی۔ پگڑی اتاری اور پھر ان کی باتوں میں شریک ہو گیا۔

وہ سب پٹھان تھے اور مجھے بھی یہی ظاہر بلکہ ثابت کرنا تھا کہ میں بھی پٹھان ہوں۔ مجھے پشتو پر مکمل عبور تھا لیکن وہ القاب و آداب اور جملے نہیں جانتا تھا جو بے تکلف دوست ایک دوسرے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ میں شاید کہیں نہ کہیں پکڑا جاتا لیکن پیر علی نامی ایک بلوچ نے مجھ سے کہا کہ کیا میں بازار چلنا چاہتا ہوں۔ میں نے فوراً حامی بھر دی اور یوں پہلے دن کی مصیبت ٹل گئی۔ (7)

لیکن اندازہ ہوا کہ مجھے اپنی بہت سی عادتیں ترک کرنا ہوں گی مثلاً انگریزوں کے بیٹھنے اور ناک سے آواز نکالنے کے مخصوص انداز تو قطعی بھولنے ہوں گے۔ کوئی شخص اگر بات کرے تو جواب دینے سے پہلے انگریزوں کی طرح گلا نہیں صاف کرنا ہوگا بلکہ کھردرے لہجے میں بات کرنا ہوگی۔

میں مزید محتاط ہو گیا لیکن جب ایک دن پیر علی نے مجھے نسوار کھانے کے لیے دی تو میں پریشان ہو گیا کہ اب کیا کروں؟ جیسے تیسے اس سے جان چھڑائی تو ایک مرغی تھما دی گئی کہ اسے ذبح کر کے کھال اتارو اور تو اور ایک سپاہی اپنا چاقو لے آیا کہ حسن زئی سے تعلق رکھنے والے چاقو تیز کرنے میں ماہر تصور کیے جاتے ہیں' ذرا میں بھی اپنی مہارت کا مظاہرہ کروں۔

میں کسی نہ کسی طرح ان مشکلات پر قابو پاتا رہا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ یہ لوگ میرا امتحان لے رہے ہیں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہ سب سیدھے سادے لوگ تھے اور اس طرح کی ہیرا پھیری سے واقف نہ تھے۔

لیکن ایک بات میں نے بطور خاص نوٹ کی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی انگریزوں سے خوش نہ تھا۔ میرے ساتھیوں میں ہندو' سکھ اور مسلمان سبھی لوگ تھے۔ وہ شام کو جب گپیں ہانکنے کے لیے بیٹھتے تو ان کا موضوع صرف اور صرف انگریز ہی ہوتے جنہوں نے بقول ان کے، ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا۔

پہلے پہل تو میں نے ان باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا لیکن ایک روز ایک ایسا واقعہ ہوا کہ مجھے اس معاملے کی سنجیدگی کا شدت سے احساس ہوا۔

کیولری کا ایک اوڈھ سوار شہر سے کبڈی کا ایک مقابلہ جیت کر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں چند انگریز فوجیوں سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ شاید ان میں کوئی تلخ کلامی ہوئی اور انگریز فوجیوں نے اس کی چوٹی کاٹ ڈالی۔ سوار روتا ہوا واپس آیا کیونکہ ہندوستان میں چوٹی کو مقدس حیثیت حاصل تھی۔ اس کے ساتھیوں نے بہت دلاسے دیے لیکن وہ بدستور روتا رہا اور کہتا رہا کہ اس کا دھرم بھرشٹ ہو گیا ہے۔

''میں کرنل صاحب سے شکایت کروں گا'' بالآخر اس نے فیصلہ سنایا۔

وہاں گوبند ادل نامی ایک ہندو بھی موجود تھا۔ اس نے سوار کی بات سن کر نفرت سے منہ سکوڑا ''اس سے کیا ہو گا! جو شخص پہلے ہی ہمارا آٹا گندا کر رہا ہے۔ وہ اپنی قوم کے فوجیوں کے خلاف کیونکر کارروائی کرے گا۔''

''یہ آٹے کا کیا قصہ ہے؟'' میں فوراً پیر علی کی طرف مڑا' اس نے کندھے اچکا دیے۔

''ہندوؤں کا خیال ہے کہ صاحب لوگ گائے کی ہڈیاں پیس کر آٹے میں ملا رہے ہیں جس

سے ان کا دھرم خراب ہو رہا ہے' لیکن ہماری بلا سے' ہندوؤں کا مذہب خراب ہونے سے کم از کم میں تو بہت خوش ہوں۔''

''مگر وہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟''

سیتا گوپال نامی ایک اور فوجی نے میرا جملہ سن کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور زور سے زمین پر تھوکا۔

''تم کہاں رہتے ہو، حسن زئی؟'' اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔ ''سرکار ہر ایک .....کا مذہب خراب کرنے پر تلی بیٹھی ہے' زیادہ خوش فہمی کی ضرورت نہیں' آٹے میں سؤر کی پیسی ہوئی ہڈیاں بھی شامل ہوتی ہیں جو تمہارے مذہب میں حرام ہے۔ یہ بات نائیک شیر افضل نے مجھے بتائی ہے جس نے کانپور کی فیکٹری میں انہیں پڑا دیکھا ہے''

''لیکن اس سے صاحب لوگوں کو کیا فائدہ؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا یا شاید اس میں انگریز ہونے کا بھی کوئی دخل تھا'' وہ بھلا اپنے فوجیوں سے کیونکر نفرت کریں گے؟''

مجھے اس وقت بے حد حیرت ہوئی جب کوئی نصف درجن فوجیوں نے مجھے گھیر لیا۔

''ذرا کوہ سیاہ کے اس منشی کی بات تو سنو!'' ان کے لہجے کاٹ دار تھے'' گورے اپنے سپاہیوں سے پیار کرتے ہیں' کیا تم نے ڈم ڈم کے بھنگی کی بات نہیں سنی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور حیران حیران نظروں سے انہیں تکتا رہا۔

تب پہلی مرتبہ میرے علم میں یہ بات آئی کہ ڈم ڈم کے اسلحہ خانے میں ایک انگریز سپاہی نے مقامی سپاہی کو شراب پیش کی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ اس کے مذہب میں حرام ہے۔ اس انگریز سپاہی نے قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھی کو بتایا کہ اتنے پرہیز کی ضرورت نہیں۔ صاحب لوگوں نے مقامی سپاہیوں کے مذہب کو خراب کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا ہے اور کارتوسوں پر گائے اور سؤر کی چربی ملی جا رہی ہے جو دونوں مذاہب میں حرام ہے۔

''اس میں کوئی جھوٹ نہیں' مکرم خان!'' ہمارے ایک اور ساتھی سردول نے گویا مجھے قائل کرنے کے لیے کہا۔ ''کیا تمہارے خیال میں گائے اور سؤر کی چربی والے کارتوس تیار نہیں کیے جا رہے؟ ایسا ہو رہا ہے مکرم خان' تم خود بتاؤ کہ ایسی صورت میں کوئی شخص کس طرح اپنا مذہب محفوظ رکھ سکتا ہے؟''

''ان کا کہنا ہے کہ بنارس میں جوانوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ اپنے کارتوسوں کو خود چکنائی لگائیں'' پیر علی نے ساتھیوں کو بتایا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' رام منگل چلا اٹھا۔ ''صاحب لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ چربی بکرے کی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر سپاہیوں کو اپنی چکنائی تیار کرنے کی اجازت دینے کا کیا مطلب ہوا؟ یہ جھوٹ ہے۔ انلسٹمنٹ ایکٹ کی طرح، جس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ کسی فوجی کو غیر ملک میں جانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ بہرام پور کے انیسویں ڈویژن سے پوچھو، جس کے افسران نے اپنے ماتحتوں سے کہا ہے کہ انہیں لازمی طور پر برما جانا ہوگا لیکن مجھے امید ہے کہ وہ انکار کر دیں گے'' اس نے پر جوش انداز میں ہاتھ لہرائے ''یہ آٹا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ایک سازش ہے، ہندوستان کے باسیوں کے خلاف۔ انگریز اس طرح ہمیں اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔''

''یہ درست ہے'' بوڑھے سردول نے اس کی ہم نوائی کی ''انگریز اب پہلے جیسا نہیں رہ گیا۔ پہلے وہ مقامی ہونے کے باوجود ہمارا احترام کرتا تھا لیکن اب وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم تیسرے درجے کے شہری ہیں۔ وہ بزدل ہو گیا ہے۔ کوئی لڑنے مرنے کی بات ہوتی ہے تو ہمیں آگے دھکیل دیتا ہے۔ وہ صرف ہمیں گولیوں سے ہی نہیں عقائد سے بھی موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے۔''

وہ اس کے بعد بھی بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ میرے جی میں آئی کہ میں انہیں کہوں، یہ شر پسندوں کی سازش ہے اور وہ بلاوجہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانا چاہتے ہیں لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کی حمایت میں بولنا خود میرے مفاد میں نہیں اور پھر میرے نزدیک یہ کوئی ایسا سنجیدہ موضوع بھی نہیں تھا جس کا اس طرح نوٹس لیا جاتا۔ یہ وقتی ابال تھا جو کچھ ہی دیر میں ٹھنڈا ہو جاتا۔

لیکن دو ایک دن بعد ہی مجھے معاملے کی سنجیدگی اور مقامی فوجیوں کے مؤقف کی درستی کا اندازہ ہو گیا۔ میں بازار سے گزر رہا تھا کہ بدمعاش قسم کے انگریز فوجیوں کے ایک گروپ نے مجھے گھیر لیا۔ وہ مقامی سمجھ کر میری پٹائی کرنا چاہتے تھے لیکن جب میں نے تاخیر کیے بغیر بیلٹ میں اڑسا ہوا طمنچہ نکال کر دو تین ہوائی فائر کیے تو انگریز فوجیوں کا گروپ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ اگر کبھی موقع ملا تو ان سے نمٹوں گا ضرور۔

واپس آتے ہوئے جب میں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں

سوچنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ سردول صحیح کہہ رہا تھا۔ اب انگریزوں کی نظر میں مقامی فوجیوں کا وہ احترام باقی نہیں رہ گیا تھا جو میری جوانی کے دنوں میں تھا۔

اس زمانے میں صرف انسانوں کا وقار ہی مقدم نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ ان کے مذاہب اور عقائد کا بھی مکمل احترام کیا جاتا تھا لیکن اب یہ بات بھی نہیں رہ گئی تھی۔ میرے ساتھی فوجیوں نے بتایا کہ انگریز، مسلمان، ہندو اور سکھ فوجیوں کو عیسائیت اختیار کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ میں اسے بھی مذاق ہی سمجھا لیکن ایک اتوار کو مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔

ہمارے کمانڈر کرنل کار مائیکل اسمتھ نے پریڈ کو بتایا کہ فادر رینالڈ آج فوجیوں کو لیکچر دیں گے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس لیکچر کی بظاہر کوئی تک سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ لیکن ایک سپاہی کی حیثیت سے میں بھی دوسروں کے ساتھ لیکچر سننے پر مجبور تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ فادر رینالڈ فوجیوں کو کس قسم کی ترغیب دیتا ہے۔

وقت مقررہ پر کفن کی طرح سفید چہرے والے فادر رینالڈ نے تقریر شروع کی جو انگریزی میں تھی۔ ایک رسالدار اس کے قریب کھڑا تھا جس نے فادر کے خاموش ہونے پر اپنے انداز میں تقریر کا ترجمہ پیش کیا۔

''کسی جگہ ایک زمیندار اپنے دو بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا لیکن وہ پاگل تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں ہی چھوٹے بیٹے کو اس کے حصے کی جائیداد دے دی تھی۔ اس مقصد کے لیے ایک ساہو کار سے قرض بھی لیا گیا۔ چھوٹے بیٹے نے رقم لی اور بازار حسن میں عیاشی اور شراب وغیرہ پینے میں اسے صرف کر ڈالا۔ جب رقم ختم ہوگئی تو وہ گھر آ گیا اور اس کے باپ نے سرزنش کرنے کے بجائے اسے دوبارہ گلے لگا لیا خدا جانے کیوں؟ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی آمد کی خوشی میں اپنی گائے بھی ذبح کر ڈالی۔ ظاہر ہے وہ ہندو نہیں تھا اس لیے اس کے دل میں گائے کا کوئی احترام نہ تھا۔ بڑے بیٹے کو جب اس بارے میں پتا چلا تو وہ بے حد ناراض ہوا کیونکہ گائے میں اس کا حصہ بھی موجود تھا۔ اس نے احتجاج بھی کیا لیکن زمیندار نے اسے عاق کر دیا۔ یہ کہانی اللہ تعالیٰ نے یسوع مسیح کو سنائی تھی اور اگر تم لوگ اس پر اعتبار کرو گے تو جنت میں نہیں جاؤ گے بلکہ انگریز لارڈ گاڈ صاحب کے دائیں سمت جگہ پاؤ گے جو کلکتہ میں رہتا ہے اور وہاں تم سرکار کے احکامات کے تحت موسیقی کے آلات بجاؤ گے۔ پریڈ..... ڈسمس.....''

میں کوئی مذہبی آدمی نہیں تھا لیکن پھر بھی مجھے فادر رینالڈ پر بے حد غصہ آیا جو اس کی طرح بے سروپا باتیں کر کے خود اپنے ہی مذہب کو مشکوک بنا رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتا رہا۔

پریڈ کے بعد میں نے مسلمان سپاہیوں کے چہرے پر مسکراہٹیں دیکھیں جبکہ ہندو اپنی گئو ماتا کی اس طرح توہین پر بری طرح تپے ہوئے تھے۔ شاید انگریز یہ سمجھتا تھا کہ اس طرح دونوں گروہوں میں تصادم کو ہوا دے کر وہ اپنے ہاتھ مضبوط کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن نادانستگی میں وہ اپنے لیے بھی نفرتوں کے بیج بو رہا تھا جو کسی بھی وقت تناور درخت کی صورت اختیار کر سکتے تھے۔

بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ میرے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے لیکن میرا ان سے کوئی براہ راست واسطہ نہ تھا۔ میں اپنے الگ مشن پر ہندوستان آیا تھا۔ اور میری نظر میں اس کی اہمیت زیادہ تھی سو میں نے چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

چند دنوں بعد مقامی یونٹوں کے درمیان نیزہ بازی کے مقابلے ہوئے جس کا مہمان خصوصی گیریژن کمانڈر بل ہیوٹ تھا۔ مقابلے دیکھنے کے لیے تقریباً تمام یونٹوں کے افسران وہاں آئے تھے۔ میں نے حیرت انگیز طور پر ان مقابلوں میں پہلا انعام حاصل کیا۔

جب میں اپنا انعام وصول کرنے کے لیے سلامی کے چبوترے پر پہنچا تو وہاں بیٹھے تمام لوگوں کی ستائشی نگاہیں میرے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔ ان میں انگریز افسران بھی تھے اور ان کی خوبصورت بیویاں اور بیٹیاں بھی تھیں لیکن میں نے اپنی پوری توجہ کمانڈر کی طرف مرکوز کر رکھی تھی جو خود بھی دلچسپ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''شاباش، سوار!'' بل ہیوٹ کی آواز مجھے سنائی دی ''تم نے یہ ہنر کہاں سے سیکھا؟''

''وادیٔ پشاور میں حضور!'' میں نے بصد احترام جواب دیا۔

''کمپنی کیولری؟''

''نہیں، سر! پشاور پولیس''

''مجھے علم نہیں تھا کہ وہ لوگ بھی اچھے گھڑ سوار ہیں'' بل نے کہا اور کار مائیکل اسمتھ کی طرف مڑ کر انگریزی میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے شبہ ہے کہ یہ پہلے بھی سرکار کی نوکری کر چکا ہے۔ کیا

خیال ہے؟''

''سوری سر!'' اسمتھ نے جواب دیا ''ہم اس طرح کے سوال کسی ریکروٹ سے نہیں کرتے۔''

''کوئی بات نہیں'' بل نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

میں نے ان کی باتیں سنیں لیکن اجنبی بن گیا۔ میں نے سلیوٹ کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے سے کمانڈر کی میز پر رکھے کاغذات اڑے اور سیدھے میرے گھوڑے کے پیروں میں آ گرے۔ میں فوراً گھوڑے سے اُترا۔ میں نے کاغذات سمیٹے اور انہیں ترتیب سے دوبارہ کمانڈر کی میز پر رکھ دیا۔ دوبارہ اڑنے سے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے روشنائی کی ایک دوات کاغذات پر رکھ دی اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

میرے نزدیک یہ عام سی بات تھی لیکن میں نے کئی لوگوں کے منہ سے کلمہ ہائے تحسین سنے۔ میں نے سامنے دیکھا تو ڈوف میسن نامی انفنٹری کرنل غور سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ میں نے کوئی توجہ دیے بغیر سلام کیا اور واپس اپنے گھوڑے پر آ بیٹھا لیکن اس وقت بھی میں نے میسن کو اپنی طرف ہی دیکھتے پایا۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے آفیسر کو جھک کر کچھ کہہ بھی رہا تھا۔

میں پریشان ہو گیا' کیا اس نے میرے بہروپ میں کوئی سقم ڈھونڈ نکالا ہے؟ میں سوچتا رہا لیکن کوئی ایسا جواب سامنے نہ آ سکا جس سے میں خود کو مطمئن کر سکتا۔

اگلی صبح جب میں اس واقعے کو تقریباً بھول چکا تھا، رسالدار نے میرا نام پکار کر مجھے لائن سے الگ کر لیا۔

''کرنل ڈوف میسن تم سے ملنا چاہتے ہیں' مکرم خان!'' رسالدار کی آواز کسی ہتھوڑے کی مانند مجھے پر برستی محسوس ہوئی ''فوری طور پر ان کے دفتر میں رپورٹ کرو''

میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے کرنل میسن کے دفتر کی جانب چلا تو یہی سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے میری اصلیت بے نقاب کر دی تو میں اس کا کیا جواز پیش کروں گا۔

کرنل میسن اپنے دفتر میں میرا منتظر تھا۔ وہ دبلے پتلے اور خوبصورت جسم کا مالک ایک طویل

قامت افسر تھا۔ اس کی آنکھیں کسی بلی کی طرح چمکتی نظر آتی تھیں۔ میں نے اس کے سامنے پہنچ کر سلیوٹ کیا تو وہ کافی دیر مجھے سر سے پاؤں تک گھورتا رہا۔ میرے پورے بدن میں چونٹیاں سی رینگ رہی تھیں لیکن میں نے اپنی اس بے چینی کو چہرے سے مترشح نہیں ہونے دیا تھا۔

''مکرم خان!'' بالآخر وہ بولا ''حسن زئی' پشاور پولیس لیکن فوج میں آئے چند ہفتے ہوئے ہیں۔'' وہ بہترین اردو بول رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھی افسران کی نسبت زیادہ اسمارٹ ہے۔

میں نے خاموشی سے سر ہلا کر اس کے الفاظ کی تائید کی۔

''بات یہ ہے' مکرم خان!'' وہ دوبارہ بولا ''مجھے اس بات پر یقین نہیں' تمہارے کرنل کو بھی نہیں۔ تم یقیناً ایک پرانے فوجی ہو کیونکہ تمہارا کھڑے ہونے' سواری کرنے کا انداز تجربے کار فوجیوں جیسا ہے..... صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں کوئی شخص تمہارے دعوے کی تحقیقات نہیں کرے گا اور نہ ہی ہمیں اس بات سے کوئی غرض ہے کہ تم نے وادی خیبر میں کتنے گلے کاٹے ہیں۔ ہمارے لیے تم اب ایک عام سے سوار ہو۔ اور بس لیکن ایک سوار کاغذوں کو سمیٹنے اور انہیں سلیقے سے رکھنے کے بارے میں خاک بھی نہیں جانتا' خاص طور پر ایک پٹھان سے تو اس کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی جسے نوکری میں آئے ہوئے محض چند ہفتے ہوئے ہوں' کیا خیال ہے؟''

''پولیس میں بہت سی کتابیں اور کاغذات ہوتے ہیں حضور!'' میں نے جواز پیش کیا۔

''بالکل ہوتے ہیں'' کرنل میسن نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اچانک انگریزی میں بولا ''دیکھنا تمہارے دائیں ہاتھ کی جانب کیا ہے؟''

میں نے اس طرف نہیں دیکھا لیکن اپنے دائیں ہاتھ کی اضطرابی حرکت کو قابو میں نہ کر سکا۔ کرنل میسن نے ایک قہقہہ لگایا اور پشت گاہ سے کمر ٹکا لی۔

''کل جب تمہارا کرنل اور کمانڈر آپس میں باتیں کر رہے تھے تو میں نے تمہارے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا تھا کہ تم انگریزی سمجھتے ہو۔'' وہ بدستور ہنستے ہوئے بولا۔ ''خیر، مکرم خان! مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں۔ میں نے تمہیں اس لیے یہاں بلایا ہے کہ تم مجھے اچھے لگے ہو اور پہلی ہی نظر میں قابل بھروسا دکھائی دیے ہو۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں سر!''

''میرے پاس ایوب جان نامی ایک پٹھان اردلی تھا'' اس نے میرے جملے پر کوئی توجہ دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ دس سال میرے پاس رہا اور اس عرصے میں اس نے خود کو اعلیٰ ظرف انسان ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن اب وہ واپس اپنے گھر چلا گیا ہے اور مجھے ایک اردلی کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم اس حیثیت میں میرے پاس آ جاؤ۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ وقتی طور پر اپنا بہروپ سلامت رہنے پر مجھے خوشی ہوئی تھی لیکن ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بھی تھی کہ میسن کے قریب رہنے پر وہ کسی بھی وقت میری اصلیت کو بے نقاب کر سکتا تھا لیکن یہ کوئی اتنا بڑا خطرہ نہ تھا۔ وقت آنے پر میں اس سے بھی نمٹ سکتا تھا۔

ایک انگریز کرنل کا اپنے ہی ہم پلہ اور ہم قوم آفیسر کا اردلی بننا بھی ایک عجیب سی بات تھی لیکن مقامی فوجیوں کی بیرکوں میں رہنے سے یہ کہیں زیادہ بہتر تھا چنانچہ میں نے حامی بھر لی۔

کرنل بھی خوش ہو گیا ''میں ابھی اسمتھ سے بات کرتا ہوں۔''

دوپہر کو میں کرنل میسن کے بنگلے پر جا پہنچا۔ بنگلہ کیا، اچھا خاصا محل تھا جو برٹش انفنٹری لائنز کے قریب مال کے آخری سرے پر واقع تھا۔ تیس کے قریب ملازم تھے لیکن کوئی ایسی میم صاحب نہ تھی جو ان سے بہتر انداز میں کام لے سکتی۔

میں ایک اردلی کی حیثیت سے گیا تھا لیکن کرنل میسن نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے کام کا آغاز اس کے گھریلو اسٹاف سے کام لینے اور نگرانی کرنے سے کروں۔ باورچی خانے کا انتظام بھی میرے پاس تھا اور جب پہلی مرتبہ باورچی خانے میں داخل ہوا تو ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران میں اسٹاف آفیسر، خفیہ سیاسی ایجنٹ، سفیر اور سپاہی رہا تھا تو اب ایک مقامی باورچی بننے میں بھلا کیا قباحت تھی؟

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ گھر میں ایسی کوئی میم نہ تھی جو نوکروں کی نگرانی کر سکتی اس سے میری مراد یہ تھی کہ کرنل میسن کی کوئی لیڈی نہ تھی۔ وہاں دو سفید فام عورتیں ضرور موجود تھیں لیکن دونوں ہی انتظامی امور کے لیے قطعی طور پر ناکارہ تھیں۔ چھوٹے قد اور خاصے صحت مند جسم کی مالک مس بلنچ جوڈوف، میسن کی بہن تھی اور دوسری مسز لیزلی، ان کی قریبی رشتے دار اور شاید خود ساختہ بیوہ، جو شریف عورت سے زیادہ کسی ملاح کی محبوبہ لگتی تھی۔ وہ دبلی پتلی قبول صورت اور سرخ بالوں کی مالک تھی۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ گیریژن آفیسرز پر لگی رہتی تھیں اور اسے ان سے فلرٹ

کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس کے علاوہ صرف گھڑ سواری ہی کا اسے شوق تھا۔

دونوں کی گھریلو کاموں سے عدم دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ شام کو جب ان کی پڑوسن مسز کیپٹن میک ڈوول ان سے ملنے آئی تو اسی نے مجھے میری ذمے داریوں سے آگاہ کیا لیکن میں ان سے پہلے ہی پوری طرح آگاہ تھا۔

میں نے گھر میں آتے ہی کام شروع کر دیا اور اگلے چند ہفتوں میں خود کو ماحول میں اس طرح فٹ کر لیا جیسے جنم جنم سے یہیں رہتا اور یہی کام کرتا چلا آیا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ مزید کچھ عرصہ میسن کی روٹیاں توڑوں گا پھر جھانسی چلا جاؤں گا اور اپنا باقی ماندہ مشن انجام دوں گا۔

کبھی کبھار رانی یاد آتی تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور میں دوسری جانب دل لگانے کی کوشش کرتا۔ میرے ساتھ باورچی خانے میں ایک مقامی خادمہ بھی کام کرتی تھی۔ میں نے اسی کو رانی کے متبادل کے طور پر قبول کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بات بھی نوٹ کی تھی کہ مسز لیزلی اکثر چور نگاہوں سے مجھے دیکھا کرتی ہے۔ میں اس کی نظروں میں ایک پٹھان تھا شاید اسی وجہ سے وہ جھجکتی تھی، ورنہ اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں بھی اس کی طرح انگریز ہوں تو جانے کب کا کچا کھا گئی ہوتی۔

ایک آدھ بار میں نے بھی بھرپور نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا اور اس فیصلے پر پہنچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر وہ میرے ساتھ دوستی کر لے تو کوئی ایسی بری بھی نہ لگتی۔ میں اس کے علاوہ بھی کئی ایسی بیوہ عورتوں سے واقف تھا جو انڈین گیریژن کے افسران اور جوانوں کے دم سے اپنا سہاگ آباد کیے ہوئے تھیں۔

میسن کے گھر خدمات انجام دینے کے دوران میں بیرکوں میں بھی جاتا رہا تاکہ تازہ ترین حالات سے آگاہی ہوتی رہے۔ مجھے پتا چلا کہ کرنل اسمتھ مجھے واپس لانے کا خواہش مند ہے لیکن خود میں ابھی میسن کے گھر کی تن آسانیاں چھوڑنے کو تیار نہ تھا مگر جب کبھی رجمنٹ کے تمام سپاہیوں کو کال کیا جاتا تو مجھے بھی پریڈ میں شرکت کے لیے جانا پڑتا۔

انہی دنوں سپاہی رام منگل کی زبانی مجھے علم ہوا کہ بہرام پور میں انیسویں انفنٹری نے چربی لگے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

''انہیں خصوصی عدالت نے نااہل قرار دے دیا ہے'' رام منگل کے لہجے میں نفرت ہی نفرت

تھی۔ ہم دونوں اس وقت اسلحہ خانے میں تھے جہاں رائفلیں رکھنے گئے تھے۔ ''افسروں نے جوانوں کو گھر بھیج دیا ہے کیونکہ وہ ایسے باغیوں کو مسلح رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔''

''اگر گائے کی چربی ان کی انگلیوں پر لگ بھی جائے گی تو کیا ہوگا؟'' سپاہی پیر علی نے اسے چڑایا۔

''شاید تم نے اسے نہیں دیکھا'' منگل غصے سے لال پیلا ہوگیا اور اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر پیر علی کی طرف پھینک دیا ''یہ تمہارے ان مسلمان بھائیوں کی طرف سے ہے جو بڑی وفاداری سے صاحب لوگوں کے تلوے چاٹ رہے ہیں۔ اس عظیم جہاد کی اپیل پڑھو، جسے تمہارے مُلّاں صرف ہندوستان میں ہی نہیں پورے عرب اور ترکستان میں گا گا کر سنا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افغان فوج ہندوستان پر حملے کے لیے تیار بیٹھی ہے' بقول ان کے ہزاروں غازی' ہاتھیوں کی طرح مضبوط اور طاقت ور.....'' اس نے قہقہہ لگایا ''ہماری مدد کو آ رہے ہیں۔ لیکن ان بے وقوفوں کو اس بات کا علم نہیں کہ عظیم کالی دیوی کے لمبے ہاتھ پہلے ہی انگریزوں کو نیست و نابود کر دیں گے۔''

جو کاغذ رام منگل نے پیر علی پر پھینکا تھا وہ اسی طرح کا اشتعال انگیز پمفلٹ تھا' جس طرح کے پہلے بھی تقسیم کیے گئے تھے۔ میں نے پیر علی کے ہاتھ سے پمفلٹ لے کر اسے پڑھا اور تہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔(8)

بوڑھے سردول نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بہرام پور والوں نے کھائے ہوئے نمک سے غداری کر کے اچھا نہیں کیا''

''اور کیا سرکار نے سپاہیوں کے مذہب کا مذاق اڑا کر پہلے غداری نہیں کی؟'' رام منگل چلا اٹھا۔ ''پہل بہرام پور سے ہوئی ہے' دیکھنا یہ ہے کہ اگلا نمبر کس کا ہے۔ یہ سب بڑی تیزی سے ہماری سمت بڑھ رہا ہے بھائیو!''

وہ یہی نعرے لگاتا باہر نکل گیا۔ میں بھی مسکراتا ہوا ایک جانب چل دیا۔ اس وقت میری نظر میں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن دو تین راتوں کے بعد جب یہ موضوع انگریز افسران کی ایک محفل میں چھڑا تو مجھے اس کی سنگینی کا احساس ہوا۔

اس اجلاس میں کرنل میسن کے علاوہ آرٹلری کمانڈر آرکڈائل ولسن' بل ہیوٹ' کار مائیکل

اسمتھ اور چند دوسرے لوگ شامل تھے۔ تھرڈ کیولری کا ایک سینئر فرد جیک واٹر فیلڈ بھی محفل میں موجود تھا اور ان کی بات چیت صرف اور صرف بہرام پور کے بارے میں تھی۔ وہ نئے کارتوسوں کے اجراء کے بارے میں غور کر رہے تھے۔

''ہمیں نئے کارتوس ہر حال میں جاری کرنے چاہئیں'' کارمائیل اسمتھ نے کہا ''بہرام پور میں مقامی فوجیوں کے انکار کے بعد تو یہ بے حد ضروری ہو گیا ہے _____ مجھے تو لگ رہا ہے کہ وہاں ہونے والا شاخسانہ بعض شر پسندوں کا کھڑا کیا ہوا ہے جنہوں نے سادہ لوح سپاہیوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہاں کے مسلمان اور ہندو سپاہیوں کو یہ باور کرانا ہو گا کہ ان کارتوسوں میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں جس سے ان کے مذہب کی توہین ہوتی ہو۔ اس کامیابی سے ان لوگوں کو بھی مایوسی ہو گی جو سپاہیوں میں بے چینی پھیلانا چاہتے ہیں؟''

''ہماری رجمنٹ میں تو ایسا کوئی شخص نہیں'' میری اپنی کمپنی کو کمان کرنے والے پلوڈین نے کہا۔

''ہمارے سپاہی بہترین افراد ہیں۔'' تھرڈ کیولری کے ایک اور میجر رچرڈسن نے رائے ظاہر کی ''وہ اتنے بے وقوف نہیں کہ بہرام پور والوں کے انجام سے سبق حاصل نہ کر سکیں''

''لیکن فرض کریں کہ انہوں نے انکار کر دیا تب؟'' ایک نوجوان آفیسر بولا ''کیا ان کے ساتھ.....''

''یہ بذاتِ خود ایک بے وقوفی ہے کاک!'' کارنائیکل اسمتھ نے اس کا جملہ کاٹا ''تم سپاہیوں کو نہیں جانتے اور پھر میرے سپاہی..... مجھے ان پر مکمل اعتماد ہے.....'' وہ میری طرف مڑا اور اردو میں مجھ سے مخاطب ہوا ''.....مکرم خان! تم ایک مسلمان ہو۔ اگر نئے کارتوس تمہیں دیے جائیں تو کیا تم انہیں استعمال کرو گے؟''

''کیوں نہیں سر!''

''اور تمہارے دوسرے ساتھی؟'' ولسن نے پوچھا

''وہ بھی کریں گے' بشرطیکہ کرنل صاحب انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ کارتوس صاف ستھرے ہیں''

ان سب لوگوں نے اثبات میں سر ہلائے۔ یعنی وہ میری دلیل سے متفق تھے' لیکن اگلے روز

جب میں ساتھیوں کے پاس پہنچا تو وہاں ایک اور ہی افواہ گشت کر رہی تھی۔ تب میں نے پہلی مرتبہ ایک نیا نام سنا جس نے پورے ہندوستان اور پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

''پانڈے؟'' میں نے پیر علی سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''بارک پور میں متعین چونتیسویں رجمنٹ کا ایک سپاہی'' اس نے جواب دیا ''اس نے پریڈ گراؤنڈ پر اپنے کپتان کو گولی ماردی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ شراب یا بھنگ کے نشے میں تھا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو افسران کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ درست ہو' یا ممکن ہے محض افواہ ہی ہو' لیکن رام منگل ان ہندو بھیڑوں کو سمجھانے میں مصروف ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔''(9)

ہم رام منگل کے پاس پہنچے جو ایک بیرک کے وسط میں کھڑا پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

''یہ جھوٹ ہے کہ سپاہی پانڈے نشے میں تھا'' اس نے پرجوش انداز میں کہا ''یہ صاحبوں کی سازش ہے۔ وہ ایک ایسے ہیرو کی توہین کرنا چاہتے ہیں جو اپنے مذہب پر قربان ہوگیا ہے۔ اس نے کارتوس لینے سے انکار کردیا تھا۔ جب انہوں نے اسے گرفتار کرلیا تو اس نے اپنے بھائیوں کو بلایا کیونکہ انگریز ہمارے مذہب کو ختم کرنے اور ہمیں غلام بنانے کے لیے اپنے فوجیوں کی نئی بٹالین لا رہا ہے لیکن بارک پور کے کیپٹن نے اپنے ہاتھوں سے پانڈے کو گولی ماردی۔ وہ زخمی ہوا اور انہوں نے اسے تشدد کے لیے اب تک زندہ رکھا ہے''

وہ خاموش ہوا تو دوسرے لوگوں کی بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔ ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔

''ممکن ہے یہ جھوٹ ہو؟'' ایک جانب سے آواز آئی۔

''یہی سچ ہے'' رام منگل دھاڑا۔

''بات سنو منگل!'' میں نے غصے میں بپھرے ہوئے فوجی کو مخاطب کیا ''بجائے اس کے کہ تم لوگ یہاں کھڑے ہوکر ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا شروع کردو' کرنل صاحب کے پاس چلے جاؤ اور ان سے اس واقعے کی صداقت کے بارے میں پوچھ لو۔ یہ پتا بھی چل جائے گا کہ یہاں بھی نئے کارتوس دیے جارہے ہیں یا نہیں۔''

''میں کرنل سے بات کروں گا'' وہ قدرے بدتمیزی سے بولا ''لیکن وقت آنے پر''

اور یہ وہ خود ہی بہتر جانتا تھا کہ اس کے لیے ایسا وقت کون سا ہو سکتا تھا؟

میں چونکہ اب زیادہ وقت میسن کے ہاں گزارتا تھا اس لیے مجھے زیادہ تفصیل سے پتا نہ چل سکا کہ بیرکوں میں کیا ہو رہا ہے البتہ یہ علم ضرور ہوا کہ سپاہی پرسکون انداز میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور رام منگل کا وہ وقت اب تک نہیں آیا جب وہ کرنل سے بات کرتا۔

پھر ایک روز مجھے پتا چلا کہ سپاہی پانڈے کو بارک پور میں بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی گئی ہے۔ تب میری چھٹی حس نے سرگوشی کی کہ کچھ ہونے والا ہے لیکن اگلے کئی دن بھی خاموشی سے گزر گئے تو میں بھی اپنے معمولات میں مگن ہو گیا۔

اس عرصے میں سرخ بالوں والی مسز لیزلی نے مجھ میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ سلسلہ چھوٹی چھوٹی نوک جھونک سے شروع ہوا اور پھر اس کی طرف سے ڈوف میسن کو یہ درخواست موصول ہوئی کہ میں مس بلنچ اور اس کی گھڑ سواری کے وقت ان کی حفاظت کے فرائض انجام دیا کروں۔ کچھ دن تو دونوں خواتین جاتی رہیں لیکن جلد ہی مسز لیزلی نے مس بلنچ سے پیچھا چھڑا لیا اور تنہا میرے ساتھ گھڑ سواری کے لیے جانے لگی۔ وجہ یہ بتائی کہ اسے کوئی ایسا خدمت گار درکار تھا جو انگریزی سمجھ سکتا اور ہندوستان کے بارے میں اس کے سوالوں کے جواب دے سکتا کیونکہ بقول اس کے اسے اس پُراسرار سرزمین سے گہری دلچسپی تھی۔

میں جانتا تھا کہ اسے اصل دلچسپی کس چیز میں ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ وہی پیش رفت کرے۔ وہ اس لیے جھجک رہی تھی کہ میں پٹھان تھا، یعنی کالا تھا اور شاید وہ کسی کالے کے بازوؤں میں آنے کو توہین سمجھتی تھی۔

لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ اس کالے کی طرف مائل ہونے لگی۔ گھڑ سواری کے دوران بعض ذومعنی جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ وہ مسکرا دیتی تو میں بھی مسکرا کر اس سے لگاوٹ کا اظہار کر دیتا۔ جب کبھی میں اسے گھوڑے سے اترنے میں مدد دیتا تو جان بوجھ کر اسے چند ثانیوں کے لیے لپٹا لیتا اور پھر یوں چھوڑ دیتا جیسے نادانستگی میں ہو گیا ہو یا گھوڑے سے اتارتے وقت ایسا کرنا ضروری ہو۔ وہ کبھی میری اس جرأت پر برافروختہ نہیں ہوئی جس سے میں یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ

پوری طرح میری طرف مائل ہوگئی ہے۔

آخر ایک روز اس نے بات چیت کا رخ میری ذات کی طرح موڑ دیا۔ ''تم پٹھان لوگ' خالص ہندوستانی تو نہیں؟'' وہ کہنے لگی ''میرا مطلب ہے.....دوسروں کی نسبت زیادہ گورے ہو.....اور انداز بھی مختلف ہیں۔''

''ہم ہندوستانی نہیں ہیں' میم صاحب!'' میں نے اسے مایوس نہیں کیا ''ہمارا تعلق ابراہیمؑ' اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی نسل سے ہے جنہیں موسیٰؑ اپنے ساتھ فرعون کے ملک سے لے آئے تھے۔!''

''تمہارا مطلب ہے' تم لوگ بنی اسرائیل میں سے ہو؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا' پھر وہ کچھ دیر خاموشی سے گھوڑا دوڑاتی رہی ''کتنی عجیب بات ہے'' چند ثانیوں بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''برطانیہ میں بھی بنی اسرائیل کے لوگ آباد ہیں' وہ بھی اسی طرح گورے ہیں۔''

اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ میرے ہندوستانی نہ ہونے کی بابت سن کر وہ بے حد خوش ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی اسے چارہ ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگلے روز میں نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ علی گوٹھ چلا جائے۔

''وہاں کیا ہے؟'' اس نے بھویں اچکا کر پوچھا۔

''ہندوؤں کے ایک قدیم مندر کے کھنڈرات ہیں'' میں نے جواب دیا ''یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے میم صاحب' صرف چھ میل کا فاصلہ ہے.....''

میں نے علی گڑھ اور مندر کے بارے میں اسے بہت کچھ بتایا لیکن اس بارے میں اسے ایک لفظ بھی نہیں کہا کہ اس کی اندرونی دیواروں پر کس قسم کی تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی اس بات سے لاعلم تھی کہ ہندو مذہب میں جنس کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ مندر کی دیواروں پر یہی جنسی کہانیاں رنگوں اور برش کی مدد سے رقم کی گئی تھیں۔

اس کی ہندومت سے لاعلمی میرے بہت کام آئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے ان بے ہودہ تصاویر پر پہلی ہی نظر ڈالی تو اس کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوگئی۔ میں کچھ فاصلے پر گھوڑوں کے قریب کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چور نگاہوں سے میری غیر موجودگی کو محسوس کیا اور زیادہ دلچسپی کے ساتھ تصویریں دیکھنے لگی۔

وہ ان میں اس قدر کھو گئی کہ میں جب اس کے عین عقب میں جا کھڑا ہوا' تب بھی اسے میری موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ میں اس کی تیز تیز سانسوں کی آواز بخوبی سن رہا تھا لیکن وہ آنکھیں پھاڑے' گردوپیش سے بے خبر ان مناظر میں کھوئی ہوئی تھی۔

''ہندو مذہب ایسی لغو چیزوں سے بھرا پڑا ہے'' میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے ایک تصویر دیکھ کر رائے ظاہر کی۔

وہ چونکی' میں نے اس کے جسم کی کپکپاہٹ واضح طور پر محسوس کی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور میرے بدن سے ٹکرا کر یک دم سیدھی ہو گئی۔ اب اس کا سرخ چہرہ اور لرزتے ہونٹ میرے سامنے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس بات کو فراموش کر دیا کہ اس کی نظروں میں' میں کالا باورچی ہوں۔ وہ چہرہ اٹھائے میری طرف نگراں تھی۔ میں نے اپنے دونوں بازو اٹھائے اور اسے ان میں قید کر لیا۔

اس نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ وہ یوں پرسکون ہو گئی جیسے اسے میری ہی تلاش تھی۔ وہ میرے سینے میں سر چھپائے کپکپاتی رہی اور میں جھک کر اس کے رخساروں پر جمے تصوراتی موتیوں کو اپنے ہونٹوں کی مالا میں پروتا رہا۔

''مکرم خان!'' کچھ دیر بعد مجھے اس کے ہونٹ اپنے سینے پر ہلتے محسوس ہوئے تو میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھا لیا۔

''جی' میم صاحب!'' میں اس عالم میں بھی اپنے بہروپ کو نہیں بھولا تھا۔

''تت ..... تمہیں ..... یقین ہے نا کہ تم ہندوستانی نہیں ..... بنی اسرائیلی ہو .....''

''ہاں' میم صاحب!''

میرا جواب سنتے ہی اس کی ساری شرم اور جھجک بدلیوں کی مانند تیز ہوا کے ساتھ اڑ گئی .....اس کے بعد ہمارا علی گوٹھ جانا معمولات میں شامل ہو گیا اور ہم نے اس مندر کے کھنڈرات میں ایسی ایسی داستانیں رقم کیں جو ہندو مذہب میں شامل کر لی جاتیں تو اسے ایک نیا جنم مل جاتا۔

مئی کی آمد آمد تھی۔ درجہ حرارت میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن پریڈ گراؤنڈ پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ البتہ لمحہ بہ لمحہ کشیدگی کی شدت ضرور محسوس کی جا سکتی تھی۔ ہر شخص دوسرے سے خوفزدہ اور متنفر دکھائی دیتا تھا۔

افواہیں گشت کرنے لگیں کہ پھانسی پانے والے سپاہی پانڈے کی چونتیسویں رجمنٹ کو بارک پور میں غیر مسلح کر دیا گیا ہے۔ میرٹھ کے بازار میں ایک ہاتھی پر سوار پراسرار فقیر نمودار ہوا جس نے پیشگوئی کی کہ کالی کارتھ انگریزوں پر گرنے ہی والا ہے۔ جنگ پلاسی کی روایت کے عین مطابق بعض بیرکوں میں چپاتیوں کی گردش بھی دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک اور افواہ خطرناک تھی جس نے پورے میرٹھ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ رام منگل کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اگر تھرڈ نیٹو کیولری کو نئے کارتوس جاری کیے گئے تو وہ انہیں استعمال کرنے سے انکار کر دے گی۔

میرے یہ اندیشے بھی درست ثابت ہوئے کہ انگریز افسر شاید ہی اپنے سپاہیوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو سکیں کہ کارتوس صاف ستھرے اور کسی بھی قسم کی چربی سے پاک ہیں چنانچہ جب کرنل اسمتھ نے تھرڈ کیولری کے لیے فائرنگ پریڈ کے احکامات صادر کیے جس میں نئے کارتوسوں کو ڈیمانسٹریٹ کیا جانا تھا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ حتمی کارروائی کا وقت آ پہنچا ہے۔ پریڈ کے موقع پر اس بات کا فیصلہ ہو جاتا کہ تھرڈ کیولری کا مستقبل کیا ہے؟

واٹر فیلڈ نے پریڈ سے پہلے سپاہیوں سے مل کر معاملات سلجھانے کی کوشش کی اور پرانے سواروں کو یقین دلایا کہ نئے کارتوسوں پر چربی نہیں لگائی گئی۔ وہ کسی بھی قسم کی آلائش سے پاک ہیں۔ لیکن انہوں نے بیک زبان درخواست کی کہ انہیں نئے کارتوس استعمال کرنے کے لیے نہ کہا جائے۔

میرا خیال تھا کہ واٹر فیلڈ، کرنل اسمتھ کو اس امر پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن مجھے یہ سن کر بے حد حیرت ہوئی کہ کرنل نے فائرنگ پریڈ مقررہ وقت پر منعقد کرنے کے احکامات صادر کیے ہیں۔

سب لوگوں کو علم تھا کہ پریڈ والے دن کیا ہونا ہے لیکن کسی نے بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر

پریڈ سے فرار کی کوشش نہیں کی مگر سب کے چہروں پر تناؤ تھا۔ حتیٰ کہ جب کرنل اسمتھ پریڈ کے معائنے کے لیے گراؤنڈ میں داخل ہوا تب بھی سپاہیوں نے محض میکانکی انداز میں اسے سلیوٹ کیا ورنہ ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی خیر مقدمی تاثرات نہ تھے۔

خود کرنل اسمتھ کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایک سپاہی کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ گراؤنڈ پر مکمل خاموشی طاری تھی۔ سورج ہماری پشت پر تھا لیکن پسینہ پورے جسم سے بہ رہا تھا۔ نائیک قدرت علی میری دائیں جانب تنا کھڑا تھا جبکہ بائیں جانب سردول تھا جس کے سانس لینے کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔

کارمائیکل اسمتھ نے معائنہ مکمل کیا اور عین میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ تانبے کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ چند ثانیے خاموش رہا اور پھر کڑکتی ہوئی آواز میں احکامات صادر کرنے لگا۔ حوالدار میجر' لائن سے چند قدم نکلا۔ مارچ کرتا ہوا وہ اسمتھ کی طرف بڑھا اور اسے سلیوٹ کرنے کے بعد اس سے ذرا فاصلے پر ہماری جانب رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ جیک واٹر فیلڈ، کرنل کے عقب میں موجود تھا اس نے پلاٹون ایکسرسائز مینول سے احکامات پڑھنے شروع کر دیے۔

''لوڈ کے لیے تیار رہو ..... رائفل بائیں ہاتھ میں لے کر بند کر لی جائے .....''

جیک کی آواز دوبارہ سنائی دی' اور پھر وہ کارتوس لوڈ کرنے کا طریقہ بتانے لگا۔

حوالدار میجر کا چہرہ اس وقت دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ سرکار کے احکامات ماننے پر مجبور تھا اور ایک سو اسی آنکھیں دشمنوں کے ہاتھوں میں موجود رائفلوں کی بیرلوں کی مانند اسے گھور رہی تھیں۔ اس نے آہستہ روی کے ساتھ رائفل لوڈ کی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''پریزنٹ!'' جیک کی آواز آئی ''ناؤ' فائر!''

حوالدار میجر نے رائفل کا رخ آسمان کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ کچھ دیر گولی چلنے کی گونج سنائی دی' پھر خاموشی چھا گئی۔ سپاہی اب تک چپ تھے۔

اچانک مائیکل اسمتھ کی آواز خاموشی کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ ''تم لوگ لوڈنگ ڈرل دیکھ چکے ہو'' وہ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز معمول کے مطابق تھی۔ ''حوالدار میجر نے جو ایک اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہے' تم لوگوں کے سامنے رائفل لوڈ کی اور گولی چلائی۔ اسے علم ہے کہ کارتوس پر لگی ہوئی چکنائی صاف ستھری ہے لیکن میں تم لوگوں کو دوبارہ یقین دلاتا ہوں کہ کوئی ایسی شے تم لوگوں کو نہیں

دی جارہی جس سے مسلمان یا ہندو مذہب کی توہین ہوتی ہو۔ میں خود اس بات کی کبھی اجازت نہیں دوگا.....ناؤ کیری آن.....حوالدار میجر!''

حوالدار میجر' دو نائیکس کے ساتھ آگے بڑھا جن کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تھیلے تھے۔ اس نے ہر سپاہی کو تین تین کارتوس دیے۔ میں بالکل سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے لیکن ایک آواز وقفے وقفے سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

''نہیں' حوالدار میجر صاحب.....نہیں حوالدار میجر صاحب''

حوالدار میجر ایک ایک سپاہی کے سامنے رک کر آگے بڑھ رہا تھا اور اسی طرح کار مائیکل اسمتھ کی نگاہیں بھی آگے سفر کر رہی تھیں وہ مارے غصے کے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

حوالدار میجر' اب میرے دائیں موجود قدرت علی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے تین کارتوس قدرت علی کے سامنے کر دیے۔ وہ ایک طویل قامت پنجابی مسلمان تھا لیکن اس وقت اس کا پورا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ چند ثانیے وہ خاموش رہا پھر میں نے اس کی سرگوشی سنی۔

''نہیں' حوالدار میجر صاحب!''

کار مائیکل اسمتھ اچانک پھٹ پڑا۔ اس کا پارہ یقینی طور پر ہر انکار کے ساتھ ساتھ چڑھتا جا رہا تھا۔

''اس انکار کا آخر مطلب کیا ہے؟'' وہ حلق کے بل دھاڑا'' کیا تم لوگوں کو اب آرڈر کی تمیز نہیں رہ گئی؟ کیا تم نہیں جانتے کہ حکم عدولی کا کیا مطلب ہے؟''

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ صرف قدرت علی نے بولنے کی کوشش کی۔

''حکم عدولی کا الزام ہمارے لیے گالی ہے' کرنل صاحب!'' وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا یہ غداری سے بھی بڑی گالی ہے' قدرت علی؟'' کرنل اسمتھ دھاڑا لیکن اس بار قدرت علی خاموش ہی رہا۔

حوالدار میجر اب میرے سامنے تھا۔ اس نے وہی تین کارتوس مجھے پیش کیے۔ مجھے علم تھا کہ کرنل اور واٹر فیلڈ کی نگاہیں اس وقت مجھ پر جمی ہوئی ہیں جبکہ دوسرے سپاہیوں کے کان میرے انکار پر لگے ہوں گے۔

لیکن میں نے کارتوس لے لئے.....

میں نے نہایت اطمینان کے ساتھ دو کارتوس اپنی بیلٹ میں اُڑسے اور تیسرے کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیے جن سے ظاہر ہوتا کہ وہ گائے یا سور کی چربی سے آلودہ ہیں۔ میں نے اپنی رائفل سیدھی کی۔ بیرل میں پاؤڈر چھڑکا اور کارتوس لوڈ کر کے دوبارہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اس وقت سردول چلا رہا تھا۔ اس نے بھی کارتوس لینے سے انکار کر دیا تھا۔

''کرنل صاحب! میں نے کبھی حکم عدولی نہیں کی ..... کبھی نمک حرامی نہیں کی ..... لیکن خدا کے لیے مجھے ایسی کسی بات پر مجبور نہ کریں جس سے میرا دھرم خراب ہوتا ہو ..... پلیز.....''

حوالدار میجر چند ثانیے سردوں کے سامنے کھڑا رہا لیکن جب اس نے کارتوس لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے تو وہ آگے بڑھ گیا۔ سردوں اب بھی کرنل سے ملتجیانہ انداز میں مخاطب تھا لیکن اسمتھ اب اگلے سپاہی کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

نتیجہ وہاں بھی وہی نکلا۔

سردوں کے ساتھ کھڑے سپاہی نے بھی کارتوس لینے سے انکار کر دیا تھا۔

کرنل کارمائیکل اسمتھ کا چہرہ مارے غصے کے الٹھبو کا ہو رہا تھا۔ ہر انکار پر اس کے چہرے کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ تھرڈ لائٹ کیولری کے ایک ایک سپاہی کو کچا چبا جائے۔

جیک واٹر فیلڈ کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ چونکہ پریڈ سے پہلے ہی سپاہیوں سے ناکام مذاکرات کر چکا تھا اس لیے اسے پہلے ہی اندازہ تھا کہ کیا ہوگا۔ کرنل اسمتھ کو بھی وہ یہ بات بتا چکا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ شاید وہ سامنے ہوگا تو اس کے رعب اور دبدبے سے سپاہی مرعوب ہو جائیں گے۔

لیکن مجھے علم تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔

انکار کی بھنبھناہٹ بڑھتی گئی اور کرنل کی جھنجھلاہٹ فزوں تر ہوتی چلی گئی۔

بالآخر جب حوالدار اور میجر آخری سپاہی کے پاس پہنچا تو کرنل کی ہمت جواب دے گئی۔''

بس کرو، حوالدار میجر!'' وہ حلق کے بل دھاڑا۔'' مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی یہ کارتوس استعمال کرنے کو تیار نہیں ہوگا.....ان کے سامنے ہر جواز اور دلیل بے کار ہے..... ہم صرف اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں.....''

واٹر فیلڈ نے آگے بڑھ کر کرنل کار مائیکل اسمتھ کے کان میں کچھ کہا۔ میں چونکہ دور کھڑا تھا اس لیے مجھے اس کی آواز تو سنائی نہ دے سکی لیکن جس انداز میں کرنل اسمتھ نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید واٹر فیلڈ نے کرنل کو اپنا رویہ قدرے نرم رکھنے کے لیے کہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

'' حوالدار میجر!'' کرنل اسمتھ نے واٹر فیلڈ کی سرگوشی نظر انداز کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔

''یس سر!'' وہ فوراً اپنے کمانڈنگ آفیسر کی جانب مڑا۔

'' کتنے سپاہیوں نے کارتوس لیے ہیں؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''صرف ایک نے سر!'' حوالدار میجر نے جواب دیا۔'' مکرم علی نے.....''

''او کے.....'' کرنل نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔'' مکرم علی!'' اب اس کا مخاطب براہ راست میں تھا۔'' قطار سے علیحدہ ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور قطار سے نکل کر حوالدار میجر اور اس کے دو نائیکس کے برابر جا کھڑا ہوا جو متوحش نگاہوں سے کبھی اپنے ہم وطن سپاہیوں اور کبھی انگریز افسروں کو دیکھ رہا تھا۔

''واٹر فیلڈ!'' کرنل نے پریڈ ماسٹر کو پکارا

''یس سر!''

'' پریڈ مینوئل کے مطابق کمانڈنگ آفیسر کی حکم عدولی، غداری کے زمرے میں آتی ہے۔'' کرنل اسمتھ کی آواز اُبھری۔'' کیا تم اس سے متفق ہو؟''

''یس سر!'' واٹر فیلڈ نے جواب دیا۔'' لیکن میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے میرے سپاہیوں سے گفتگو کا ایک موقع مزید دیا جائے تاکہ میں انہیں.....''

''غداروں سے اب کوئی بات نہیں ہوگی۔'' کرنل اسمتھ نے گویا فیصلہ سنا دیا۔'' کتنے سپاہیوں نے نئے کارتوس لینے سے انکار کیا ہے، حوالدار میجر؟'' آخری جملہ اس نے حوالدار میجر کو

مخاطب کر کے کہا لیکن اس کا انداز سوالیہ ہی تھا۔

حوالدار میجر نے چند ثانیے قطار میں کھڑے افراد کو گنا اور پھر کرنل کی جانب پلٹا۔ ''پچاسی سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کیا ہے، سر!،،

''او کے!'' کرنل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تمام افراد کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی اپنی رائفلیں نیچے پھینک دیں۔'' کرنل نے اگلا حکم سنایا۔

تھرڈ لائٹ کیولری کے جوانوں نے بلا تامل کرنل کے احکامات کی تعمیل کی اور سب نے اپنی رائفلیں ایک ایک کر کے نیچے پھینک دیں۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ ان کے چہروں پر کھنچاؤ اور تناؤ کی کیفیت ضرور تھی لیکن مجھے کوئی بھی خوف زدہ دکھائی نہ دے رہا تھا حالانکہ میری طرح انہیں بھی علم ہوگا کہ انہیں غیر مسلح کیے جانے کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ کرنل نے حوالدار میجر اور نائیکس کو اشارہ کیا کہ رائفلیں ان کے پاس سے اٹھا کر علیحدہ جگہ ڈھیر کر دی جائیں ان تینوں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی جب کہ میں نے بھی اپنے چند ایک ساتھیوں کے سامنے پڑا اسلحہ اپنے ہاتھوں اٹھایا۔

میرا خیال تھا کہ کرنل کار مائیکل اسمتھ صرف انہیں غیر مسلح کرنے پر ہی اکتفا کرے گا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

''تھرڈ نیٹو کیولری از ڈسمس۔'' کرنل کار مائیکل اسمتھ کی آواز اُبھری۔ ''جیک واٹر فیلڈ..... تم اپنی نگرانی میں تمام سپاہیوں کا یونیفارم اتروا دو گے!''

''سس.....سر.....!'' واٹر فیلڈ محض ہکلا کر رہ گیا۔

''کیا ہماری وفاداریوں کا یہی صلہ ہے کرنل صاحب؟'' قدرت علی اچانک بول اٹھا مگر اس وقت وہ متمنا نہیں رہا تھا بلکہ اس کا لہجہ اس امر کا غماز تھا کہ کرنل کے حکم نے اس کے ذہن کو یکسر تبدیل کر دیا ہے اور اب وہ ہر قسم کی صورتحال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے۔

کئی اور آوازیں بھی قدرت علی کے ساتھ شامل ہو گئیں لیکن کرنل جیسے بہرہ ہو چکا تھا۔

''پوزیشن!'' وہ چلایا اور حوالدار میجر اور دونوں نائیکس نے اپنی رائفلیں اپنے ہی ساتھیوں پر تان لیں۔ ان کے انداز سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اگر کرنل نے انہیں فائر کا حکم بھی دیا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

''واٹر فیلڈ!'' کرنل پھر دھاڑا۔ ''اس وقت گیریژن میں جتنے بھی ہم وطن سپاہی موجود ہیں، انہیں فوری یہاں طلب کرو.....''

اور واٹر فیلڈ، نزدیکی کمرے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔

چند منٹ بعد پچاس کے لگ بھگ برطانوی اور انگریز وفادار فوجی وہاں موجود تھے۔

نیٹو کیولری کے سپاہی ابھی تک کرنل کے احکامات پر احتجاج کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے یونیفارم نہیں اتارے تھے۔ برطانوی اور وفادار مقامی سپاہیوں نے کرنل کے اشارے پر آگے بڑھ کر زبردستی ان کے کپڑے اتار لیے اور اب وہ تمام صرف اپنے زیر جاموں میں وہاں کھڑے رہ گئے تھے۔

یہ ایک شرمناک منظر تھا، لیکن ظاہر ہے کہ میں ذاتی طور پر اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ان سب لوگوں سے ہمدردی تھی لیکن میرے بس میں کچھ نہ تھا۔

ابھی ہڑبونگ جاری تھی کہ کرنل نے مجھے پریڈ گراؤنڈ سے چلے جانے کا حکم سنایا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی کرنل میسن کے بنگلے پر لوٹ آیا۔

شام تک مختلف ذرائع سے مجھے کئی اطلاعات ملیں جو کسی بھی لحاظ سے ہمارے یعنی انگریزوں کے مفاد میں نہیں تھیں لیکن ظاہر ہے کہ میں کسی بھی معاملے میں حرفِ آخر تھا نہ دخیل۔

تھرڈ نیٹو کیولری کے پچاسی جوانوں کو اسی برہنہ حالت میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور کرنل کار مائیکل اسمتھ نے وہیں کھڑے کھڑے انہیں غداری کا مرتکب اور مجرم قرار دے کر ہر ایک کو دس دس سال جبری مشقت کی سزا سنائی تھی۔ تمام جوانوں کو کڑے پہرے میں میرٹھ سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا تھا۔ کرنل نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو یہ احکامات بھی بھجوائے تھے کہ یہ تمام خطرناک قیدی ہیں لہٰذا ان کا پہرہ سخت رکھا جائے۔

شام کے وقت مجھے ایک خوفناک اطلاع ملی جس سے میرا پورا جسم سنسنا اٹھا۔

اگلے روز 10 مئی 1857ء کا دن تھا۔

اور اس دن بنگال آرمی کی گیارہویں اور بیسویں مقامی کیولری کے دستوں نے میرٹھ پہنچنا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان دستوں کی آمد سے میرٹھ میں کوئی نیا ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر آنے والوں نے اپنے گرفتار ساتھیوں سے ہمدردی ظاہر کی یا وہ ان کی گرفتاری پر مشتعل ہو گئے

تو پھر انہیں روکنے والا کوئی نہ ہوتا۔

میرٹھ بے شک ملٹری ہیڈ کوارٹر تھا لیکن مجھے اس امر کی توقع بالکل نہیں تھی کہ برطانوی دستے کسی بھی فوجی ردّ عمل کی صورت میں کس حد تک کارگر اور مؤثر ثابت ہوں گے۔ میں دل ہی دل میں کرنل کارمائیل اسمتھ کو کوستا رہا کیونکہ یہی وہ واحد کام تھا جو میرے اختیار میں تھا۔

میں نے معمول کے مطابق کرنل میسن کے بنگلے پر اپنی خدمات انجام دیں اور الجھے ہوئے ذہن اور بھاری سر کے ساتھ سونے چلا گیا۔

صبح حسبِ معمول تھی اور ابھی تک کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہ ہوا تھا۔ میں اپنے طور پر مطمئن تھا اور دُعا کر رہا تھا کہ دن خیریت سے ہی گزر جائے تو اچھا ہے۔

سورج ذرا بلند ہوا تو مس لیزلی گھڑ سواری کا لباس پہنے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ آج جانے کیوں میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اب اس کے ساتھ میرا کچھ اس قسم کا رشتہ استوار ہو چکا تھا کہ انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

چار و ناچار میں نے بھی لباس تبدیل کیا اور گھوڑا تیار کر کے اس کے ساتھ چل دیا۔ میرا خیال تھا کہ مس لیزی یونہی سیر کے لیے نکلی ہے لیکن جب اس نے اپنا گھوڑا علی گڑھ جانے والے راستے کی جانب موڑا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔

مندر پہنچتے ہی وہ آکاس بیل کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ ذرا سی دیر بعد ہی ہمارے کپڑے دور پڑے ہمارا منہ چڑا رہے تھے جب کہ ہم یک جان دو قالب بنے مندر کی زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میں نے لیزلی کے سرخ و سپید اور نرم و نازک جسم کو بچانے کے لیے نیچے کمبل بچھا رکھا تھا لیکن اس کے اندر کی وحشتیں کچھ اتنی جوان تھیں کہ مجھ سے سنبھلے نہیں سنبھل رہی تھیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے جسم پر جگہ جگہ میرے دانتوں اور ناخنوں کے واضح نشانات بن گئے۔

ہم نے مندر میں کوئی تین گھنٹے گزارے لیکن اس تمام عرصے میں وہ مستقل میرے گلے کا ہار بنی رہی۔ کبھی وہ مجھے نوچتی کھسوٹتی اور کبھی میں اسے کاٹتا اور رگیدتا اس عالم میں گزشتہ روز رونما ہونے والے واقعات بھی ذہن سے محو ہو گئے اور آنے والے خدشات بھی ہواؤں میں بکھر گئے۔

ایسے میں بس میں تھا اور لیزلی کا حسین بدن تھا۔

خدا خدا کر کے جذبات کی شدت کم ہوئی تو ہم بھی انسانیت کے جامے میں واپس آ گئے۔

لیزلی کا موڈ تھا کہ رنگین و سنگین لمحات کچھ اور طویل ہو جائیں لیکن میں اب اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے بہ مشکل تمام میں نے اسے اس کے قدموں پر کھڑا کیا اور باقاعدہ بانہوں میں بھر کر گھوڑے پر لا بٹھایا۔

لیزلی نے میرے رخسار پر بوسہ دے کر شاید میری محنتوں کا ثمر دیا اور آہستگی سے گھوڑا آگے بڑھا دیا جب کہ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

یہ کھیل ہمارے لیے نیا نہیں تھا لیکن آج لیزلی کچھ اس طرح ٹوٹ کر برسی تھی کہ میں واپس آتے ہوئے بھی اس کے بدن کے نشیب و فراز میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ سفر کٹنے کا پتہ ہی نہ چلا۔

ابھی ہم میرٹھ سے کوئی ایک میل دور ہی تھے کہ میں مسز لیزلی کی چیخ نما آواز سن کر چونکا۔ وہ اپنے گھوڑے کی رکابوں پر پیر رکھ کر اپنی زین سے کسی قدر اٹھی ہوئی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے سامنے دیکھا لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ''آوازیں سنو'' مسز لیزلی جز بز ہو کر بولی تو میں نے کان ادھر لگا دیے۔

آوازیں جس قسم کی بھی تھیں معمول سے ہٹ کر تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے طوفانی لہریں دور کہیں ساحلی چٹانوں سے ٹکرا رہی ہوں۔ میں توجہ سے سننے کے باوجود کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ چنانچہ ہم تیزی سے آگے بڑھے تاکہ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر دیکھ سکیں کہ کیا ہو رہا ہے؟

تھوڑی دیر بعد میرٹھ شہر ہمارے سامنے تھا۔ بالکل سیدھ میں مال کے آخری سرے پر انگریز افسروں کے بنگلے دکھائی دے رہے تھے۔ دور بائیں جانب جیل کا خاکہ نظر آ رہا تھا اور اس کے بعد میرٹھ شہر تھا۔

.....اور پھر جیل کی پرلی طرف ..... جہاں مقامی کیولری اور انفنٹری لائنز واقع تھیں، مجھے سرخ ہوتے ہوئے آسمان کے پیش منظر میں دھوئیں کے سیاہ بادل دکھائی دیے۔

عمارتیں جل رہی تھیں، ہزاروں لوگ چیخ رہے تھے۔ جن کی بلند آوازیں، فاصلے کی وجہ سے بھنبھناہٹوں کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ (10)

میں نے بڑھتے ہوئے گھوڑے کو روک دیا اور ساکت بیٹھ کر دھوئیں کے ان بادلوں کو دیکھنے

لگا۔ مسز لیزلی میری آستین کو کھینچ کھینچ کر پوچھ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے؟

میں اسے کچھ بتا نہیں سکتا تھا کیونکہ خود مجھے بھی کسی بات کا علم نہیں تھا۔ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو دھوئیں کے ان بادلوں کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں نہیں بتا سکتا تھا کہ مئی کی اس گرم اور پرسکون شام میں ہندوستان کی عظیم ترین بغاوت کا آغاز ہو گیا ہے۔

میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے چنانچہ اپنے اور مسز لیزلی کے گھوڑوں کو شمال کی جانب دوڑا دیا تاکہ ایک میل کے فاصلے پر موجود برٹش انفنٹری لائنز تک پہنچ سکوں۔

لیکن میری پہلی سوچ یہی تھی کہ کاک کے اندیشے درست تھے۔ مقامی فوجیوں نے اپنے ساتھیوں کو رہا کرانے کے لیے جیل پر حملہ کیا ہوگا لیکن ہیوٹ نے فوری طور پر برطانوی فوجی دستے وہاں بھیج دیے ہوں گے یا ممکن ہے وہ پہلے سے وہاں موجود ہوں اور انہوں نے باغیوں کو فی الفور گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا ہوگا۔

میرے اندازے درست تھے یا غلط' لیکن میں اپنے ساتھ مسز لیزلی کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا چنانچہ میں اُس کی طرف مڑا۔

''میم صاحب!'' میں نے مقامیوں کے سے انداز میں ہی اسے مخاطب کیا ''سیدھی اپنے بنگلے کی طرف نکل جاؤ اور راستے میں بہت زیادہ محتاط رہنا۔''

اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے اُس کے گھوڑے کی پسلیوں میں ضرب لگائی اور وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ مسز لیزلی نے آواز دے کر مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں اپنا گھوڑا موڑ چکا تھا۔

میں جیل کے قریب پہنچ کر ساری کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے نیچے ایک بہترین گھوڑا تھا اور مجھے یقین تھا کہ خطرے کی صورت میں وہ فوری طور پر مجھے محفوظ مقام کی طرف لے جائے گا۔ میں ایک پشتے کی آڑ میں چلنے لگا اور مقامی بازار کی طرف سے ہوتا ہوا جیل کی طرف بڑھا تاکہ کسی قدر فاصلے سے جیل کے اردگرد ہونے والی کارروائی دیکھ سکوں۔

شروع میں تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ بازار کی یہ سمت قطعی طور پر خالی تھی لیکن

اندھیرے میں آنے والی آوازوں سے میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ جیل اور گرانڈ ٹرنک روڈ کے درمیانی علاقے میں کیا ہو رہا ہے۔ چیخ و پکار، بھاگتے قدموں کی آہٹوں اور لکڑیوں کے ٹوٹنے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

میں بازار میں گھس گیا۔ میرے آگے شور ہی شور تھا۔ اب سامنے کے حصے میں پورا آسمان نارنجی رنگ کا ہو رہا تھا۔ خاصی بڑی جگہ پر آگ لگی ہوئی تھی جس کا دھواں آسمان کو سیاہ کر رہا تھا۔ میں محتاط انداز میں آگے بڑھتا رہا۔ دکانیں ویران ہوتی جا رہی تھیں۔ مدھم روشنی میں دکاندار مجھے اپنا سامان سمیٹتے دکھائی دیے۔ بہت سے لوگ گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور آہ و بکار کر رہے تھے۔

ایک موٹا سا شخص اپنی دکان کے آگے گھبرائے ہوئے انداز میں کھڑا تھا۔ میں نے اُس سے صورتِ حال کے بارے میں پوچھا لیکن وہ جواب دینے کے بجائے واپس دکان میں گھس گیا۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ ایک بچہ اچانک میرے گھوڑے کے پیروں کے درمیان آ گیا۔ اُس کی ماں چیختی چلاتی، بچے کے تعاقب میں تھی۔ میں اگر فوراً ہی راسیں نہ کھینچ لیتا تو بچے کا سموں تلے آ کر کچلے جانا لازمی تھا۔

بچہ بال بال بچ گیا اور اس کی ماں اسے سینے سے لپٹائے دوڑتے بھاگتے ہجوم میں گم ہو گئی۔ شور شرابے کی آوازیں اب زیادہ ہو گئی تھیں۔ پھر مجھے گولی چلنے کی آواز سنائی دی جس کے بعد پے در پے فائر ہونے لگے۔

میں نے فوراً فیصلہ کیا کہ محفوظ فاصلے پر رہنے کا وقت آ گیا ہے، چنانچہ گھوڑے کو ایک بغلی گلی میں موڑ لیا۔ ایک بار پھر کوئی شخص میرے گھوڑے سے ٹکرایا۔ میں نے راسیں کھینچیں لیکن وہ گھوڑے کی ٹانگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔

اُس کے بھاگنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ تب میں نے اُس کے کپڑوں کو پہچان لیا۔ وہ ڈریگون گارڈز کی یونیفارم پہنے ہوئے تھا لیکن سر اور پیروں سے ننگا تھا۔ ایک بپھرا ہوا مجمع وحشیوں کی مانند اُس کے تعاقب میں تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مشروبات کی ایک دکان کے سامنے زمین پر گرا۔ ہجوم نے دکان پر ہلہ بول دیا اور بوتلیں اٹھا لیں۔ کئی لوگوں نے بوتلوں کے اگلے حصے توڑے اور گرے ہوئے

انگریز پر پل پڑے۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ چلا رہے تھے اور ڈریگون گارڈ کے جسم میں ٹوٹی ہوئی بوتلیں گھونپ رہے تھے انگریز چلا رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ اُس کی چیخوں میں کمی آتی جا رہی تھی اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ یقینی طور پر اُس کا کام تمام ہو گیا تھا۔ (11)

میں گھوڑے سمیت اپنی جگہ پر ساکت تھا۔ مشتعل ہجوم نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ بعض منچلوں نے مردہ انگریز کے جسم سے رسی باندھی اور اُسے گھسیٹتے ہوئے آگے لے چلے۔ یہ دردناک منظر مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ یا شاید اپنی پیاری زندگی بچانے کی خواہش تھی کہ گھوڑے کی باگیں فوراً موڑ لیں۔

میں اندھا دھند گھوڑے کو بھگانے لگا۔ شروع میں تو مجھے سمت کا پتا ہی نہ چلا لیکن پھر اندازہ ہوا کہ میں میرٹھ شہر سے گرانڈ ٹرنک روڈ کی طرف جانے والے شمالی راستے پر رواں دواں ہوں۔ اُس وقت یہی مناسب تھا۔

چند سو گز آگے جانے کے بعد مجھے ایک اور بہت بڑا ہجوم دکھائی دیا۔ جو نعرے لگاتا اور شور مچاتا برٹش ٹاؤن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُن میں نصف سے زیادہ مقامی سپاہی تھے۔ بعض نے صرف جیکٹیں پہن رکھی تھیں لیکن کچھ مکمل یونیفارم میں تھے۔ وہ سنگینیں لہراتے ہوئے دوڑ رہے تھے اور انگریزوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ وہ ہندوستان کی سرزمین سے انگریز کا نام و نشان مٹانے کا عزم کیے ہوئے تھے۔

سڑک کی پرلی جانب مقامی کیولری بیرکس مکمل طور پر شعلوں میں گھری ہوئی تھیں۔ میرے عقب میں بھی اب آگ بھڑکنی شروع ہو گئی تھی۔ بازار کی کچھ اور دکانیں نذر آتش کر دی گئی تھیں۔ میری نظروں کے سامنے ایک دکان پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی گئی اور پھر دکان کے مالک کو بھی جلتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیا گیا۔ آگ سے چند ثانیوں تک چیخوں کی آواز ابھری لیکن پھر خاموشی چھا گئی۔ البتہ پوری فضا میں گوشت جلنے کی بو پھیل گئی تھی۔

ایک لحاظ سے میں محفوظ تھا۔ میرا حلیہ مقامیوں جیسا تھا اس لیے مجھے یقین تھا کہ مقامی ہجوم مجھے کچھ نہیں کہے گا لیکن دوسری طرف یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر انگریز دوستوں نے مجھے اس علاقے میں دیکھ لیا تو باغیوں کا ساتھی سمجھ کر فوری طور پر گولی سے اڑا دیں گے اور کم از کم میں اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں مارا جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے شمال کی سمت اپنا سفر جاری رکھا۔ کچھ فاصلے پر

باغی ہجوم بھی اسی طرح بڑھ رہا تھا۔

جب جیل کے برابر پہنچا تو میں نے وہاں بھی ایک بہت بڑا ہجوم دیکھا۔ اُن میں زیادہ تعداد جیل کے قیدیوں کی تھی وہ جیل کے لباس میں ملبوس تھا لیکن اُن کے ٹخنے بیڑیوں سے آزاد تھے فاصلے کے باوجود میں نے گوبند اور ایک دو دوسرے ساتھیوں کو پہچان لیا۔ ایک سپاہی جسے میں نہیں جانتا تھا' بیل گاڑی پر کھڑا نعرے لگا رہا تھا اور ہجوم کو اکسا رہا تھا۔ مجھے اس کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''یہ ہو چکا ہے دوستو! .....وقت نے فیصلہ لکھ دیا ہے۔ گوروں کی موت آ پہنچی ہے ..... صاحب لوگوں نے پہلے ہی بھاگنا شروع کر دیا ہے .....ٹوٹی زنجیروں کو دیکھو ..... یہ ہماری آزادی کا ثبوت ہیں..... بھائیو! آگے بڑھو اور گوروں پر ٹوٹ پڑو۔ ایک ایک کو قتل کر دو..... کسی کو بچ کر نہ جانے دو.....''

سارا ہجوم بیک آواز چیخ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا نعرے لگاتا رہا اور پھر مال کی طرف بڑھنے لگا _____ مائی گاڈ! میں پہلے ہی مشرقی سمت سے شعلے اُٹھتے دیکھ رہا تھا۔ یقینی طور پر نالے کے پار مال کے آخری سرے پر کچھ بنگلے جل رہے تھے۔

اب میرے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ عقب میں میرٹھ شہر اور بازار تھا جو بلوائیوں کے ہاتھوں لوٹا جا رہا تھا اور تباہ ہو رہا تھا۔ بائیں جانب جلتی ہوئی مقامی بیرکس تھیں۔ سامنے' میرے اور برٹش ٹاؤن کے درمیان کی سڑک ہزاروں مقامیوں سے اٹی پڑی تھی۔ میں ذرا دیر انتظار کرتا رہا تا کہ ہجوم کچھ آگے بڑھ جائے جس کے بعد دائیں جانب مڑ کر جیل کے شمال میں نالے کی جانب بڑھا۔ میں مشرقی پل پار کرتا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر مال کے ذریعے برٹش کیمپ لائنز میں داخل ہو جاتا۔

سفر کا پہلا حصہ نسبتاً آسان تھا۔ میں نے نالہ پار کیا اور احتیاط سے گھوڑا دوڑاتا برٹش ٹاؤن کے مشرق کی جانب بڑھا۔ چاند ابھی نکلا نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے خاصی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں نسبتاً سکون تھا۔ ہنگامہ میری بائیں جانب قدرے فاصلے پر ہو رہا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اکا دکا مقامی لوگ جھاڑیوں میں چھپتے دکھائی دیے۔ ذرا سا آگے بڑھا تو اندازہ ہوا کہ بلوائی یہاں تک بھی پہنچ چکے ہیں کیونکہ مجھے ایک چوکیدار کی لاش دکھائی دی تھی۔ میں اسے دیکھ کر

حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ وہ مقامی تھا اور ظاہر ہے اپنے ہی ہم وطنوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ شاید وہ گھن تھا جو بلاوجہ ہی گندم کے ساتھ پس گیا تھا۔

میں سرسری نگاہوں سے لاش کو دیکھتا درختوں کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔ جہاں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ ابھی میں جھنڈ سے ذرا فاصلے پر ہی تھا کہ کسی کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز مجھ تک پہنچی۔

''میری مدد کرو..... خدا کے لیے میری مدد کرو.....''

آواز میری دائیں جانب سے آئی تھی۔ میں نے ادھر دیکھا سفید گیٹ والا ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ میں گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ اسی وقت ایک اور آواز سنائی دی۔

''شٹ اپ ٹومی! خدا بہتر جانتا ہے وہ کون ہے؟'' یقینی طور پر بنگلے کے مکینوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

''لیکن میری ماری جا چکی ہے۔'' پہلی آواز دوبارہ آئی ''میں نے خود دیکھا ہے۔ وہ لوگ.....''

وہ انگریز تھے۔ میں بلا سوچے سمجھے گھوڑے سے اترا اور گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا ''میں ایک دوست ہوں'' مزید آگے بڑھنے سے پہلے میں نے چلا کر کہا۔ ''تم لوگ کون ہو؟''

''اوہ! تھینک گاڈ!'' پہلی آواز نے کہا ''جلدی کرو! ان لوگوں نے میری کو مار ڈالا ہے .....میری!''

میں نے پلٹ کر دیکھا درختوں میں اب کئی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یقینی طور پر وہ باغی تھے میں اُن کے یہاں آنے سے پہلے بنگلے کے مکینوں کو بچا سکتا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیاں طے کیں اور کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ ایک بچہ زمین پر پڑا تھا۔ کمرے کی حالت ابتر تھی۔ کمرے میں مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک سفید فام زخمی ٹانگ لیے پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا اور وہ مجھے کینہ توز نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

''کیا تم.....'' اس نے جملہ شروع کیا لیکن پھر اُس نے میری وردی کو پہچان لیا اور بری طرح چیخا ''اوہ! یہ تو باغی ہے تھرڈ کیولری.....جسم!''

میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا کہ اچانک ہی کسی سمت سے کوئی مجھ پر آ رہا۔ اس کے ہاتھوں میں چمکتا ہوا خنجر مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''بے وقوف میں انگریز ہوں'' میں نے چیخ کر کہا لیکن حملہ آور پاگل ہو چکا تھا۔ میں اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا جب کہ اُس کی کوشش تھی کہ کسی طرح مجھے موت کے گھاٹ اتار دے۔

''اسے مار ڈالو جم!'' دیوار کے ساتھ گرا ہوا بوڑھا چلایا اور جم نامی سفید فام پر جیسے جنون طاری ہو گیا۔ ہم دونوں زمین پر گر پڑے وہ میرے اوپر تھا۔ میری کوشش تھی کہ اُس کا خنجر میرے حلق سے دور رہے لیکن اُس کا ہاتھ بدستور میرے زخرے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی..... میں نے آخری بار طاقت لگائی لیکن بے سود..... خنجر کچھ اور قریب ہو گیا تھا۔

تھک ہار کر میں نے آنکھیں بند کر لیں لیکن اُسی وقت کمرہ بہت سے قدموں کی آہٹوں سے گونج اٹھا۔ یقیناً باغی آ پہنچے تھے۔ وہ جم اور بوڑھے پر پل پڑے۔ ان کی وردیوں سے اندازہ ہوا کہ ان کا تعلق گیارہویں رجمنٹ سے تھا۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھے جب کہ میں چپکے سے باہر نکل آیا۔ میرے رخسار پر زخم آیا تھا جس سے تیزی کے ساتھ خون رس رہا تھا۔ باغی جم اور بوڑھے کو قتل کرنے کے بعد گھر کو آگ لگا رہے تھے جب کہ میں خود کو جھاڑیوں میں چھپائے تماشہ دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو میں حملہ آور کو پہچان نہ سکا تھا لیکن اب اندازہ ہوا کہ جم لوئیس ہوگا۔ دو ایک راتیں پہلے ہی میسن کے بنگلے پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اب وہ اور اس کی بیوی مارے جا چکے تھے۔

میں جھاڑیوں میں دبکا صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ یہ یقینی طور پر بغاوت تھی۔ بہت بڑے پیمانے کی بغاوت۔ تھرڈ کیولری باہر آ چکی تھی۔ بیسویں انفنٹری کے سپاہیوں کو میں نے گرانڈ ٹرنک روڈ پر دیکھا تھا جب کہ گیارہویں رجمنٹ کے جوان جم کے بنگلے پر حملہ آور ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پورے میرٹھ گیریژن نے بغاوت کر دی تھی۔

لیکن دونوں برطانوی رجمنٹیں کہاں تھیں؟ جہاں میں لیٹا ہوا تھا وہاں سے برطانوی لائنز نصف میل کے فاصلے پر بھی نہیں تھیں۔ بغاوت شروع ہوئے دو تین گھنٹے ہو چکے تھے لیکن اب تک

حکام کی طرف سے کسی کارروائی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ فائرنگ بدستور ہو رہی تھی لیکن برطانوی لائنوں کی طرف خاموشی تھی۔ مختلف جگہوں پر آگ بھی بھڑک رہی تھی لیکن کہیں سے ہیوی گن فائر کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ (12) ہیوٹ اور اسمتھ اب تک بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟

میں کافی دیر جھاڑیوں میں پڑا رہا بالآخر میں نے مال کی دوسری جانب برطانوی لائنوں کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا اس طرح میں میک ڈوول کے بنگلے کے قریب سے ہوتا ہوا ڈوف میسن کے بنگلے پر پہنچ سکتا تھا۔ میں اٹھ کر درختوں کی آڑ لیتا ہوا مال کے مشرقی حصے کی طرف بڑھا۔

درختوں سے نکل کر جونہی میں آگے آیا سو گز کے فاصلے پر ایک بنگلہ آگ کے شعلوں میں لپٹا دکھائی دیا۔ نصف درجن کے قریب سپاہی قریب کھڑے جلتے ہوئے بنگلے کا نظارہ کر رہے تھے۔ وہ بے حد خوش تھے اور اکا دکا فائر بھی کر رہے تھے۔ آگ میں گھرے ہوئے بنگلے سے چیخ و پکار کی آوازیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سر جن ڈاؤسن (13) کا بنگلہ تھا۔ میں بنگلے اور وہاں کھڑے ہوئے سپاہیوں سے بچ کر آگے نکلا چلا گیا۔

ہمارا بنگلہ محفوظ تھا لیکن میں جونہی آگے بڑھا مجھے برآمدے میں کوئی سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ میں پہلے تو جھجکا لیکن پھر گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ برآمدے میں ایک شخص لیٹا ہوا تھا۔ وہ ایک مقامی ملازم تھا جس کے سینے میں دستے تک خنجر پیوست تھا۔ میں قریب ہوا تو اُس کے جسم نے حرکت کی۔ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مکان کی طرف اشارہ کیا لیکن کچھ بتانے سے پہلے ہی اُس کی گردن ڈھلک گئی۔

میرے ذہن میں وہ سایہ در آیا لیکن اب وہاں کوئی نہ تھا۔ میں کمرے کی طرف بڑھا۔ اُس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اندر بعض خوفناک مناظر میرے منتظر ہوں گے۔ سب سے پہلے میں نے مسز کورٹنی کو دیکھا وہ کرسی پر مردہ حالت میں پڑی تھی۔ اس کا سر ڈھلکا ہوا تھا اور جسم میں گولیاں پیوست تھیں۔ اس کے تینوں بچے بھی اِدھر اُدھر کٹے پھٹے پڑے تھے۔ وہ ہمارے سامنے والے بنگلے کی مکین تھی۔ شاید یہاں ملنے آئی تھی اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

میں ڈوف میسن کے کمرے کی طرف چلا۔ میرے ذہن میں میسن کا ریوالور تھا جو اس کی دراز میں رہتا تھا۔ میں نہتا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ ریوالور قبضے میں کر لوں۔ میں نے ہال کا دروازہ کھولا

اور وہیں ساکت ہو گیا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو یقینی طور پر گر کر بے ہوش ہو گیا ہوتا۔

مسز لیزلی کا کٹا ہوا سر ہال کے وسط میں ایک میز پر رکھا تھا جب کہ اس کا بدن چند فٹ کے فاصلے پر زخموں سے چور زمین پر بکھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ یہ جسم چند گھنٹے پہلے میرے بازوؤں کے حلقے میں تھا لیکن اب ہر قسم کے پیار محبت سے آزاد ہو چکا تھا۔

ہال اور ڈرائنگ روم کے درمیانی دروازے پر مسز کیپٹن میک ڈوول کی لاش میری منتظر تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑی تھی کیونکہ تلوار اس کا بدن چیرتی ہوئی دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔ میں کئی منٹ وہاں افسردہ سا کھڑا رہا۔ یہ وہ عورتیں تھیں جن کے ساتھ میں نے کچھ دن بہت آرام سے گزارے تھے لیکن اب وہ ایسی جگہ چلی گئی تھیں جہاں سے لوٹ کر آنے کا تصور ہی نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن بلنچ کہیں دکھائی نہیں دی۔ شاید وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اگر باہر قریب ہی سے کہیں فائرنگ کی آوازیں سنائی نہ دیتیں تو میں جانے کتنی دیر وہاں بے حس و حرکت کھڑا رہتا لیکن جب گولیاں چلیں تو میں نے فوری طور پر میسن کے ریوالور پر لعنت بھیجی اور بنگلے سے باہر نکل آیا۔ مجھے افسوس تھا کہ میں ان عورتوں خاص طور پر مسز لیزلی کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ لیکن میں کرتا بھی کیا۔ مجھے خود اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

برٹش ٹاؤن گولیوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ معلوم نہیں انگریزوں میں کتنے زندہ بچے تھے اور کتنے مارے گئے تھے۔ کتنے بنگلے نذرِ آتش کر دیے گئے تھے اور کتنوں کے مکین موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ میں نے بنگلے کے سامنے کھڑے ہو کر مغرب کی سمت نگاہ دوڑائی۔ جلتی ہوئی عمارتوں، ہجوم کے شور اور مرنے والوں کی کربناک چیخوں کے سوا کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔

ایک بار پھر میرے ذہن میں ہیوٹ اور استھ کا خیال آیا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کچھ کرنے کے لیے زندہ ہی نہ رہے ہوں۔ میں چند لمحے کھڑا صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ برٹش لائنز کی طرف جانا جان بوجھ کر موت کے منہ میں کودنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے فوری طور پر میرٹھ چھوڑ دینا چاہیے۔

میں گھوڑے پر سوار ہو کر مال پر آ گیا اور اُس کا رخ مشرق کی جانب کر دیا۔ بہت جلد موت

کی آوازیں، شعلوں کی زبانیں اور چیخ و پکار مجھ سے دور ہو گئی۔

◈◈◈

خدا جانتا ہے کہ اُس رات میں نے کتنا سفر طے کیا۔ یہ کوئی اتنا زیادہ فاصلہ نہ تھا لیکن میں قدرے محفوظ ہو گیا تھا۔ موت کا خوف تو جاتا رہا تھا لیکن میرے رخسار کا زخم اب مجھے بے حد پریشان کرنے لگا تھا۔ اس کے باوجود میں نے سفر جاری رکھا تھا۔

میں پہلے مشرق کی طرف بڑھا تا کہ میرٹھ شہر سے دور نکل جاؤں، پھر میں نے گھوڑے کو ایک لمبا چکر دیا اور اس کا رخ مغرب کی طرف کر دیا۔ میری منزل دہلی تھی جہاں برطانوی فوجوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ میرٹھ اور دہلی کے درمیان ٹیلی گراف لائنیں بھی تھیں اس لیے مجھے یہ خیال بھی تھا کہ دہلی والوں کو میرٹھ کے سانحے کی خبر ہو گئی ہو گی اور ممکن ہے وہاں سے آنے والی برطانوی رجمنٹ سے راستے میں میری مڈ بھیڑ ہو جائے لیکن یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اُس بے وقوف کے بچے ہیوٹ نے میرٹھ کے واقعے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

برطانوی رجمنٹیں تو مجھے کہیں نہ ملیں البتہ مقامی سپاہیوں کی دو کمپنیاں ضرور نظر آئیں۔ پہلے میں سمجھا کہ وہ دہلی سے آنے والے امدادی دستے ہیں لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ پیدل دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب میں قریب پہنچا تو انہوں نے تھرڈ کیولری کے ایک مقامی سوار کی حیثیت سے میرا خیر مقدم کیا اور مجھے مشروب پیش کیا۔

''تم آج رات اپنی پلٹن کو نہیں پکڑ سکو گے، میرے بھائی!'' ان کے حوالدار نے مجھے بتایا۔ اس سے پہلے کہ میں حیران ہو کر کوئی سوال پوچھتا وہ خود ہی بول اُٹھا۔ ''اس وقت تک تو وہ دہلی کا نصف فاصلہ طے کر چکے ہوں گے۔''

''کیا مطلب؟'' اس کی بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''ہم لوگ دراصل لوٹ مار میں مصروف ہو گئے تھے۔'' ایک دوسرا سپاہی بولا۔ ''لیکن وہ لوگ پہلے ہی گھوڑوں پر سوار ہو کر دہلی روانہ ہو گئے۔'' اُس نے جملہ مکمل کر کے زوردار قہقہہ بھی لگایا تھا۔

''اوہ!'' میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب دہلی بھی محفوظ نہیں ''تو

کیا دہلی پر اُن کا قبضہ ہو گیا ہے؟'' میری مراد باغیوں سے تھی۔

''ابھی نہیں۔'' حوالدار نے نفی میں سر ہلایا ''لیکن ہمیں یقین ہے دہلی میں مقیم تین رجمنٹیں بغاوت کر چکی ہوں گی جب کہ پورا میرٹھ گیریژن اُن کی مدد کے لیے آ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم مل کر ایک ہی دن میں صاحب لوگوں کا صفایا کر دیں گے۔''

''یہ تو صرف آغاز ہو گا'' ایک اور سپاہی بولا۔ ''دہلی کے بعد آگرہ' پھر کان پور' جے پور اور آخر میں کلکتہ کی باری بھی آئے گی۔ مدارس آرمی بھی حرکت میں آ چکی ہے۔ تم دیکھ لینا کہ گرانڈ ٹرنک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک صاحب لوگوں کو یوں ان کے مکانوں میں قید کر دیا جائے گا جیسے چوہوں کو اُن کے بلوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔''

انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں اُن کے ساتھ موت کے کنویں میں چھلانگ لگانے کے لیے قطعی تیار نہ تھا' چنانچہ رخصت لے کر گھوڑے پر سوار ہوا اور اُسے سرپٹ دوڑا دیا۔

اب میں دہلی بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ حوالدار نے جو کچھ بتایا تھا اُس کی روشنی میں وہ بھی مخدوش ہو گیا تھا۔ میرے پاس اب کوئی ٹھکانا نہیں تھا جہاں پناہ حاصل کرتا۔ سوچ سوچ کر میں نے کسی غیر معروف سے گاؤں میں کچھ دن قیام کا فیصلہ کیا۔ میرے رخسار کا زخم اب مزید تنگ کرنے لگا تھا اس لیے میں یہ بھی چاہتا تھا کہ کہیں رک کر اس کا علاج بھی کر لوں' چنانچہ میں نے ذرا سا رخ بدلا اور مرکزی شاہراہ سے ہٹ کر ایک ایسے گاؤں میں جا پہنچا جس کی آبادی چند سو نفوس سے زیادہ نہیں تھی۔

گاؤں کے لوگ سیاست سے دور تھے لیکن بغاوت کی افواہیں وہاں بھی پہنچ چکی تھیں۔ مقامی سپاہیوں کی وردی کو بھی وہ پہچانتے تھے چنانچہ انہوں نے ایک زخمی مقامی سپاہی کو پناہ دینے میں کسی لیت و لعل سے کام نہیں لیا۔

میں وہاں تین ہفتے رہا۔ رخسار کے زخم نے ناسور کی شکل اختیار کر لی اور بخار نے بھی آ لیا جس کی وجہ سے میں چارپائی سے لگ کر رہ گیا۔

اس عرصے میں ایک ریٹائرڈ فرد کے ذریعے جو حال ہی میں دہلی سے آیا تھا بڑی خوفناک

خبریں مجھ تک پہنچیں۔ اُس نے بتایا کہ دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہاں انگریزوں اور اُن کے حواریوں کا زبردست قتل عام ہوا ہے۔ مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے اور اب وہ بلا شرکت غیرے ہندوستان کا مالک ہے۔

میرٹھ، بریلی، علی گڑھ، اتاوہ اور مین پوری میں بھی کم و بیش یہی صورت حال تھی۔ آگرہ، کانپور اور لکھنؤ میں صاحبوں اور باغیوں کے درمیان جنگ جاری ہے لیکن امکان ہے کہ مقامی جیت جائیں گے کیونکہ دو ایک دن پہلے ہی دو مقامی رجمنٹیں بھاری نفری کے ساتھ آگرہ گئی ہیں۔ بمبئی میں بھی بغاوت ہو گئی ہے۔ شمال سے افغان فوجیں ہندوستان میں داخل ہو گئی ہیں۔ عظیم مسلم جہاد کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ جس کے بعد گوروں کو کم از کم ہندوستان میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

اگر یہ خبریں درست تھیں تب ہندوستان سے انگریز کی حکمرانی عملاً ختم ہو چکی تھی۔ صرف کلکتہ کو لے کر پورے ملک پر حکومت محض خواب کے سوا کچھ نہ ہوتا اگر ان خبروں میں سو فیصد صداقت نہیں تھی تب بھی میرے اندازے کے مطابق صورتِ حال اطمینان بخش نہیں تھی چنانچہ میں نے نئے سرے سے اپنا لائحہ عمل ترتیب دینا شروع کر دیا۔

ایک مقامی کی حیثیت سے میرا بہروپ بڑا شاندار تھا لیکن میں ہمیشہ تو اس حلیے میں مارا مارا نہیں پھر سکتا تھا۔ مجھے ہر حال میں کوئی برطانوی گیریژن تلاش کرنا تھا جو بڑا اور محفوظ ہوتا۔ کانپور؟ نہیں بلکہ پوری وادی، جمنا شلعوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دہلی اور آگرہ بھی خارج از امکان تھے _____ جنوب؟ گوالیار؟ جھانسی؟ اندور؟

جونہی جھانسی کا نام ذہن میں آیا، زبان نے بھی جھانسی جھانسی کا ورد شروع کر دیا۔ میں نے کچھ دیر وہاں کے حالات کے بارے میں سوچا اور پھر اللہ کا نام لے کر اس شہر کی جانب چل دیا جس سے میری بعض رنگین اور سنگین یادیں وابستہ تھیں۔

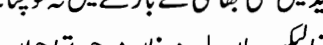

عام حالات میں شاید میں کبھی جھانسی کے بارے میں نہ سوچتا۔ یہاں سے اُس شہر کا فاصلہ اڑھائی سو میل سے زائد تھا لیکن وہاں یلدرم خان موجود تھا جو ان حالات میں یقینی طور پر میرا دوست ہی ثابت ہوتا۔ مجھے امید تھی کہ اپنے قول کے مطابق وہ بل ٹمپل میں میری واپسی کا منتظر

ہوگا۔ اگر وہ خود نہ ہو تو اُس کا کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔

جھانسی یوں بھی محفوظ ہوگا۔ میں نے اُس کی حکمران کے ساتھ کئی ہفتے نہایت معقول حالات میں گزارے تھے۔ وہ ایک پیاری اور حیرت انگیز لڑکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس نے اپنی ریاست کو محفوظ رکھا ہوگا۔

البتہ ذہن کے کسی خانے میں یہ خوف بھی جاگزیں تھا کہ بغاوت کے شعلے اگر وہاں بھی بھڑک رہے ہوئے تو کیا ہوگا؟ اور سفر کے دوران میرے بدترین اندیشوں کی تصدیق بھی ہوگئی۔ کئی جگہ مجھے تباہی و بربادی نظر آئی۔ ایک بار تو میں باغیوں کی پوری رجمنٹ کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچا لیکن میں نے سفر موقوف نہیں کیا اور بدستور آگے بڑھتا رہا' البتہ کوشش یہ کی کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے قریب سے بھی نہ گزروں۔

بالآخر میں جھانسی شہر کے سامنے واقع پہاڑی سلسلے میں پہنچ گیا۔ پہلے میں نے ارادہ کیا کہ یلدرم سے پہلے میں برطانوی فوجی چھاؤنی چلا جاؤں لیکن پھر میں نے بل ٹمپل جانے کا فیصلہ ہی کیا جو' جوکن باغ کے قریب واقع تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر سورج غروب ہونے تک یلدرم یا یلدرم کا کوئی ساتھی مندر نہ پہنچا تو میں خود چھاؤنی پہنچ جاؤں گا اور حالات بہتر ہونے کی صورت میں اسکین سے مل لوں گا۔

میں مندر جا پہنچا۔ وہاں حالات پرسکون تھے لیکن یلدرم اور اس کا کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ میں نے گھوڑا ایک طرف کھڑا کیا اور خود وقت گزاری کے لیے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے درخت کے عقب میں واقع جھنڈ میں آہٹ محسوس ہوئی تو میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے وہ کولٹ نکال کر ہاتھ میں لے لیا جو راستے میں ایک مردہ سپاہی کے ہولسٹر سے نکالا تھا۔

''کون ہے؟'' میں نے کولٹ جھنڈ کی طرف سیدھا کر کے بلند آواز میں کہا۔

جواب میں ایک شخص دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے ہوئے میرے سامنے آ گیا وہ پٹھان تھا۔ میں نے اسے پہچانتے میں قطعی تاخیر نہیں کی وہ رفیق تموار تھا جس کا لباس اور گھوڑا لے کر میں جھانسی سے فرار ہوا تھا۔

''فلیش مین' حضور!'' اُس نے بھی کسی دقت کے بغیر مجھے پہچان لیا تھا'' یلدرم کا کہنا تھا کہ

آپ ضرور آئیں گے۔''

اُس نے مزید کوئی لفظ کہے بغیر ذرا فاصلے پر موجود ایک مندر کے کھنڈرات کی طرف منہ کر کے حلق سے الو کی آواز نکالی جس کا فوراً جواب ملا۔ رفیق نے اطمینان سے سر ہلایا اور مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

''یلدرم وہاں موجود ہے'' اس نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے مزید کچھ پوچھتا وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا۔

کچھ دور مندر کا ٹوٹا دروازہ تھا جس میں ایک شخص کھڑا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے جثے سے ہی پہچان گیا کہ وہی یلدرم ہے۔ میں جونہی اس کے قریب پہنچا اُس نے جھپٹ کر مجھے گلے لگا لیا۔ وہ مجھے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا جیسے اُسے میرے صحیح سالم آنے کی امید نہ تھی۔

''ہم نے میرٹھ کے بارے میں سنا تھا' فلیش مین'' وہ مجھے اندر لے جاتے ہوئے بولا۔ اندر آگ جل رہی تھی اور نصف درجن کے قریب سوار بھی موجود تھے ''اور دہلی' علی گڑھ اور دوسرے شہروں میں.....''

''مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے اسے ٹوکا ''جب کیولری کے پاس باقاعدہ اپنے کوارٹرز موجود ہیں تو اسے یہاں کھنڈرات میں رہنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟''

وہ خاموش ہو کر جلتی ہوئی آگ کو گھورنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی مناسب جواب ڈھونڈ رہا ہو۔ جب خاموشی کا وقفہ زیادہ طویل ہوا تو میں خود ہی بول اٹھا۔

''بولو یلدرم! تمہارے آفیسر ہنری صاحب! کیا یہاں بھی کوئی ایسی بات .....؟''

''ہنری صاحب مارے جا چکے ہیں بھائی!'' اس نے مجھے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا ''صرف وہی نہیں بلکہ اسکین صاحب' کلکٹر صاحب' ان کی بیویاں اور تمام بچے مارے جا چکے ہیں۔''

میں سن ہو گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے تو ان سب باتوں کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔ میں تو جھانسی کو محفوظ جگہ سمجھ کر پناہ لینے یہاں آیا تھا لیکن یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

یلدرم پوری تفصیل سے یہاں پیش آنے والے واقعات سنا رہا تھا۔

''جب میرٹھ کی بغاوت کی خبر یہاں پہنچی تو مہارانی نے اسکین صاحب کو اپنے پاس طلب کیا۔'' یلدرم کہہ رہا تھا'' اور انہیں کہا کہ وہ اپنے محل کے خزانے اور خود اپنی حفاظت کے لیے محافظ دستے کی تعداد میں اضافے کی خواہش مند ہے۔ اسکین نے فوری طور پر اس کی منظوری دے دی۔ اس نے مہارانی کو یہ پیشکش بھی کی کہ کیولری کے جوان بھی اُس کی خدمت پر مامور کیے جا سکتے ہیں چنانچہ کالا خان اور اس کے دو ساتھیوں نے رانی سے وفاداری کا حلف اٹھالیا لیکن باقی لوگ باہر سے ہی بھرتی کیے گئے .....''

وہ خاموش ہو گیا۔ شاید واقعات کا تسلسل جوڑ رہا تھا۔ میں نے دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔ بالآخر وہ خود ہی بولا۔

''پھر دو ہفتے پہلے بارہویں مقامی انفنٹری کے سپاہیوں میں ہیجان سا پیدا ہوا' چپاتیاں اور کنول کے پھول تقسیم کیے گئے اور ان میں سے چند ایک نے رات کی تاریکی میں ایک بنگلے کو آگ لگا دی۔ لیکن کرنل صاحب نے انہیں سمجھایا اور یوں ایک دن رات سکون سے گزر گئے۔ پھر فیض علی' کالا خان اور سپاہیوں نے اور رانی کے نئے محافظوں کے ساتھ اسٹار فورٹ پر دھاوا بول دیا۔ انہوں نے ہتھیاروں پر قبضہ کیا اور فائرنگ شروع کر دی لیکن اسکین صاحب کو کسی ذریعے سے اس کی خبر مل گئی۔ وہ کچھ عورتوں اور بچوں کے ساتھ ٹاؤن فورٹ میں چلے گئے لیکن بعض صاحب اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پکڑے گئے اور ان باغیوں نے انہیں قتل کر ڈالا۔ وہ لوگ پانچ دن تک وہاں محصور رہے۔ میرے علاوہ رفیق تموار، شادمان خان اور محمد دین بھی وہیں تھے۔ اس دوران باغیوں نے سات مرتبہ دیوار پر ہلہ بولا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس عرصے میں خوراک اور پانی ختم ہو گیا اور بندوقوں کے لیے گولیاں بھی نہ بچیں.....''

یلدرم پھر چپ ہو گیا لیکن چند ثانیوں بعد دوبارہ گویا ہوا'' اسکین صاحب ایک بہادر آدمی تھے لیکن اس ایک ہی ہفتے نے انہیں بوڑھا کر دیا۔ انہیں اپنی اور جوانوں کی کوئی فکر نہ تھی البتہ بچوں کی بھوک پیاس نہ دیکھی جاتی تھی چنانچہ انہوں نے تین افراد کو سفید جھنڈے دے کر ان کے پاس بھیجا لیکن رانی نے کسی قسم کی مدد سے انکار کر دیا.....''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' میں بول اٹھا۔

''سنو اور یقین کرو بھائی!'' یلدرم نے جواب دیا۔'' اس لیے کہ میں اور محمد دین اُن تین میں

شامل تھے۔'' اس نے قریب بیٹھے اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا ''میوری صاحب ہمارے ساتھ تھے لیکن صرف انہیں اندر جانے کی اجازت دی گئی۔ ہم باہر ہی رک گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ میوری صاحب کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔''

وہ رک کر کچھ دیر آگ کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ''جب تمام امیدیں ساتھ چھوڑ گئیں تو اسکین صاحب نے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کی۔ کالا خان رضامند ہو گیا۔ انہوں نے قلعے کے گیٹ کھول دیے اور خود کو باغیوں کے حوالے کر دیا۔ وہ سب کو جوکن باغ لے گئے جہاں انہیں گولی سے اڑا دیا گیا۔''

''وہاں ایک بھٹی بھی تھی جو عام بھٹیوں کی نسبت تین گنا زیادہ تپی ہوئی تھی۔'' وہاں بیٹھا ہوا ایک آدمی بولا۔ ''کیا آپ کو یاد نہیں رسالدار!''

''یاد ہے۔'' یلدرم دھیمے لہجے میں بولا ''انہوں نے صاحبوں کو پہلے مارا۔ کلکٹر صاحب' اینڈریوز صاحب۔ گورڈن' برجس' ٹیلر' ٹرن بل' اسکین صاحب کو سب سے آخر میں مارا۔ ان کی گردن تلوار سے کاٹی گئی۔ مرنے سے پہلے انہوں نے اپنی بیوی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن جواب میں باغیوں نے قہقہے لگائے اور انہیں ٹھڈے مارے۔ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ انہوں نے چلا چلا کر باغیوں کو بزدل کہا اور بخش علی، جو جیل کا داروغہ تھا، نے ان کی گردن اڑا دی۔ یہ سب عورتوں اور بچوں کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ وہ چیختے چلاتے رہے لیکن باغی ان کی نگاہوں کے سامنے خون کی ہولی کھیلنے میں مصروف رہے۔ صاحبوں کے بعد میموں کی باری آئی اسکین کی میم صاحب نے فیض علی سے کہا کہ وہ اسے بے شک زندہ جلا دے لیکن بچوں کو کچھ نہ کہے۔ جواب میں اُسے زمین پر گرا دیا گیا اور وہ اسی حالت میں قتل کر دی گئی۔ عورتوں کے بعد بچوں کی باری آئی۔ انہیں ہتھوڑوں اور چاقوؤں کی مدد سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر انہیں بے گور و کفن جوکن باغ میں چھوڑ دیا گیا۔'' (14)

یلدرم ان تمام واقعات کا چشم دید گواہ تھا۔ میں نے صرف انہیں سنا تھا لیکن اس کے باوجود میں اپنے جسم میں خوف و دہشت کی لہریں تڑپتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ میری نمناک آنکھوں میں اُن تمام لوگوں کے چہرے گھوم رہے تھے جن سے میں اپنے جھانسی کے قیام کے دوران ملا تھا لیکن اب اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہ تھا۔ کافی دیر یونہی گزر گئی۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا اور مجھ سے بولا

نہیں جا رہا تھا۔ یلدرم بھی چپ تھا۔ وہ یک ٹک بھڑکتی ہوئی آگ کو گھورے جا رہا تھا۔

''انہوں نے تم لوگوں کو کیسے زندہ چھوڑ دیا؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''انہوں نے مجھے اور محمد دین کو جیل میں ڈال دیا تھا۔'' یلدرم نے جواب دیا۔ ''وہ ہمیں تشدد کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے لیکن میرے سپاہیوں نے جیل توڑ کر ہمیں رہا کروالیا۔ گزشتہ روز تک ہم جنگل میں چھپے ہوئے تھے لیکن پھر باغی منتشر ہو گئے اور ہم یہاں آ کر چھپ گئے۔ شادمان اور دو دوسرے گھوڑے لینے گئے ہیں اور ہم اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''لیکن رانی کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''میری دعا ہے کہ اللہ اس کے لیے گرم گرم لوہے سے بنا ہوا کوئی محبوب بھیجے جو اُسے اپنی بانہوں میں لے کر بھسم کر ڈالے۔'' یلدرم نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''وہ اپنے قلعے میں موجود ہے اور کالا خان بدستور اس کے محافظ کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس نے اپنے کچھ آدمی فوجیوں کو بھرتی کرنے کے لیے بھی بھجوائے ہیں..... ایک بات اور سنو..... اور ہنسو..... کچھ باغیوں نے بندھا شیو راؤ جس کا تعلق پرولا سے ہے کو اپنا سربراہ چنا۔ اس نے کریرا فورٹ پر قبضہ کر لیا اور خود کو رانی کے مقابلے پر جھانسی کا راجہ قرار دے دیا۔'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسا ''وہ لوگ کہتے ہیں کہ رانی' راؤ کو اسی کے خنجر سے قتل کرے گی' اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اس کے بعد وہ خود اپنی فوجیں لے کر کاٹھے خان اور آرکا کے دیوان کے مقابلے پر جائے گی تاکہ انہیں اپنا مفتوح بنا سکے۔ ویسے فلیش مین! وہ خوبصورت لڑکی انتہائی درجے کی ذہین بھی ہے۔ ایک طرف تو یہ سارا قتل عام ہوا ہے جب کہ دوسری طرف اس نے انگریزوں کو پیغام بھیجا ہے جس میں سرکار کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے لیکن میرے خیال میں وہ ایک جھوٹی اور مکار عورت ہے۔''

''ممکن ہے' وہ ایسی ہی ہو!'' میں نے کہا لیکن پھر جلدی سے وضاحت کی ''میرا مطلب ہے وفادار..... لیکن یلدرم میں تمہاری بتائی ہوئی باتوں پر شبہ نہیں کر رہا بلکہ یہ صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تھوڑا بہت میں بھی اُسے جانتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ وہ بہت گہری ہے لیکن ممکن ہے وہ بچوں کے قتل عام میں ملوث نہ ہو۔ کیا تم دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ باغیوں میں شامل ہو گئی ہے' ان کی پشت پناہی کر رہی ہے یا اُن سے خود کو بچا رہی ہے؟''

میں نہیں جانتا کہ یلدرم نے میری باتوں کا کیا اثر لیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میرا دل اُسے دشمن تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔

یلدرم غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ ''مجھے تمہاری باتوں سے بے وقوفی کی بو آ رہی ہے۔'' بالآخر وہ بولا ''ممکن ہے تم پوری برٹش آرمی میں بہادر ترین گھڑ سوار رہے ہو لیکن عورتوں کے معاملے میں تم صفر ہو یا ممکن ہے ہندورانی نے تمہیں اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔''

''کیا بکواس ہے؟'' میں نے جز بز ہو کر کہا۔

''ایک بات بتاؤ دوست!'' اس نے کن انکھیوں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ ''تمہاری زندگی میں اب تک کتنی عورتیں آئی ہیں؟''

''کیسا بے تکا سوال ہے؟''

''نہیں دوست۔'' یلدرم مسکرایا ''ایک پرانے دوست کی خاطر ہی بتا دو۔''

''اوہ!.....چلو یونہی سہی .....ایک میری بیوی .....اور ایک .....ارے.....بس.....''

''کیوں جھوٹ بولتے ہو۔'' یلدرم نے مجھے ٹوکا ''میرا دعویٰ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی بار پانی نہیں پیا ہوگا جتنی بار تم نے اپنی دوستوں سے لطف اٹھایا ہوگا لیکن اس کے باوجود عورتوں کے بارے میں گورے کے گورے ہو۔ یوں کرو کہ اگر تمہیں اپنی رانی پر اتنا ہی اعتماد ہے تو آج رات محل کے دروازے پر چلے جاؤ اور چلاؤ کہ میری محبوبہ مجھے اندر آنے دو' میں فصیل کے ساتھ تمہاری لاش کے ٹکڑے اکٹھے کرنے کو تیار کھڑا ہوں گا۔''

میں خاموش ہو گیا۔ ایسے وقت میں جب اُس کی ریاست میں باغیوں کی موجودگی کے شواہد موجود تھے میں اس طرح کی کسی آزمائش کے لیے تیار نہیں تھا۔ بس ایک سوال رہ رہ کر ذہن میں کلبلانے لگا تھا کہ اب کہاں جاؤں؟ دہلی' میرٹھ' جھانسی .....کچھ پتا نہیں تھا کہ کتنے گیریژن باقی ہیں۔ میں نے یلدرم سے پوچھا اور اُسے وہ سب کچھ بتایا جو میں سن کر یا دیکھ کر آ رہا تھا۔

''اس بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں۔'' یلدرم نے جواب دیا ''لیکن یہ بات طے ہے کہ باغی اب تک کامیاب نہیں ہوئے۔ گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ اس وقت خونی غسل کر رہا ہے پتا چلا ہے

کہ برطانوی فوج دہلی کی طرف بڑھ رہی ہے اور ایسے برطانوی افسران جن کے گیریژن بغاوت کر گئے ہیں لیکن وہ خود بچ نکلے ہیں، بڑی تعداد میں ملک سے جا رہے ہیں۔ ان میں فوجی ہی نہیں سویلین بھی شامل ہیں..... ہاں کانپور ایک ایسی جگہ ہے جہاں فی الحال جمایا جا سکتا ہے۔ یہاں سے چار دن کا سفر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں بوڑھے جنرل وہیلر نے اپنی آرمی کی مدد سے مقامی سپاہیوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ شادمان گھوڑے لے آئے تو ہم وہیں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''کانپور؟'' میں نے دہرایا۔ میں دراصل ان علاقوں میں جانا نہیں چاہتا تھا جہاں سے جان بچا کر آیا تھا۔

''پھر کہاں جائیں؟'' یلدرم میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ''جھانسی کے اردگرد کوئی محفوظ علاقہ نہیں۔ جنوب کی سمت تم جا نہیں سکتے۔ وہاں اکا دکا انگریز تو ملیں گے لیکن کوئی بڑا گیریژن موجود نہیں۔ مغرب کی طرف بھی نہیں کہ وہ سارا علاقہ بغاوت کی آگ میں جل رہا ہے۔ لے دے کے یہی سمت رہ جاتی ہے جہاں ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔''

میں، ظاہر ہے اس کے رحم و کرم پر تھا اس لیے سوائے خاموش رہنے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

◈ ◈ ◈

رات سکون سے گزری لیکن اگلے دن صبح سے ہی دور کہیں بگل بجنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یلدرم نے ایک آدمی شادمان خان کی تلاش میں بھیجا جو ہمارے لیے گھوڑے لینے گیا تھا جب کہ دوسرا اس بگل بجنے کی وجہ معلوم کرنے گیا۔

اس نے واپس آ کر بتایا کہ رانی کی فوج اپنے پڑوسی مہاراجوں سے نمٹنے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ رانی نے کچھ مرہٹہ سواروں اور چند سو پیدل سپاہیوں کا ایک دستہ تیار کر لیا ہے۔ نصف درجن کے قریب توپیں بھی موجود ہیں۔ رانی نے انہیں خزانے سے باقاعدہ اور مستقل تنخواہ دینے کا وعدہ کیا ہے جب کہ خود سپاہیوں کو امید ہے کہ آرکا پر حملے کے نتیجے میں انہیں دیوان کا خزانہ لوٹنے کا موقع بھی ملے گا۔

دوسری صبح شادمان چھ گھوڑوں سمیت آن پہنچا۔ بقول اس کے، یہ گھوڑے رانی کی فوج

سے چرائے گئے تھے۔ انہوں نے گھوڑے ہی نہیں چرائے تھے بلکہ ان کے اصل سواروں کو بھی قتل کر ڈالا تھا۔

اسی رات ہم جھانسی سے کانپور روانہ ہو گئے۔ مجموعی طور پر ہم آٹھ سوار تھے۔ یلدرم جھانسی سے رخصت ہوتے وقت بے حد افسردہ اور سنجیدہ تھا وہ بار بار جوکن باغ کی سمت دیکھتا جیسے اُن لوگوں کو تلاش کر رہا ہو جن کی لاشیں وہاں بے گور و کفن پڑی رہی تھیں۔

یلدرم نے کہا تھا کہ کانپور چار دن کے فاصلے پر ہے لیکن گھوم کر جانے سے فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ ہمیں تباہی و بربادی بھی دکھائی دی' باغیوں کے بعض دستے بھی نظر آئے جو ہماری طرح شمال مشرق کو ہی جا رہے تھے لیکن ہم ان سے بچ کر نکلتے رہے۔

پہلے تین دن تو اطمینان سے گزرے لیکن چوتھے روز صبح کے وقت یلدرم نے مجھے جھنجھوڑ کے جگایا۔

''شادمان اپنے چار ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا ہے۔'' اس نے جلدی سے مجھے آگاہ کیا۔

''اوہ!'' میں اٹھ بیٹھا' ویسے میں یہ سمجھا تھا کہ شاید باغیوں نے حملہ کر دیا ہے لیکن شادمان کے فرار کا سن کر میں پرسکون ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی سے ہمیں کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ اب ہمارے ساتھ صرف محمد دین اور رفیق تموار رہ گئے تھے۔

یلدرم بہت دیر تک شادمان کو گالیاں دیتا رہا اور برا بھلا کہتا رہا۔ میں مسکرا رہا تھا لیکن میرے چہرے پر بے اطمینانی کی ایک ہلکی سی جھلک ضرور تھی۔ پہلے میرے ارد گرد سات سوار موجود تھے لیکن اب یہ صرف تین رہ گئے تھے اور ان میں سے بھی صرف ایک ہی قابل اعتماد تھا۔ بہر حال جیسے تیسے بھی ہم نے سفر تو جاری رکھنا ہی تھا۔

میرے اندازے کے مطابق ہم لوگ کانپور سے ایک دن کے فاصلے پر تھے۔ ایک بار ہم لوگ جنرل وہیلر کی لائنز میں پہنچ جاتے تو مکمل طور پر محفوظ ہو جاتے۔ البتہ درمیانی علاقے میں باغیوں کی موجودگی کے خطرات بہر حال موجود تھے۔

میرے اندیشوں کی تصدیق اُس وقت ہو گئی جب سورج نمودار ہونے کے چند ہی گھنٹوں بعد ہمیں دور سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ہم اُس وقت سڑک کے کنارے بنے ہوئے ایک گڑھے پر اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے کے لیے رکے تھے۔ ہمارے دونوں جانب جنگل تھا۔ یلدرم

کا سر فائرنگ کی آواز سن کر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا تھا۔

''کانپور!'' وہ بولا۔ ''اس فائرنگ کا کیا مقصد ہے؟ کیا جنرل وہیلر باغیوں کے نرغے میں ہے؟ یقینی طور.....''

اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتا' کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تین سوار نمودار ہوئے جو اپنے گھوڑوں کو سرپٹ بھگا رہے تھے۔ وہ مجھے مقامی آدمی لگ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے عقب میں چند اور سوار نمودار ہوئے جو یقینی طور پر ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ مجھے اُن میں ایک سفید فام چہرہ بھی نظر آیا تھا۔ وہ اپنی تلوار لہرا لہرا کر اپنے ساتھی سواروں کو احکامات دے رہا تھا۔

آگے والے تین سواروں میں سے ایک سوار کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور زمین پر آ رہا۔ اس کی ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور وہ تڑپنے لگا۔ باقی دو سوار جنگل میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے اس سے پہلے کہ گرنے والا اٹھتا' عقب میں آنے والے گھوڑے اسے روندتے ہوئے گزر گئے۔

میں اُس وقت تک زمین پر لیٹ کر اپنا کولٹ نکال چکا تھا۔ تعاقب کرنے والے سوار آگے نکلتے چلے گئے لیکن دو بالکل میرے قریب رک گئے۔ میں اٹھ کر اُن کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی میں چلاتا بھی جا رہا تھا۔

''گولی مت چلانا دوستو! میرا نام فلیش مین ہے۔''

اب میں گھڑ سواروں کو صاف طور پر پہچان گیا تھا اُن کا تعلق سکھ کیولری سے تھا اور ان میں کم و بیش نصف درجن سفید فام موجود تھے۔ وہ میری طرف متوجہ تھے۔ جونہی میں اُن کے قریب پہنچا اُن میں سے ایک چیخا۔

''وہیں رک جاؤ، اپنا پستول نیچے گرا دو۔''

''نہیں۔'' میں بھی جواباً چیخا۔ ''تم سمجھ نہیں پا رہے۔ میں برٹش آفیسر ہوں اور میرا نام کرنل فلیش مین ہے۔''

''جھوٹ!'' اس نے مجھ سے نگاہیں ہٹا کر یلدرم کو دیکھا جو اب میرے پیچھے آن پہنچا تھا ''تم برطانوی دکھائی تو نہیں دیتے.....اور یہ کون ہے؟'' اس نے یلدرم کی طرف اشارہ کیا ''کیا' ڈیوک آف کیمبرج؟''

''یہ با قاعدہ کیولری کا ایک رسالدار ہے'' میں نے اس کے طنز کا برا مانے بغیر جواب دیا۔

''میرا پورا نام کرنل ہیری پیکٹ فلیش مین ہے' شاید تم نے کبھی یہ نام سنا ہو؟''

''تم تو ایک پانڈے دکھائی دیتے ہو۔'' جواب ملا۔

''فاصلہ رکھ کر کھڑے رہو۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے کس سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔'' میں نے اپنا انداز خاصا مؤدب رکھا تھا ''اگر تمہارا کوئی کمانڈنگ آفیسر موجود ہے تو براہِ کرم اسے میرے بارے میں بتاؤ۔''

وہ پریشان دکھائی دینے لگا۔ شاید فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھ پر یقین کرے یا نہ کرے۔

''لیفٹیننٹ چیئر مین آف روبوتھم موس ٹروپرز'' وہ بولا۔ ''لیکن تم ہم میں سے ہو تو پھر مقامیوں کے لباس میں کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

''تم نے اپنا نام فلیش مین بتایا ہے؟'' دوسرا بول پڑا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگا ''ویسے تم فلیش مین لگتے نہیں ہو کیونکہ ہیری فلیش مین 43ء میں لاہور میں میرے لڑکے کا گاڈ فادر رہا ہے' میرا نام بتاؤ۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے ذہن پر زور دینا شروع کیا۔ یہ واقعہ جلال آباد سے واپسی پر پیش آیا تھا۔ کوئی آئرش نام تھا۔

''اوٹولی!'' میں دفعتاً چلا اٹھا ''فلیش مین اوٹولی۔''

''ونڈرفل!'' وہ پرجوش انداز میں بولا ''کرنل روبوتھم کہاں ہے؟''

موس ٹروپرز کی طرح روبوتھم بھی میرے لیے ایک نیا نام تھا اُسی وقت اُن لوگوں کے عقب میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ابھری اور تین گھڑ سوار قریب آ گئے۔ درمیان میں ایک ہٹا کٹا انگریز تھا جب کہ اُس کے دائیں بائیں دو سکھ جوان تھے۔ میرے خیال میں یہی کرنل روبوتھم تھا۔

وہ چند ثانیے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر اُس کی مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ چیئر مین سے مخاطب ہوا ''یہ کون ہے؟''

اس کی آواز بھاری بھرکم اور کسی دھاڑ سے مشابہ تھی۔ چہرے کی سختی زبان کے راستے مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ چیئر مین نے مختصراً اسے میرے بارے میں بتایا لیکن اس کی آنکھوں میں شک کی

پرچھائیاں بدستور لہرا رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے اُسے بتایا کہ میں اور میرے ساتھی جھانسی سے آ رہے ہیں جہاں ہم نے بہ مشکل تمام قتل عام سے جان بچائی ہے۔

''کیا؟'' وہ چیخا ''قتل عام.....اور جھانسی میں؟''

دوسرے لوگوں نے بھی میرا جواب سننے کے لیے گھوڑے آگے کر لیے۔ میں نے انہیں وہ تفصیلات بتائیں جو یلدرم مجھے بتا چکا تھا۔ میں نے ان کے چہروں پر واضح طور پر دکھ اور تکلیف کے تاثرات دیکھے تھے۔

''مائی گاڈ!'' میرے خاموش ہونے پر بوتھم بولا۔ ''جانے یہ سب کب ختم ہوگا؟ کتنے معصوم مارے جائیں گے؟ تم نے بیس بچے کہا ہے؟ اور ساری عورتیں.....''

بہت دیر تک وہ اپنے دکھ بھرے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔ پھر اچانک اُسے کچھ یاد آ گیا۔

''معذرت چاہتا ہوں کرنل!'' اس بار اس کا مخاطب میں تھا۔ ''ان خبروں نے مجھے سب کچھ بھلا دیا۔ میرا نام کرنل جیمز کین روبوتھم ہے اور یہ میرا رضا کار دستہ ہے' موس ٹروپرز۔ ان کی تعیناتی دہلی میں بغاوت کے بعد ہوئی ہے اور میرا تقرر گورنر کالون نے آگرہ میں کیا ہے۔''

''تقرر.....ایک سویلین نے؟'' مجھے حیرت ہوئی تھی کہ گورنر نے فوجی تقرریاں اور ترقیاں کب سے شروع کر دیں۔ ''یعنی آپ کا تعلق فوج سے نہیں۔''

''ہم سپاہی ہیں سر!'' اس کا لہجہ اب خاصا نرم اور مؤدب تھا۔ ''جیسے آپ ہیں۔ ایک ماہ قبل میں دہلی میں ڈاکٹر تھا' مم.....میری بیوی اور بچے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ میرے یہ ساتھی بھی رضا کار ہیں۔ ان کا تعلق دہلی اور آگرہ سے ہے اور ان میں تاجروں' وکیلوں اور سرکاری ملازموں سمیت ہر شعبے کے لوگ شامل ہیں۔ اب ہم گشتی فوج کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کیونکہ گیریژن سے ریگولر کیولری کے جوانوں کو فارغ نہیں کیا جا سکتا اس لیے ہم لوگ کانپور اور آگرہ کے درمیان سڑک کو صاف رکھتے ہیں لیکن اب جب کہ باغی کانپور تک پہنچ چکے ہیں ہم اردگرد کے دیہات اور علاقے کا دورہ کر کے ان کی موومنٹ کے بارے میں خبریں اکٹھی کرتے ہیں اور لوگوں کو ان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

اس وقت تک مقامی فوجیوں کے تعاقب میں جانے والے جوان واپس آ چکے تھے۔ وہ اپنے ساتھ بعض قیدی بھی لائے تھے۔ شاید باغیوں کے کچھ ساتھی پہلے سے جنگل میں موجود تھے۔

''کتنے قیدی ہو گئے چیئر مین!'' کرنل بوتھم نے پوچھا۔

''سات سر!'' کرنل بوتھم نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی رجمنٹ کو چلنے کا اشارہ کیا ہم ذرا سا آگے بڑھے تو ہمیں درجن بھر سکھ اور دو سفید فام مزید نظر آئے۔ ان کے حلیے کرنل بوتھم جیسے آدمیوں کے سے تھے انہوں نے نصف درجن کے قریب باغی سپاہیوں کو رسیوں سے باندھ کر قیدی بنا رکھا تھا۔

''انہیں یہاں لے آؤ۔'' کرنل نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ جب انہیں کرنل کے سامنے دوسرے قیدیوں کے ساتھ قطار میں کھڑا کر دیا گیا تو کرنل نے ان کے عقب میں درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''چیئر مین! ان کے ہاتھ باندھ کر درختوں کے نیچے کھڑا کر دو۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ''ابھی تم دیکھنا کرنل کہ ہم کس طرح عورتوں اور بچوں کے قاتلوں سے نمٹتے ہیں۔ اجتماعی پھانسی دینا ہمارا پرانا طریقہ رہا ہے۔ یہ درحقیقت باغیوں کے لیے ایک انتباہ بھی تھا لیکن جھانسی کی وحشت ناک خبروں نے ایک بار پھر ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہم باغیوں کے لیے فوری مثال قائم کرنا چاہتے ہیں.....''

وہ کسی طرف سے بھی مجھے پاگل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک عام سا آدمی تھا۔ جو اچانک ہی جنگ میں آ شامل ہوا تھا۔ میں خود بھی میرٹھ اور جھانسی کا قتل عام دیکھ چکا تھا اور میری ذہنی حالت اس سے مختلف نہ تھی لیکن کرنل کچھ زیادہ ہی انتہا پسند واقع ہوا تھا۔

اس کے ماتحت سکھوں نے باغیوں کو درختوں کے نیچے کھڑا کر دیا اور خود شاخوں پر جا بیٹھے تھے۔ انہوں نے قیدیوں کے گلوں میں رسیاں کس دی تھیں جن کے سرے شاخوں پر بیٹھے ہوئے سکھوں کے ہاتھوں میں تھے۔

''کیا انہیں گھوڑوں کے سموں سے روند ڈالا جائے۔'' ایک شخص نے روبوتھم سے پوچھا۔

''نہیں'' روبوتھم تقریباً چلا اٹھا ''میں نے کتنی بار تم لوگوں کو سمجھایا ہے کہ میں ان کے لیے موت کو آسان نہیں بنانا چاہتا۔ ان لوگوں کو سزا کے طور پر پھانسی دی جا رہی ہے اس لیے انہیں موت کی تکلیف کا ذائقہ چکھنے دو۔'' اس نے اپنی مٹھی بند کر کے قیدیوں کی طرف ہلائی ''اب تم لوگوں کو پتا چلے گا کہ بغاوت کیا ہوتی ہے؟ ایک ہی لمحے بعد تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔ اس وقت کچھ اور سوچنے کے بجائے صرف اللہ سے دعا مانگو کہ وہ تم لوگوں کی موت آسان بنا دے۔''

وہ قیدیوں کی طرف بڑھا اور اس نے ایک ایک کے گلے میں بندھی ہوئی رسی کا بغور معائنہ کیا۔ وہ یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کسی کے گلے میں رسی ڈھیلی تو نہیں ہے۔ بالآخر جب وہ مطمئن ہو گیا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے سکھوں کو شاخوں سے بندھی رسیاں کھینچ لینے کو کہا تو وہ جیسے حکم کے منتظر بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوراً رسیاں کھینچنی شروع کر دیں اور چند ہی ثانیوں بعد تیرہ افراد رسیوں کے سہارے درختوں سے لٹک رہے تھے۔

ان کے بدن تڑپتے رہے۔ ان کی رنگت نیلی ہونا شروع ہو گئی۔ منہ کھل گئے' زبانیں باہر نکل آئیں' گردنیں لمبی ہو گئیں اور آنکھیں حلقوں سے باہر نکل اُبل پڑیں۔

''کیا ان سے ہماری سنچری مکمل ہو گئی چیئر مین؟'' کرنل نے اپنے ماتحت سے پوچھا۔

''یس سر!'' چیئر مین نے مستعدی سے جواب دیا ''چھیاسی افراد پہلے ہی ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں' ایک کل رات گھاٹ میں مارا گیا اور تیرہ یہ' یوں سو پورے ہوئے۔''

''ونڈرفل'' کرنل نے جواب دیا لیکن پھر اس کا منہ مارے حیرت کے کھل گیا۔

ایک باغی کی رسی نہ معلوم کس طرح ڈھیلی رہ گئی تھی اور اب وہ اس سے آزاد ہو کر زمین پر کھڑا تھا۔ سکھ اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھے لیکن روبوتھم نے انہیں روک کر اپنا ریوالور نکال لیا۔ اس نے سپاہی کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ باغی سپاہی اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا۔

لیکن اب جیسے روبوتھم پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ اس نے رسی سے جھولنے والے دوسرے باغی کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ گولی اس کے مردہ جسم میں جا گھسی۔

''یہ مسز فاکس کے لیے ..... یہ جانسن کے لیے ..... یہ بنتھم کے لیے ..... یہ .....'' وہ چلا رہا تھا اور گولیاں چلا رہا تھا۔ بالآخر اس کا ریوالور خالی ہو گیا لیکن وہ پھر بھی ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔

''ان کی لاشوں کو سڑک پر ڈال دیا جائے۔'' کرنل نے اپنے ماتحتوں کو اگلا حکم سنایا۔

تنومند سکھوں نے چند ہی منٹوں کے اندر اپنے آفیسر کی خواہش پوری کر دی۔ تیرہ کے تیرہ آدمیوں کو ایک قطار میں سڑک پر لٹا دیا گیا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ روبوتھم کا مقصد کیا ہے کہ سکھوں کا دستہ کرنل کے اشارے پر اپنے گھوڑے لاشوں سے دور لے گیا اور پھر انہوں نے لاشوں کی طرف انہیں دوڑا دیا۔

اگلے چند لمحے خود میرے لیے ایسے تھے کہ زندگی بھر یاد رہتے۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی اور میں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کرلیں کیونکہ میں کھلی آنکھوں سے انسانیت کی اس قدر تذلیل دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔

سڑک پر پڑے ہوئے جسم بے جان تھے اس لیے جب گھوڑوں کے تیز سموں نے انہیں روندا تو ان کے منہ سے کسی قسم کی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی۔ گھوڑے دوڑتے رہے۔ لاشیں پامال ہوتی رہیں' بالآخر میں نے کرنل کی آواز سنی جو اپنے ماتحتوں کو رکنے کا حکم دے رہا تھا۔

میں نے بھی ہمت کر کے آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے اس جگہ، جہاں لاشیں پڑی تھیں' اب خون' قیے اور مٹی کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ گھوڑوں کے سموں نے باغیوں کو آٹے کی مانند گوندھ کر رکھ دیا تھا۔ خون اور گوشت کے لوتھڑے گھوڑوں کے سموں سے بھی لپٹے ہوئے تھے۔

میں نے روبوتھم کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں یا چہرے پر ملال کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا۔

ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تو میں نے روبوتھم سے کانپور کے بارے میں دریافت کیا۔ مجھے علم ہوا کہ وہ لوگ خود دو ہفتوں سے کانپور سے باہر ہیں۔ اس لیے انہیں تازہ ترین صورت حال کا علم نہیں۔

لیکن اس سے بری خبر کرنل نے یہ سنائی کہ کانپور باغیوں کے محاصرے میں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنرل وہیلر زیادہ تر برطانوی کمانڈروں کی طرح بے خبر نہیں تھا۔ بلکہ جونہی اسے میرٹھ کی بغاوت کی خبر ملی اس نے برطانوی دستوں کو کانپور شہر کی مشرقی جانب اکٹھا کرلیا۔ اس نے وافر مقدار میں گولہ بارود بھی ذخیرہ کرلیا تھا تاکہ اگر اس کی چاروں مقامی رجمنٹیں بغاوت کردیں تب بھی ہر برطانوی سپاہی اور سویلین محفوظ رہے۔ وہ جانتا تھا کہ کانپور' گنگا کے کنارے دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس لیے شہر میں بکھرے ہوئے ہر برطانوی کی حفاظت عام طریقے سے ممکن نہیں اس لیے اس نے یہ حکمت عملی اختیار کی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

چنانچہ جب بغاوت ہوئی تو وہ تیار تھا اور اب وہ گزشتہ پندرہ دن سے ان کے مقابلے پر ڈٹا

ہوا تھا۔ جنہیں آخری لمحوں پر باغی ہو جانے والے مقامی شہزادے نانا دو نپت صاحب کی حمایت حاصل تھی۔ روبوتھم کو امید نہیں تھی کہ باغی، جنرل وہیلر اور اس کی آرمی کا صفایا کرنے میں کامیاب رہیں گے کیونکہ افواہ تھی کہ شمال کی جانب چالیس میل دور واقع لکھنؤ شہر سے امدادی دستے روانہ ہو چکے ہیں جب کہ مشرق کی جانب گنگا کے ہی کنارے واقع شہر الہ آباد سے بھی ایسی ہی خبریں ملی تھیں۔

میں نے روبوتھم کو تجویز پیش کی کہ ہمارا کانپور میں لڑے بھڑے بغیر داخلہ ممکن نہیں اس لیے کیوں نہ لکھنؤ کا رخ کیا جائے جو ابھی تک باغیوں کی دسترس سے باہر ہے لیکن اس کے باوجود کہ اس کے سپاہیوں کو اسلحے کی شدید ضرورت تھی اس نے میری تجویز نہیں مانی۔

اس کا کہنا تھا کہ علاقے کی غیر یقینی صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ قریب ترین برطانوی گیریژن کا رخ کیا جائے۔ علاوہ ازیں اسے یہ توقع بھی تھی کہ کانپور میں داخلے کے وقت کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ وہ بہت سی ایسی جگہوں کے بارے میں جانتا تھا جہاں سے خاموشی کے ساتھ کانپور میں داخلہ ممکن تھا۔ بقول اس کے، وہیلر کو اس نے پیغام بھیجا تھا جس میں اپنی آمد کا وقت بھی بتا دیا تھا۔ اس طرح کوئی خطرہ بھی نہیں تھا اور یہ امکان بھی نہیں تھا کہ وہیلر کے آدمی ہمیں دشمن سمجھ کر گولیوں سے اڑا دیں گے۔

اس کے تمام دلائل اپنی جگہ لیکن میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ جھانسی کے فرائنگ پین سے نکل کر میں کانپور کی آگ میں آ گرا تھا۔ بقول روبوتھم، آگرہ اور الہ آباد کے درمیان کوئی محفوظ مقام موجود نہیں تھا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ اس علاقے میں کتنے گیریژن بغاوت کر چکے تھے۔ ان حالات میں، میں تنہا یلدرم کے ساتھ لکھنؤ جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا چنانچہ بہتر یہی تھا کہ میں خود کو روبوتھم اور جنرل وہیلر کے ساتھ داؤ پر لگا دیتا۔

روبوتھم کو یقین تھا کہ جنرل وہیلر باغیوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ''تم دیکھ لینا کرنل! اسی جگہ باغیوں کا آخری قبرستان بنے گا۔'' وہ پر جوش انداز میں بولا ہم اس وقت کانپور سے دس میل کے فاصلے پر کیمپ لگائے ہوئے تھے اور ہمیں دور فاصلے پر فائرنگ اور گولہ باری سے آسمان پر ہونے والی روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''مجھے یقین ہے کہ ہمارے دستے جلد ہی دہلی پر قبضہ کر لیں گے۔'' روبوتھم پر اعتماد لہجے میں

بول رہا تھا ''باغیوں کا دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا اور ہم اس خود ساختہ شہنشاہ کو باہر کھینچ لائیں گے جو اس سارے شاخسانے کی جڑ ہے۔ پھر جب لارنس جنوب میں لکھنؤ کی طرف سے اور دوسری فورسز دریا کی طرف سے حملہ کریں گی تو کانپور کے باغیوں کو زمین میں سمانے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔ ہم سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹیں گے۔''

آگ کے اردگرد بیٹھے ہوئے روبوتھم کے دوسرے ماتحت بھی بات چیت میں شامل ہو گئے اور یہ بحث ہونے لگی کہ جب تمام باغیوں کو گرفتار کر لیا جائے گا تو انہیں گولیوں سے اڑا دیا جائے گا' پھانسی دے دی جائے گی یا توپوں کے دہانے سے باندھ کر گولے داغ دیے جائیں گے' کچھ لوگ انہیں زندہ جلا دینے کے حق میں تھے اور بعض کے خیال میں زندہ دفن کر دینا زیادہ مناسب تھا۔

جب کہ ان سب کے برعکس میں خود صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح کانپور میں محفوظ طریقے سے داخل ہوا جائے مجھے اس سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی کہ باغیوں کو کس طریقے سے موت کی سزا دی جاتی ہے یا انہیں سرے سے معاف کر دیا جاتا ہے۔

◈ ◈ ◈

اگلے روز سہ پہر تک ہم جنگل کے گھنے درختوں میں لیٹے رہے۔ توپوں کے داغے جانے کی آواز ہمیں اپنے سروں پر سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہیلر کے آدمی بدستور اپنے مورچوں پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ کرنل روبوتھم نے اپنا ایک سپاہی دریا کے بند کی طرف بھیجا تھا جس نے واپس آ کر رپورٹ دی تھی کہ وہیلر کے سپاہی ''سب اچھا ہے'' کا نغمہ الاپ رہے ہیں۔

دن یونہی گزرا اور تاریکی ہونے کے بعد ہم نے پیش قدمی شروع کی۔ ایک مناسب اور محفوظ جگہ ہم نے ڈیرے ڈال دیے اور اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب ہمیں مزید آگے بڑھنا تھا۔

صبح کے دو بجے روبوتھم نے ہمیں جمع کیا اور احکامات دیے۔

''الہ آباد روڈ کے ساتھ ایک صاف راستہ موجود ہے''۔ اس نے ہمیں بتایا ''لیکن اس سے پہلے کہ وہاں پہنچیں ہمیں باغیوں کی پوزیشنوں کے عین عقب میں آنا ہوگا جو اس سے نصف میل کے فاصلے پر مورچہ بند ہیں۔ صبح چار بجے میں ایک راکٹ فائر کروں گا۔ ہمیں اسی راکٹ کی آڑ میں پوری رفتار کے ساتھ بند کی طرف بڑھنا ہے۔ سنتری ہمارے راکٹ کو دیکھ چکے ہوں گے اس لیے وہ

ہم سے کوئی تعرض کریں نہیں گے۔ پاس ورڈ'' برطانیہ'' ہوگا۔ اپنی زندگیوں کے تحفظ کے لیے یاد رکھو کہ ہمیں چرچ کی بائیں جانب پہنچا ہے اس لیے اس کے ٹاور کو دائیں سمت رکھنا۔ اب تم لوگ جاؤ اس امید کے ساتھ کہ دوبارہ ملیں گے، لائنز میں یا جنت میں .....''

مجھے اس کڑے وقت میں بھی کرنل کا یہ ہلکا پھلکا جملہ پسند آیا تھا۔ جب تاریکی میں سب لوگ ایک دوسرے سے الوداعی مصافحہ کر رہے تھے میں یلدرم کے کان میں کہہ رہا تھا کہ وہ بہر صورت میرے کندھے سے کندھا ملائے رہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری ذہنی حالت اس وقت کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔

دراصل مجھے وہ وقت یاد آ گیا تھا جب ہم جنگل میں چھپے ہوئے تھے۔ میرے قریب ہی موجود ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا تھا۔ ''جنک! وقت کیا ہوا ہے؟''

''تین بج کر دس منٹ'' جنک نے جواب دیا'' اور یہ ذہن میں رکھنا کہ آج جون کی بائیس تاریخ ہے۔ اللہ سے دعا کرنا ہمیں تیئیس جون کا دن دیکھنا نصیب ہو۔''

میرے پورے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

تیئیس جون!

میرے ذہن نے قلابازی کھائی اور میں بالمورل کے اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں وزیر اعظم برطانیہ لارڈ پالمرسن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے لارڈ پالمرسن کا کہا ہوا ایک ایک لفظ یاد آ رہا تھا۔

''.....ہندوستان میں برطانوی راج' جنگ پلاسی کے ٹھیک سو سال بعد ختم ہو جائے گا .....اگلے 23 جون کو .....''

اس وقت سے اب تک میرا جسم سنسنا رہا تھا۔ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کی لگام کو تھامے میری ہتھیلی پسینے میں تر ہو گئی۔ آگے جانے والا سوار بھی مجھے دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اس وقت دو تباہ شدہ گھروں کے درمیان کھڑے آگے بڑھنے کے سگنل کے منتظر تھے۔

پانچ منٹ .....دس منٹ.....اور پھر ایک بلند آواز سنائی دی۔ ''ریڈی' آل''

ایک تیلی جلنے کی مدھم سی روشنی ابھری جو ایک بھڑکتے ہوئے شعلے میں تبدیل ہوئی اور پھر نارنجی رنگ کا ایک راکٹ تاریکی کا سینہ چیرتا ہوا آسمان کی طرف بلند ہو گیا۔

ساتھ ہی روبوتھم کی آواز آئی۔ ''ایڈوانس''، ہم نے گھوڑوں کو مہمیز دی اور طوفان کی مانند آگے بڑھے۔

ایک کھلے میدان کے بعد درختوں کا جھنڈ تھا۔ تاریکی کی وجہ سے گھڑ سوار ہیبت ناک اور خوفناک بھوت دکھائی دے رہے تھے۔ اردگرد باغی موجود تھے۔ رائفلیں گرجیں، گولیاں چلیں لیکن ہم محفوظ طور پر گزرتے چلے گئے۔ میرے اردگرد گھڑ سوار چل رہے تھے جب کہ یلدرم میرے پہلو میں اپنی زین پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے چلا کر کچھ کہا اور دائیں جانب اشارہ کیا۔ میں نے اندھیرے میں ایک عمارت کا ہیولیٰ دیکھا وہ یقینی طور پر چرچ تھا۔ بائیں جانب بند کی طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی جو ہمارے کور کے لیے تھی۔

ہمارے عقب میں اچانک ہی بھاری توپ سے ایک گولہ پھینکا گیا جو سامنے کی سمت جا کر پھٹا۔ گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی جس میں بعدازاں ایک چیخ بھی شامل ہوگئی۔ شاید کوئی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

بہت سے گھوڑے بے قابو ہو کر آپس میں ٹکرائے۔ جن میں میرا گھوڑا بھی شامل تھا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن غیر متوازن ہو کر زمین پر آ رہا۔ میرا ایک پیر رکاب میں پھنسا رہ گیا گھوڑا آگے بھاگا تو میں بھی دور تک اس کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا۔ وہ تو اتفاقاً میرا پاؤں رکاب سے نکل گیا ورنہ میں اپنی ٹانگ سے محروم ہو چکا ہوتا۔ اس کے باوجود مجھے ٹانگ میں شدید تکلیف کا احساس ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ہڈی وغیرہ ٹوٹ گئی ہو۔ یلدرم فوراً میری مدد کو پہنچا۔ اس نے نہ صرف مجھے زمین سے اٹھایا بلکہ میرے گھوڑے کو بھی قابو کر کے میرے قریب لا کھڑا کیا۔

جونہی میں یلدرم کی مدد سے گھوڑے پر سوار ہوا اردگرد کا ماحول دن کی مانند روشن ہو گیا۔ کسی ظالم نے فضا میں فلیئر فائر کیا تھا۔ میں نے اس روشنی میں بڑے وحشت ناک مناظر دیکھے۔

میرے اردگرد کئی گھوڑے اور ان کے سوار زخمی یا مردہ حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ صرف چند گز کے فاصلے پر روبوتھم ایک گھوڑے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ فوراً ہی ایک گولہ ہمارے قریب پھٹا اور میں نے کچھ اور لوگوں کو لاشوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ چیئرمین اپنے چہرے پر زخم کھا کر گھوڑے سے زمین پر گرا اور دوبارہ نہیں اٹھ سکا۔ یلدرم اپنا بایاں بازو ہاتھ میں تھامے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس بار میں نے اس کی مدد کی تھی۔

بنداب چند سو گز دور تھا اور فلیئر کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے یلدرم کو اپنی زین پر کھینچا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ گھوڑے نے زمین پر پڑی ہوئی کسی لاش سے ٹھوکر کھائی اور ہم دونوں ایک بار پھر زمین پر آ رہے۔ آخری آواز جو میں نے سنی وہ یلدرم کی تھی۔ وہ بلند آواز میں ''برطانیہ' برطانیہ'' کہہ رہا تھا۔

اس کے بعد میں دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

جانے کتنی دیر میں بے ہوش رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو زمین پر پڑے پایا۔ فضا اب بھی دھواں دھار تھی اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے بھری پڑی تھی۔ مجھے صرف یہ یاد تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے یلدرم میرے ساتھ تھا اور اب مجھے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دے رہی تھی جو کم از کم یلدرم کی نہیں تھی۔

''فائر .....! ری لوڈ .....! فائر .....'' انداز تحکمانہ تھا۔ یقینی طور پر وہ انگریز فوج کا کمانڈر تھا۔

میں نے ہلنے جلنے کی کوشش کی لیکن ٹانگ کو حرکت دینے میں ناکام رہا اور ایک کراہ کے ساتھ دوبارہ نیچے لیٹ گیا۔ کسی نے مجھے ریت کی بوری کے سہارے ٹکا دیا تھا جس کی وجہ سے میں فائرنگ کی زد سے باہر تھا۔ اٹھنے میں ناکام ہونے کے بعد میں نے سر اٹھا کر اردگرد کا جائزہ لینے کی کوششیں شروع کر دیں لیکن زیادہ دیر ہوش میں نہ رہ سکا۔ درد کی ایک ٹیس اٹھی اور میں ایک بار پھر اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

دوسری مرتبہ آنکھ کھلنے پر میں نے کسی کو اپنے بوٹ اتارتے پایا۔ ایک اور شخص میرے ٹخنے پر کپڑا لپیٹ رہا تھا جو سوج گیا تھا۔ کئی لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ کچھ دور مجھے یلدرم بھی دکھائی دیا۔ جس کے زخمی بازو کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔

کچھ سپاہی' زخمیوں کو اٹھا کر بیرکوں میں لے جا رہے تھے۔ وہ سفید فام تھے جس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ میں دوستوں میں پہنچ چکا ہوں لیکن اس کے باوجود یہ سب مجھے ایک خواب نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ گولیوں کی برسات سے بچ نکلنا ایک معجزہ ہی تو تھا۔

◈ ◈ ◈

جس جگہ ہم موجود تھے وہ ایک گڑھا سا تھا جس کی چار دیواری پانچ فٹ سے زیادہ بلند نہ تھی۔ اس سے متصل دو بڑی بڑی ایک منزلہ بیرکیں تھیں جن میں سے ایک کی نصف چھت منہدم ہو چکی تھی۔ اردگرد کا سارا علاقہ میدانی تھا جس کی دوسری جانب درختوں اور جلی ہوئی عمارتوں میں باغیوں کی لائنز تھیں۔ شمال مغرب کی جانب تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کان پور شہر واقع تھا۔ شہر دریا کے کنارے دور دور تک پھیلا ہوا تھا لیکن ہمارے لیے کانپور صرف انہی دو ادھ جلی بیرکوں تک محدود تھا۔

یہ بیرکیں وہیلر اور اس کے گیریژن کی جائے پناہ تھیں۔ جہاں وہ اڑھائی ہفتوں سے ایک پوری فوج کے مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا۔ جس وقت محاصرہ شروع ہوا' نو سو افراد اس جگہ موجود تھے جن میں نصف کے قریب عورتیں اور بچے تھے۔ چار سو برطانوی فوجی اور سویلین اور سو کے قریب مقامی وفادار فوجی تھے۔ ان کے پاس پانی کا ایک کنواں اور تین توپیں تھیں اور وہ دن میں دو وقت کا کھانا کھا کر ان تین ہزار باغیوں کا مقابلہ کر رہے تھے جن کے پاس انہیں تباہ کرنے کے لیے پندرہ توپیں موجود تھیں۔

پہلے پندھڑ واڑے میں گن فائر' گرمی اور بیماریوں سے دو سو کے قریب انگریز ہلاک ہوئے۔ ان میں عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ گولہ باری سے ہسپتال کے لیے استعمال ہونے والی بیرک بھی تباہ ہوئی اور اس میں موجود زخمی مارے گئے۔ اس طرح محض تین سو افراد لڑائی کے لیے باقی رہ گئے تھے۔ باقیوں میں سے نصف کے قریب زخمی یا بیمار تھے۔

یہ وہ جگہ تھی جہاں میں تحفظ حاصل کرنے آیا تھا۔ اس مورچے کے بارے میں روبوتھم کو مکمل طور پر یقین تھا کہ باغی کبھی اس کا کنٹرول حاصل نہ کر سکیں گے لیکن اس مورچے کا تحفظ کرنے والوں میں سے نصف ایسے تھے جنہوں نے پہلے کبھی بندوق چلائی ہی نہیں تھی۔ کاش روبوتھم اس وقت زندہ ہوتا تو میں اس سے دریافت کرتا کہ تم کس برتے پر اس مضبوط پناہ گاہ میں آنے کے خواہش مند تھے لیکن افسوس کہ صرف روبوتھم ہی نہیں' اس کے اکثر ساتھی اس پناہ گاہ میں داخل ہوتے وقت مارے گئے تھے۔

میں صحیح سلامت اندر پہنچنے والوں میں سب سے سینئر آفیسر تھا۔ جب ان لوگوں کو پتا چلا کہ میں کون ہوں تو مجھے اٹھا کر بیرک کے اس حصے میں لے جایا گیا جو اب تک سلامت تھا اور جہاں

جنرل وہیلر کا دفتر موجود تھا۔

ہم دونوں کافی دیر ایک دوسرے کو حیرت سے گھورتے رہے۔ وہ اس لیے مجھے دیکھ رہا تھا کہ میں اب تک عبدل نظر آ رہا تھا اور میری نگاہیں اس لیے اس کے چہرے پر جمی تھیں کہ جس پھرتیلے کمانڈر کو میں دس سال پہلے جانتا تھا اس وقت وہ پتھر کے دور کے انسان کی صورت میرے سامنے تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ یونیفارم کوٹ گندا اور پھٹا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر وہ کوئی گورکن نظر آتا تھا۔

''ارے، تم تو سدا کے جوان نکلے، ہیری فلیش مین!'' اس نے مجھے پہچانتے ہوئے کہا۔ ''تم خون کی اس ہولی میں کہاں سے آ رہے ہو؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے پہلے میرٹھ اور پھر جھانسی کے بارے میں بتایا۔ اس عرصے میں تین مزید شیل بیرک کو آ کر لگے جس سے پوری بیرک لرز گئی اور دیواروں سے پلاسٹر اکھڑ کر نیچے آ گرا۔ وہیلر، غائب دماغ پروفیسروں کی طرح بے حس حرکت اپنی میز کے عقب میں بیٹھا رہا تھا۔

''مائی گاڈ!'' بالآخر وہ بولا۔ ''جانے ہمارا کیا انجام ہوگا؟ کیا تم نے سنا ہے لکھنؤ یا الٰہ آباد سے ہمارے آدمی کانپور کی طرف بڑھ رہے ہیں۔'' میں نے جب انکار میں جواب دیا تو اس نے اپنے چیف آفیسر زوائی برٹ اور مور کی طرف دیکھ کر ایک لمبی سانس کھینچی۔

''میرے خیال میں اس کی توقع فضول ہے'' وہ مایوس کن اور تھکے ہوئے انداز میں بولا۔ ''اس لیے ہمیں اپنا فرض خود ہی انجام دینا ہوگا.....لیکن کب تک؟ ویسے اگر بچوں کا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو شاید ہم زیادہ بہتر انداز میں اپنا دفاع کرتے.....'' وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ چند ثانیے وہ مجھے دیکھتا رہا، پھر گویا ہوا ''.....اپنی پریشانیوں میں، میں تمہارے مسائل کو بھول گیا تھا، فلیش مین، بہت معذرت، تم اس وقت ہمیں دستیاب سب سے بہترین جگہ یعنی ٹوٹی پھوٹی بانکونی میں چلے جاؤ۔ مور تمہیں وہ جگہ دکھا دے گا۔ اللہ تم پر اپنی مہربانی کرے اور تم جلد صحت یاب ہو جاؤ.....''

اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور مور آگے آ گیا۔ وہ ایک طویل قامت کیپٹن تھا لیکن اس کا ایک بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تمام حالات رقم تھے جن سے انہیں گزشتہ دو ہفتوں میں سابقہ پڑا تھا۔

باہر بڑے پیمانے پر فائرنگ ہو رہی تھی لیکن بیرک اور بالکونی میں جابجا بکھرے ہوئے افراد اس پر قطعی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ اس کے بجائے انہوں نے نئے آنے والے کو سر اٹھا کر ضرور دیکھا تھا۔ ہم بالکونی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ کئی گولیاں زن کی آواز کے ساتھ ہمارے سروں پر سے گزرتی چلی گئیں۔ میں لڑکھڑا گیا اور میرے چہرے پر بدحواسی نظر آنے لگی۔

مور مسکرا دیا۔ ''تم جلد ہی اس کے عادی ہو جاؤ گے کرنل!'' وہ بولا۔ یہ باغی.....''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ بالکونی سے کچھ ہی فاصلے پر ایک گولہ گر کر پھٹا۔ گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھا جس میں ارد گرد کی تمام چیزیں چھپ گئیں۔ ایک طویل اور کربناک چیخ بھی ابھری جس سے اندازہ ہوا تھا کہ شاید کوئی زخمی ہوا ہے۔

چند لمحوں بعد جب گرد چھٹی تو اس جگہ جہاں گولہ پھٹا تھا، کے قریب ہی ایک سفید فام دکھائی دیا۔ جو زمین پر پڑا تھا۔ اس کے کئی اعضا غائب تھے اور زخموں سے خون بہ بہ کر مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں۔

کیپٹن مور نے چلا کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور چھ افراد لاش کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے اسے اٹھایا اور کچھ فاصلے پر موجود ایک کنویں میں پھینک دیا۔

''یہ ہمارا قبرستان ہے'' مجھے کنویں کی طرف متوجہ دیکھ کر مور بولا۔ ''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہم ہر دو گھنٹے کے بعد کسی نہ کسی کو اس میں پھینکتے ہیں .....وہ ادھر ایک اور کنواں ہے جس سے ہم پینے کا پانی حاصل کرتے ہیں لیکن دن کی روشنی میں ہم اس کے قریب بھی نہیں جا سکتے کیونکہ وہ براہِ راست باغیوں کی زد میں ہے۔ ایک ہفتے تک جیک میک لوپ یہ کام انجام دیتا رہا لیکن پھر وہ باغیوں کے ہتھے چڑھ گیا' خدا جانے پانی کے حصول کے پیچھے ہم نے کتنے آدمی گنوائے ہیں۔''

مجھے اس کی بات چیت کا انداز بڑا عجیب سا لگا۔ اس کا گیریژن موت کے دہانے پر کھڑا تھا اور وہ نہایت ٹھہرے ہوئے انداز میں مجھے مختلف چیزوں کے بارے میں تفصیلات بتا رہا تھا۔ میں دیر تک اسے برداشت کرتا رہا لیکن آخر کار پھٹ پڑا۔

''یہ سب مایوس کن نہیں؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''کیا وہیلر نے صلح کی کوشش نہیں کی؟''

وہ بے اختیار ہنس دیا۔ ''صلح؟ لیکن کس کے ساتھ؟ نانا صاحب؟ تم میرٹھ میں تھے کیا انہوں

نے صلح کی تھی؟ باغی صلح پر تیار نہیں۔ وہ صرف اور صرف ہماری موت چاہتے ہیں انہوں نے شہر میں موجود ہر سفید فام کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور اس میں ان کے کئی ہم وطن بھی مارے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہی لوگوں کی دکانوں پر لوٹ مار کی اور انہیں نذر آتش کر دیا۔ نانا صاحب ہر اس شخص کو گولی سے اڑا رہا ہے جو سرکار کا وفادار ہے' نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''صلح کا کوئی امکان نہیں۔''

''تب پھر کیا ہوگا۔'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دریافت کیا۔

''اگر آئندہ تین دنوں میں امدادی دستے آ گئے تو بہتر ہے بصورتِ دیگر گولہ بارود کی کمی کے باعث باغی ہم پر غالب آ جائیں گے' اور پھر.....'' اس نے کندھے اچکائے ''لیکن ہم عورتوں کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کرتے بلکہ یہی کہتے ہیں کہ لارنس امدادی دستوں کے ہمراہ کسی بھی وقت کانپور پہنچنے والا ہے۔''

میں بھی ان کی باتوں کو سمجھ رہا تھا لیکن ایک آفیسر کے منہ سے یہ باتیں بہت عجیب سی لگیں۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ میں خود بھی بھاگ نہیں سکتا تھا۔ پہلی وجہ تو گھٹنے کا زخم تھا جب کہ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں ایک سینئر افسر تھا اور مجھے خود کو افسر ثابت کرنا تھا جیسے وہیلر' مور اور وائی برٹ تھے۔ میری کوشش تھی کہ میں اس میں کامیاب بھی رہوں کہ میں مرنے کے لیے تیار ہوں اور لڑائی سے ڈرتا نہیں۔

میں خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے میں مصروف ہو گیا۔ تاکہ مجھے اس خونی جہنم میں خوف محسوس نہ ہو جہاں ہر ایک سیکنڈ بعد کوئی نہ کوئی گولی آ کر بیرکوں کی دیواروں سے ٹکراتی تھی۔ کسی نہ کسی کی چیخ سنائی دیتی۔ پھر اسٹریچر پارٹیاں مستعد ہو جاتیں۔ زخمیوں کو طبی امداد فراہم کی جاتی تھی اور مرنے والوں کو کنویں میں پھینک دیا جاتا تھا۔

اور اس ساری صورتِ حال اور حالات میں مور بدستور اپنے زخمی بازو کو لپیٹے لوگوں کو لطیفے سنا رہا تھا۔ جب کہ وہیلر وقتاً فوقتاً احکامات صادر کر رہا تھا اور بالکونی سے باغیوں کی پوزیشنوں کی نگرانی کرتا جا رہا تھا۔

محبوس لوگ بھی اپنی اپنی حالات میں مگن تھے۔ سپاہی ہاتھوں میں رائفلیں لیے کسی بھی حملے کے لیے تیار تھے۔ عورتیں خوف زدہ تو تھیں لیکن کھانا پکانے کا کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا

تھا۔ جب کہ بچے ان سب باتوں سے بے پروا کھیل کود میں مشغول تھے۔ ایک نوجوان لڑکی بطورِ خاص بچوں کو مصروف رکھے ہوئے تھی۔ شاید وہ کوئی آیا تھی۔

اور یہ سب اپنی موت کے منتظر تھے' کچھ اس بات سے آگاہ بھی تھے لیکن میں نے کسی کی زبان سے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں سنی تھی۔

''انہیں دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔'' مور نے مجھ سے کہا تھا۔ ''خاص طور پر مجھے ان عورتوں کے گزارے ہوئے سہانے دن بہت یاد آتے ہیں جب یہ اپنے بنگلوں میں بیٹھی اپنی پڑوسنوں کی برائیوں میں مصروف ہوتی تھیں' لیکن اب تو یوں لگتا ہے کہ یہ اگر زندہ بچ گئیں تو دوبارہ کبھی ایسی محفل نہ جما پائیں گی۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' ڈیلا فوز نامی ایک آفیسر بولا ''یہ سب ختم ہونے کے ایک ہفتے کے اندر اندر یہ لیڈی وہیلر کے ٹکڑے گلیوں میں گھسیٹنے لگیں گی۔''

میں خفیف سے انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔ ظاہر ہے عورت کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ بہت جلد اپنے تلخ ماضی کو فراموش کر دیتی ہے اور پھر موجودہ خونی حالات ایسے بھی نہیں تھے کہ جنہیں زندگی بھر یاد رکھا جاتا۔

جنگ کے ستائے ہوئے اور باغیوں سے خوفزدہ انہی لوگوں میں میری ملاقات ہیری ایسٹ سے ہوئی۔ دو اور آفیسر جن کے نام وہائٹنگ اور تھامسن تھے' میرے قریب ہی موجود تھے جب کے بیلا بلیئر نامی ایک خوبصورت سی لڑکی ذرا فاصلے پر بیٹھی ہماری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو فلیش مین!'' ایسٹ نے مجھے پہچان کر بولنے میں پہل کی تھی۔

''ہیلو' ینگ ایسٹ میں نے بھی جواباً گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ یہ وہ شخص تھا جو جنگِ کابل میں مجھے زخمی حالت میں چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا اور میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچائی تھی۔

''تم سے مل کر بے حد خوشی ہوئی' فلیش مین!'' وہ دوبارہ بولا۔ ''میں تمہیں چھوڑ کر آنے پر آج تک شرمندہ ہوں۔''

''کوئی بات نہیں' اب تو میں اسے بھول چکا ہوں۔'' میں نے رسماً کہا حالانکہ وہ کربناک لمحات ایک ایک صدی کے برابر تھے اور جزئیات سمیت مجھے یاد تھے۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''لیکن فکر نہ کرو' ایسٹ یہاں اگر ایسا برا وقت آیا تو میں تمہیں چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا۔''

اس کا سر جھک گیا اور رنگ پیلا پڑ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایسا میری طنزیہ گفتگو سے ہوا تھا یا حالات کی سنگینی نے اس کے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا۔

میں اسے مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے وہاں سے چلا آیا۔ وہائٹنگ اور تھامسن خاموشی سے یہ سب دیکھتے رہے لیکن شام کو دونوں میرے پاس آئے۔ انہوں نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے جذبے کی تعریف کی۔ بیلا بلیئر نے بھی میرا جملہ سنا تھا۔ وہ بھی شام ہوتے ہی میرے پاس آئی اور میرے رخسار کا بوسہ لے کر جلدی سے چلی گئی میرا دل خوش ہو گیا۔ واقعی کبھی کبھی کوئی ایک جملہ کسی دوسرے کا دل جیت لیا کرتا ہے اور مجھے لگتا تھا کہ میں نے بیلا کا دل جیت لیا ہے۔

اس رات میں ٹھیک طرح سو بھی نہیں سکا تھا۔ ایک تو میری سوچیں مجھے پریشان کر رہی تھیں اور دوسرے وقتاً فوقتاً دیواروں سے ٹکرانے والی گولیوں نے دہلا رکھا تھا۔ میں کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتا اور کبھی لیٹ کر یک ٹک چھت کو گھورنے لگتا۔

رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی لیکن جلد ہی کسی نے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔ میرے اردگرد قیامت کا شور برپا تھا۔ ایک تیز آواز سب پر حاوی تھی۔ ''اسٹینڈ ٹو..... لوڈنگ پارٹیز' ڈیئر .....'' فوراً ہی ایک بگل بجنا شروع ہو گیا اور لوگوں نے اِدھر اُدھر دوڑنا بھاگنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے قریبی شخص سے دریافت کیا تو اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا اور خود دیکھنے کا مشورہ دیا۔

میں باہر نکل آیا۔ صبح کا ملگجا اجالا پھیل رہا تھا اور سامنے کے میدان میں باغیوں کی ایک کثیر تعداد دکھائی دے رہی تھی۔ بلا مبالغہ وہ ہزاروں تھے۔ زیادہ تر گھڑسوار تھے لیکن پیدل دستے بھی نظر آ رہے تھے۔

میں ابھی ان کا جائزہ لینے میں ہی مصروف تھا کہ گن پوزیشنوں کی طرف سے فائرنگ

ہونے لگی جس کے بعد توپوں کے گولوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔ بیرکوں کے اردگرد مٹی کا جیسے طوفان آ گیا۔ بڑے چیخنے لگے جب کہ بچوں نے بری طرح رونا اور شور مچانا شروع کر دیا۔

بیرکوں کے سامنے لوڈنگ پارٹیاں سویلین' عورتیں اور بہشتی جمع ہونے لگے تھے۔ جنرل وہیلر' مور کے ساتھ وہاں موجود تھا اور بلند آواز میں احکامات دے رہا تھا۔ عقب میں ٹوٹی ہوئی بیرک پر پھٹا ہوا یونین جیک لہرا رہا تھا۔

''یہ لوگ ایک بڑا حملہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں'' میرے قریب کھڑے ہوئے آدمی نے کہا ''56 ویں مقامی انفنٹری' مدراس فرنیٹر' بنگال کیولری .....ان میں میرے کئی سابق ساتھی بھی موجود ہیں۔ جو میرے شانے سے شانہ ملا کر چلتے رہے ہیں لیکن اب ہم ہی پر گولیاں برسانے آئے ہیں۔ ٹھیک ہے دوستو! تمہارا پرانا رائیڈنگ ماسٹر تمہارا منتظر ہے۔'' اس نے اپنی رائفل کو تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

باغیوں کی توپیں اب پوری رفتار کے ساتھ آگ اگل رہی تھیں۔ گولیاں بھی برسات کی طرح ہمارے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ میں نے بھی اپنے ریوالور کو لوڈ کر کے دائیں ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میرے قریب ہی جنرل وہیلر اپنی بھاری بھرکم آواز میں چلا چلا کر احکامات دے رہا تھا۔

''تمام رائفلیں لوڈ کر لی جائیں.....ایک آدمی کے لیے تین تین رائفلیں ہونی چاہئیں' آل رائٹ! ڈیلافوز! مور! جنوبی سمت سے ہر دوسرے آدمی کو بلا لو۔ فائر پارٹیز اسٹینڈ بائی رہیں۔ سارجنٹ گریڈی! ہر دس گز کے فاصلے پر ایک آدمی بینڈیج وغیرہ لیے موجود رہے.....''

دشمنوں کی فائرنگ میں اس کی آواز بار بار دب جاتی تھی۔ گولہ باری کی وجہ سے اتنی مٹی اڑ رہی تھی کہ قریبی آدمی بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہم زمین پر لیٹ گئے تھے اور اپنے اپنے ہتھیار دشمنوں کی طرف تان لیے تھے۔ کوئی گھسٹتا ہوا آگے آیا اور اس نے رائفلیں میرے برابر رکھ دیں۔ میں نے حیرت سے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا وہ بیلا بلیئر تھی۔ وہی خوبصورت سی لڑکی جس نے میرے رخسار کا بوسہ لیا تھا۔

''آل اسٹینڈنگ ٹو!'' وہیلر دھاڑا وہ اب بھی کسی چٹان کی مانند میدان میں ڈٹا کھڑا تھا۔ اس کے سفید بال منتشر تھے اور چہرے پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں

اپنا ریوالور تھام رکھا تھا جب کہ کمر سے بندھی تلوار کی نوک زمین کی طرف تھی۔ ''ماسٹرز' ہوشیار.....''

اس کے اگلے الفاظ شدید فائرنگ میں دب گئے۔ گولیاں بیرکوں کی دیواروں پر اولوں کی طرح برسنے لگیں۔ نیچے کی طرف لائنوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کئی چیخیں سنائی دیں اور پھر کسی نے چیخ کر اسٹریچر لانے کو کہا اور کئی افراد اسٹریچرز لے کر اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

''تمام لوگ تیار رہیں'' وہیلر کی آواز پھر سنائی دی ''بالکونی پر موجود رائفل مین فائر کے لیے میرے احکامات کا انتظار کریں.....''

میں نے بالکونی کی گگر پر سے جھانکا۔ میدان کی پرلی طرف اچانک خاموشی چھا گئی تھی لیکن یہ سناٹا محض چند ثانیوں پر محیط تھا کیونکہ فوراً ہی گھوڑوں کے سموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ سینکڑوں گھڑ سوار بیک وقت تباہ حال عمارتوں کی طرف بڑھے۔ اس سے پہلے کہ وہ فائرنگ رینج میں آتے' نیچے سے کسی نے فائر کھول دیا۔

''کون بے وقوف ہے'' وہیلر فوراً دھاڑا ''کیا تم نے سنا نہیں کہ میں نے فائرنگ سے منع کیا تھا۔'' رائفل خاموش ہوگئی۔

میں نے دوبارہ میدان کی طرف دیکھا۔ گھوڑے اب تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں ان کی تعداد کو دیکھتے ہوئے فوراً سمجھ گیا تھا کہ آخری وقت آن پہنچا ہے۔ ان کے عقب میں پیدل بھی تھے جو تلواریں لہرا رہے تھے اور اپنے گھڑ سواروں کی ہمت بندھانے کے لیے نعرے لگا رہے تھے۔

میں نے ریوالور رکھ کر رائفل اٹھائی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا لیکن میری نگاہیں سامنے کی طرف مرکوز تھیں۔

''نشانے لے لیے جائیں۔'' وہیلر چلایا ''ہر گولی کارآمد ہونی چاہیے لیکن ابھی فائرنگ نہیں ہوگی۔''

گھڑ سوار اب تین سو گز دور تھے۔ سواروں کے ہاتھوں میں رائفلیں لہرا رہی تھیں اور وہ چیختے چلاتے آگے ہی آگے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ میری انگلی کئی بار ٹرائیگر پر مچلی لیکن مجھے وہیلر کے احکامات کا انتظار تھا۔

''فائر!'' بالآخر وہیلر کی آواز سنائی دی۔

بیرکیں بیک وقت کئی رائفلوں کے چلنے سے گونج اٹھیں۔ موت اجتماعی گولیوں کی صورت ان کی طرف بڑھی لیکن انہیں روک نہیں سکی۔ کئی گھوڑے اور ان کے سوار زمین پر آ رہے ہمارے نشانہ بازوں نے دوسری لوڈ رائفلیں اٹھائیں۔ کچھ اور سوار مارے گئے لیکن باقیوں کی پیش قدمی جاری رہی۔ وہ پاگلوں کی طرح چیختے چنگھاڑتے اور گولیاں برساتے آگے ہی آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

بیلا بلیئر میرے پہلو میں موجود تھی۔ میں گولی چلا کر رائفل اس کے سامنے ڈال دیتا اور وہ فوراً اسے لوڈ کر دیتی۔ میں نے کئی گھڑ سواروں کو گرایا تھا لیکن ہم ان میں سے نصف کو بھی کم نہ کر سکے تھے۔ تین تو براہِ راست میری پوزیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے رائفل چھوڑ کر ریوالور نکال لیا۔ پہلے گھڑ سوار کے سینے میں گولی لگی اور وہ کاٹھی پر ہی اوندھا ہو گیا۔ دوسرا سوار سر پر گولی کھا کر گھوڑے سے نیچے آ رہا۔ تیسرے کا گھوڑا گولی لگنے سے زمین پر گرا تو سوار بھی نیچے لڑھک آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر پوزیشن سنبھالتا میری دو گولیاں اس کی کمر کے پار ہو چکی تھیں۔

میرے عقب میں وہیلر بدستور چلا رہا تھا۔ میں نے پھر رائفل سنبھالی اور گھڑ سواروں نے دوبارہ گرنا شروع کر دیا۔ اب وہ سو گز کے فاصلے پر رک کر اپنی صفیں ترتیب دے رہے تھے۔ ان کے عقب میں دور دور تک گھوڑوں اور ان کے سواروں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

بہشتی میرے قریب آیا تو میں نے پینے کے لیے پانی مانگا لیکن ابھی ایک ہی گھونٹ پینے پایا تھا کہ وہیلر کی دھاڑ سنائی دی۔ ''فائر.....! گھوڑوں کا نشانہ لیا جائے..... یاد رکھو کہ ہتھیار نہیں ڈالے جائیں گے..... ریڈی..... فائر.....!''

دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ دشمن اس لحاظ سے کامیاب رہے کہ انہوں نے ایک بیرک کی بغلی دیوار کو منہدم کر ڈالا۔ ہم نے کئی سواروں کو گرایا لیکن انہیں آگے آنے سے روکنے میں ناکام رہے۔ کوئی درجن بھر سوار بیک وقت بالکونی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے دو کو گولی مار کر نیچے گرایا۔ تیسرے نے مجھ پر وار کیا۔ شاید رائفل کا دستہ میرے سر پر مارا تھا۔ میں نے ذرا سی جھکائی دی جس کی وجہ سے چوٹ میرے کندھے پر لگی لیکن اس کے باوجود میں اپنا

توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پیٹ کے بل زمین پر آ رہا۔ مجھے پوری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے میں مجھے صرف وہیلر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''سیز فائر _____ سیز فائر! اسٹریچر زلاؤ!'' زخمیوں کا شور' مرنے والوں کے عزیز و اقارب کی آہ و بکا اور بیرکوں کے اردگرد مٹی کا طوفان اور گاڑھا سیاہ دھواں' جواب آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ زخمی اور مردہ افراد ہر طرف دکھائی دے رہے تھے۔ میرے قریب دس گز کے فاصلہ پر درجن بھر باغی آڑے ترچھے پڑے تھے۔ وہ اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں۔

وہیلر خود زخمی تھا لیکن ایک انگریز سویلین کو سہارا دے کر اس سمت لے جا رہا تھا جدھر فرسٹ ایڈ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ بیلا بلیئر مر چکی تھی۔ وہ پہلو کے بل لیٹی ہوئی تھی لیکن اس کے ہاتھ اب بھی ایک رائفل کو تھامے ہوئے تھے۔ اس کے پیٹ میں خنجر گھونپا گیا تھا۔

عقب میں ایک کراہ سنائی دی تو میں پلٹا۔ وہ رائیڈنگ ماسٹر تھا۔ اس کے بدن کا اگلا حصہ خون میں تربہ تر تھا اور وہ گھسٹ کر پانی کی ایک چھاگل کی طرف بڑھ رہا تھا جو اس سے کچھ دور زمین پر پڑی تھی۔

میں فوراً اس کی مدد کو پہنچا اور چھاگل اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دی لیکن موت نے اسے ایک گھونٹ بھرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ اس کے جسم نے ایک جھٹکا لیا اور ساکت ہو گیا۔

میں کئی منٹ تک افسردہ اسے گھورتا رہا اور پھر زخمیوں کی کراہوں اور چیخ و پکار نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔ وہاں اس جیسے کئی اور بھی موجود تھے۔

زمین پر خاموش اور آڑے ترچھے پڑے کئی لوگوں کو میں پہچانتا تھا لیکن اب ہیلو کہہ کر ان سے مصافحہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایسی دنیا میں جا چکے تھے جہاں اس طرح کے تکلفات کی قطعی کوئی ضرورت نہ تھی۔

وہیلر نے اپنے کچھ آدمیوں کو زخمیوں کی مرہم پٹی کے کام پر لگا دیا تھا جب کہ باقیوں کو مرنے والوں کا اسلحہ اکٹھا کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

میں نے اس میدان کی طرف دیکھا جس کی دوسری جانب باغی ایک بار پھر خود کو مجتمع

کر رہے تھے تا کہ تباہ شدہ کانپور برٹش گیریژن پر آخری اور کاری ضرب لگا سکیں۔ ان کا جھنڈا اوسط میں لہرا رہا تھا جب کہ توپوں کے دہانے آگ اگلنے کو تیار تھے کسی بھی لمحے ہم پر موت کی بارش شروع ہو سکتی تھی اور میں جانتا تھا کہ انہوں نے اگر اب پیش قدمی شروع کی تو ہم انہیں روکنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

تیئیس جون کی لڑائی میں ہمارا جانی نقصان بے شک خاصا ہوا لیکن باغی بھی اس سے بچ نہیں سکے تھے۔ میدان ان کی لاشوں سے اٹا ہوا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مزید حملے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔ دو دن تک انہوں نے شدید فائرنگ اور گولہ باری کی تھی۔ جس کے نتیجے میں ہمارے تین سو سے زائد افراد زخمی ہو کر بیرکوں میں پڑے کراہ رہے تھے۔

عورتیں اور بچے بری طرح خوف زدہ تھے کیونکہ وقفے وقفے سے اموات ہو رہی تھیں۔ آفیسروں کے حوصلے پست ہو رہے تھے اور ایک وقت ایسا آیا کہ خود جنرل وہیلر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں نے لارنس کو آخری پیغام روانہ کر دیا ہے۔'' اس نے دوسری شب ہمیں یعنی سینئر افراد کو آگاہ کیا۔ ''میں نے اسے بتایا ہے کہ اب ہمارے پاس حوصلوں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا۔ ہماری حالت پنجرے میں بند چوہوں سے بھی بدتر ہے اب ہماری آخری امید یہی ہے کہ باغی ہم پر حملہ کریں اور ہمیں ختم کر دیں۔ کم از کم اس طرح ہمیں اپنے بچوں اور عورتوں کو سسک سسک کر مرتے دیکھنے سے تو نجات ملے گی۔''

میں میز کے وسط میں جلتی ہوئی موم شمع کی روشنی میں لوگوں کے بنتے بگڑتے چہرے دیکھ رہا تھا۔ جن پر مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے تھے۔ ایک آدھ کی سسکی بھی سنائی دی تھی۔ بالآخر وائی برٹ نے پوچھا کہ کیا لارنس کے آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

وہیلر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ممکن ہوا تو ضرور آئے گا لیکن اگر وہ فوری طور پر بھی روانہ ہو جائے تو دو دن سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتا۔ اور تب تک ہماری لاشیں چیل کوؤں کے کام آ چکی ہوں گی۔ ہم اور ہمارا مستقبل اب کلی طور پر خدا کے ہاتھوں میں ہے۔ سو مجھے خبر نہیں کہ ابھی چند ہی

منٹ بعد کیا ہونے والا ہے؟''

مجھے بھی اس بات کا علم تھا لیکن وہاں کچھ لوگ ایسے بھی موجود تھے جنہیں کبوتر کی طرح بلی کو سامنے دیکھ کر آنکھیں بند کرنے کی عادت تھی۔ وہ بے مقصد اور لاحاصل بحث میں الجھ گئے تو میں ان کے درمیان سے اٹھ آیا۔ دلی طور پر میں بھی انہی کی طرح خوفزدہ تھا لیکن میری کوشش تھی کہ میرے انداز سے ایسی کوئی بات بھی ظاہر نہ ہو۔

ابھی میں اپنے اندرونی خوف سے جنگ لڑ ہی رہا تھا کہ ایسٹ میرے پاس آ گیا۔ ''کیا میں تم سے بات کر سکتا ہوں؟'' اس نے دھیمے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

''کیوں نہیں!'' میں نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

''مم..... مجھے..... تت..... تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''اوہ'' میں نے ایک طویل سانس لی اور تاریکی میں اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ ''ایسی کیا.....؟''

''پلیز' کرنل'' اس نے مجھے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ ''یہ لہجہ استعمال نہ کرو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ وہ میری مجبوری تھی لیکن اب مجھے معاف کر دو۔ مجھے اپنے سابقہ طرز عمل پر بے حد ندامت ہے۔''

میں خاموش رہا۔ دراصل فوری طور پر میرے ذہن میں یہ سوچ ابھری تھی کہ فی الوقت تو مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ میں اگر اسے معاف نہ بھی کرتا تو بھلا اس کا کیا بگڑتا لیکن شاید وہ ضمیر کی کسک کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھ تک آیا تھا اور میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے ایسٹ!'' بالآخر میں دھیرے سے بولا۔ ''میں صدق دل سے تمہیں معاف کرتا ہوں۔''

''تھینک یو کرنل!'' اس نے اس بات کا انتظار بھی نہیں کیا کہ شاید میں کچھ اور بھی کہوں۔ اس نے تیزی سے جھک کر میرا ہاتھ چوم لیا اور واپس چلا گیا۔ (15)

میں کچھ دیر اسے تاریکی میں خود سے دور ہوتے دیکھتا رہا اور پھر اپنی سوچوں میں کھو گیا۔ اس وقت میرے سامنے سب سے اہم معاملہ یہاں رکنے یا چلے جانے کا فیصلہ کرنا تھا۔ دل کے کسی

کونے سے فرار ہو جانے کی آواز آئی تھی لیکن میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی رکنے کو ترجیح دی اور بعد میں ثابت ہوا کہ میرا یہ فیصلہ بہتر تھا ورنہ میں اگلے روز رونما ہونے والا معجزہ کبھی نہ دیکھ پاتا۔

◈◈◈

وہ کسی طرف سے بھی قاصد دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کارکشا دو مقامی کھینچ رہے تھے اور ایک حوالدار آگے آگے سفید رنگ کا جھنڈا لیے چل رہا تھا۔ یہی بات اسے قاصد ثابت کر رہی تھی۔ وہیلر نے اپنے آدمیوں کو اس کے عقب میں کڑی نظر رکھنے کی ہدایت کی اور خود مور کو ساتھ لے کر اس سے ملنے چل دیا لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے اور وائی برٹ کو بھی آنے والی قاصد سے ہونے والی بات چیت میں شمولیت کے لیے بلایا گیا۔

وہیلر اور اس کے سینئر آدمی ایک بیرک کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے سائے تلے موجود تھے۔ جبکہ عورت بدستور اپنے رکشا پر بیٹھی تھی۔ وہیلر کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا لیکن اس کی نگاہیں کاغذ کے بجائے عورت پر مرکوز تھیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کوئی کہہ رہا تھا۔ ''میں اس کے ایک لفظ پر بھی اعتماد نہیں کرتا۔ آخر وہ ایسے وقت میں ہم سے ایسا سلوک کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''

وہیلر نے نفی میں سر ہلایا اور کاغذ کا پرزہ میری طرف بڑھا دیا۔ ''اسے پڑھو۔'' وہ بولا ''اگر یہ درست ہے تو نانا ہم سے بعض شرائط طے کرنا چاہتا ہے۔''

میں نے اور وائی برٹ نے کاغذ پر لکھا ہوا مختصر سا پیغام پڑھا۔ عام فہم انگریزی میں وہیلر کو مخاطب کیا گیا تھا۔

''ہر میجسٹی کے ایسے تمام افراد جو لارڈ ڈلہوزی کے اقدامات سے متفق نہیں اور ہتھیار ڈالنا چاہتے ہیں انہیں الہٰ باد تک محفوظ سفر کی ضمانت دی جاتی ہے۔''

اس پر نانا صاحب کی طرف سے کسی کے دستخط تھے۔ میں نام نہیں پڑھ سکا لیکن وائی برٹ نے زیر لب اسے دہرایا۔ ''عظیم اللہ خان'' (16) اس نے پہلے وہیلر کو اور پھر بوڑھی عورت کو دیکھا لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا۔ وہیلر بول اٹھا۔

''یہ مسز جیکب ہیں۔'' اُس نے ہمیں آگاہ کیا۔ ''یہ خاتون مرہٹہ پیشوا نانا صاحب کی جانب سے صلح کا پیغام لائی ہیں جب کہ اس پر نانا صاحب کے انتہائی معتمد اور قابل اعتماد رہنما عظیم اللہ

خان کے دستخط ہیں، نانا صاحب کے نہیں۔''

مسز جیکب نے سر کو ہلکا سا خم دے کر اس کی تائید کی۔

''لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔'' وہیلر نے اپنی بات جاری رکھی البتہ اس نے عورت کی طرف پشت کر لی تا کہ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکے۔ ''آخر اسے یہ پیشکش کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ جبکہ یہ بات وہ جانتا ہے کہ ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔ اسے صرف انتظار کرنا چاہیے''۔

شاید سر! ''وائی برٹ نے اس سے اتفاق کیا۔'' وہ شاید ہماری کم ہوتی ہوئی تعداد کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اب تو ہماری عورتوں اور بچوں.....''

وہاں موجود سب لوگوں کو جیسے زبان مل گئی یہ یک وقت وہ اعتراضات کرنے لگے اور ان شرائط کی مخالفت کرنے لگے جو ابھی طے بھی نہیں ہوئی تھیں۔ میں خاموشی سے ان کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ البتہ میری یہ کوشش تھی کہ خود میرے رویے سے کوئی بات ظاہر نہ ہونے پائے۔

میرے اندازے کے مطابق وہیلر کے پاس ان شرائط کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کم از کم عورتوں اور بچوں کے سروں سے موت کی لٹکی ہوئی تلوار ہٹانے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ ممکن ہے اسی طرح کانپور میں انگریز کی رہی سہی عزت بچ جاتی۔

جنرل وہیلر نے بھی میری خاموشی کو محسوس کیا چنانچہ اس نے براہ راست مجھے مخاطب کیا ''تمہارا کیا خیال ہے کرنل؟''

''میرا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ کہہ دوں کہ بے وقوف فوراً اسے قبول کر لو تا کہ ہم پیٹ کے بل رینگ رینگ کر الہٰ باد پہنچ جائیں لیکن اس کے بجائے میں نے اپنا لہجہ ماتحتوں جیسا ہی رکھا تھا۔

''یہ ایک پیشکش سے زیادہ نہیں سر! اس لیے جب تک اس کی سچائی کو پرکھ نہیں لیا جاتا کوئی فیصلہ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟''

میری بات نے سب کو خاموش کر دیا۔ ''یہی بہتر ہے۔'' وہیلر نے بھی میری تائید کی ''لیکن.....''

''کسی نہ کسی کو نانا صاحب سے بات ضرور کرنی چاہیے۔'' میں نے وہیلر کا جملہ اپنے انداز میں پورا کیا۔ ''ہمیں اس سے مل کر اس بات کا اندازہ کرنا چاہیے کہ اس کی پیشکش کے پیچھے در

حقیقت کون سے عوامل کارفرما ہیں؟''

''تب پھر تم ہی یہ ذمے داری پوری کرو۔'' وہیلر میرے خاموش ہوتے ہی بول پڑا۔

''تم مور کو ساتھ لے کر نانا صاحب کے پاس چلے جاؤ اور اپنے شکوک وشبہات دور کرلو۔''

کسی نے بھی جنرل وہیلر کی رائے پر اعتراض نہیں کیا چنانچہ دوپہر کو میں اور مور باغیوں کے پڑاؤ کی جانب روانہ ہوئے۔ مسز جیکب اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ تھی۔ ہمیں باغیوں نے اپنی حفاظت میں نانا صاحب تک پہنچایا۔

وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں نصب خیمے کے باہر ہمارا منتظر تھا اس کے اردگرد اس کے معتمد تھے اور مرہٹہ سپاہیوں نے ایک دائرے کی صورت اسے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔ نانا کا چہرہ بھاری اور مونچھیں بڑی بڑی تھیں۔ اس کے چہرے پر بلا کی سختی تھی۔ وہ ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے برابر ایک طویل قامت اور خوبصورت عورت براجمان تھی۔ جسے وہ سلطانہ عادلہ کے نام سے مخاطب کررہا تھا۔ بائیں جانب ایک اور قوی الجثہ شخص موجود تھا جو نانا کا دایاں بازو تھا۔ وہ تانتیا توپ تھا۔

لیکن ہمیں جس شخص نے خط بھیجا تھا وہ ایک طویل قامت اور خوبصورت جوان تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ یعنی عظیم اللہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ میں نے دونوں کا تعارف کرایا اور عظیم اللہ خان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔

''اوہ!'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''تو یہ تم ہو کرنل فلیش! جلدی سے بتاؤ میرے پرانے دوست مسٹر ولیم ہاوڈرسل کے کیا حال ہیں؟''

اب حیران ہونے کی باری میری تھی کیونکہ اس وقت تک میں یہ اندازہ نہیں کرپایا تھا کہ یہ وہی عظیم اللہ ہے جو بڑی روانی کے ساتھ فرانسیسی اور انگریزی بولتا ہے۔ وہ لندن میں بعض سفارتی ذمے داریوں کے سلسلے میں تعینات رہا تھا اور وہاں کی اعلیٰ سوسائٹی میں خاصا مقبول تھا۔ اس موقع پر وہ نانا کے مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا کیونکہ خود نانا' انگریزی سے نابلد تھا۔

میں نے جان پہچان کے باوجود انتہائی سرد لہجے میں اسے بتایا کہ ہم اس کے آقا کی تجویز پر مزید بات چیت کے لیے یہاں آئے ہیں۔

''جنرل وہیلر کو وہ خط بھیجے جانے کا واحد مقصد یہاں ہونے والی خون ریزی اور قتل وغارت

گری کا خاتمہ تھا۔'' اس نے فوراً اپنی تجویز کا دفاع کیا ''میں سمجھتا ہوں.....''

''لیکن تم لوگوں کو اس خونریزی کا پہلے خیال کیوں نہیں آیا؟'' مور نے دخل اندازی کی۔

عظیم اللہ مسکرا دیا۔ ''ہم فوجی سیاست پر بات نہیں کر رہے کیپٹن مور''۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''حقیقت کی دنیا میں رہ کر صورت حال پر غور کرو جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تمہاری مزاحمت دم توڑ چکی ہے چنانچہ اگر تم لوگ کانپور چھوڑنے پر رضامند ہو جاؤ تو ہز ہائی نس کو خوشی ہوگی کیونکہ وہ مزید قتل عام کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم تمہارے گیریژن کو پورے اعزاز کے ساتھ رخصت کریں گے اور ضروری سفر کی ضمانت دیں گے.....''

نانا شاید اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ عظیم اللہ خان کیا کہہ رہا ہے چنانچہ وہ آگے کو جھکا اور مسکراتے ہوئے عظیم اللہ کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ وہ مرہٹہ زبان میں بولا تھا۔ عظیم اللہ نے سر ہلایا اور اپنی بات جاری رکھی۔

''ان کا کہنا ہے کہ تمہارے زخمیوں کو دریا تک پہنچانے کے لیے خچر اکٹھے کیے جا رہے ہیں اور کشتیاں تمہیں الہ باد لے جانے کو تیار کھڑی ہیں۔''

عظیم اللہ نے بھویں اچکائیں۔ ''اس میں بظاہر شبہے کی کوئی بات نہیں اگر ہم تم لوگوں کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہوں تو تم پر حملہ کرتے یا انتظار کرتے۔ ہم تمہارے حالات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ میری بات کا یقین کرو ہم یہ پیشکش صرف اور صرف انسانی ہمدردی کی بنا.....''

عظیم اللہ نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک بار پھر نانا سے بات کی اور نئے سرے سے گویا ہوا ''.....لیکن اگر ہز ہائی نس کے وعدے پر آپ کو اعتبار نہیں تو انہیں تم لوگوں کے ذاتی اسلحہ ساتھ لے جانے پر بھی اعتراض نہ ہوگا.....کیا ایک آدمی کے لیے بیس راؤنڈ کافی ہوں گے۔ اس میں تم لوگوں کو صرف یہ نقصان ہوگا کہ کوئی آڑ دستیاب نہیں ہوگی لیکن دوستو! میں بار بار اس امر کی یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ ہمارا مقصد نقصان پہنچانا نہیں۔''

مجھے اس کی کسی بات پر یقین نہیں آیا لیکن میں اس کی تائید کرنے پر مجبور تھا۔ برطانوی گیریژن کو مکمل طور پر تباہ کرنا ایک الگ بات تھی لیکن وہ یہ بغیر کسی تردد کے بھی کر سکتے تھے۔

نانا صاحب ایک بار پھر مرہٹہ زبان میں عظیم اللہ خان سے بات چیت میں مصروف ہو گیا جس کے خاتمے پر وہ ہم سے مخاطب ہوا۔ ''ہز ہائی نس کا کہنا ہے کہ تم ان کی طرف سے جنرل وہیلر کو

ہر قسم کے تحفظ کی یقین دہانی کراؤ' میں خود بھی کل جنرل کے پاس حاضر ہوں گا تا کہ ان کے دل میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔''

میں اور مور مزید کچھ دیر باغیوں کے پڑاؤ میں رکے پھر واپس آ گئے۔ جب ہم نے عظیم اللہ خان سے ہونے والی بات چیت سے جنرل وہیلر کو آگاہ کیا تو اس نے مزید مشوروں کے لیے سینئر افسران (17) کا اجلاس بلا لیا۔ ہم اس بیرک میں موجود تھے جس کے نصف سے زائد حصے میں زخمی پڑے کراہ رہے تھے وہ تکلیف سے چیخ رہے تھے اور ہم پر جوش انداز میں نانا صاحب کی تجویز پر بحث میں مصروف تھے۔

میں نے اس مباحثے سے ایک بات کا اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ جنرل وہیلر کو اب بھی اس پیشکش سے غداری کی بو آ رہی تھی جبکہ نوجوان افسر کلی طور پر ہتھیار ڈالنے کے مخالف تھے۔

''اگر وہ ہمارے اتنے ہی ہمدرد ہیں تو محاصرہ کیوں نہیں اٹھا لیتے؟'' ڈیلافورڈ بولا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی حمایت کی۔ حتیٰ کہ وائی برٹ نے انہیں خاموش کرایا۔

''اور اگر وہ محاصرہ نہیں اٹھاتا تو کیا ہوگا؟'' وائی برٹ نے بڑے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''تب کیا تم لوگ اس قابل ہو کہ تین دن سے زیادہ اپنی عورتوں اور بچوں کا تحفظ کر سکو؟''

''لیکن کیا تم ایک باغی کے الفاظ پر اعتماد کرنے کو تیار ہو؟'' ڈیلافورڈ نے الٹا سوال کیا۔

''جبکہ ہم یہاں دفاعی پوزیشن پر ہیں۔ ہم انہیں کچھ نہ کچھ دکھا سکتے ہیں اور ممکن ہے اس وقت تک وہ محاصرہ اٹھا لیں یا لارنس فوج لے کر آ پہنچے لیکن یاد رکھو کہ اگر ایک بار ہم اس پیشکش کو مان کر کھلے میں چلے گئے تو پھر مکمل طور پر ان کے رحم وکرم پر ہوں گے۔''

''ہم کس منہ سے انگلینڈ جائیں گے؟'' تھامسن نے کہا۔ کسی نے اس کی تائید کی لیکن بیمار' بوڑھے ایورٹ نے جو اجلاس میں شرکت کے لیے اسٹریچر پر آیا تھا۔ بڑی کراری زبان میں تھامسن کو برا بھلا کہا۔ ''چند فضول سی مٹی کی عمارتوں کے دفاع کے لیے سینکڑوں عورتوں اور بچوں کو قربان کرنے کا انگلینڈ جا کر کیا جواب دو گے؟''

بوڑھوں نے تائیدی انداز میں سر ہلائے لیکن نوجوانوں نے بڑی شدت سے ایورٹ کی مخالفت کی۔ وہیلر خاموش تھا۔ شاید دل سے وہ بھی ایورٹ کی بات کو تسلیم کرتا ہو کیونکہ کل ہی اس کا بیٹا اس فضول لڑائی کی بھینٹ چڑھا تھا۔

تم نے کچھ نہیں کہا فلیش مین! اس شور شرابے کا اختتام وہیلر کے جملے سے ہوا تھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

سب کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ میں نے انہیں دیکھا اور کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ ''مجھے نانا پر اعتماد نہیں سر! میں نے محتاط انداز اختیار کیا۔ ''لیکن اگر ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو سامنے رکھ کر سوچیں تو پھر ہمیں اس کی تجویز مان لینی چاہیے' شاید اس طرح ہم انہیں بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔''

''تو کیا تم ہتھیار ڈال دو گے؟'' وہیلر نے پوچھا۔

''کبھی نہیں۔'' میں جھٹ سے بولا۔ ''لیکن.....''

''شاباش۔'' ڈیلا فورڈ چلایا۔

''.....بعض اوقات انسان کو اپنی انا اور عزت داؤ پر لگانی پڑتی ہے اگر بہت سے لوگوں کو موت سے بچانے کے لیے مجھ اکیلے کی قربانی مانگی گئی تو میں ہنس کر اپنی انا اور عزت داؤ پر لگا دوں گا۔''

''اور یہ اس شخص کی رائے ہے جو پائپر فورٹ کا سربراہ رہا ہے اور لائٹ بریگیڈ کی کمان کر چکا ہے۔'' بوڑھے ایورٹ نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔

دوسرے لوگ خاموش رہے۔ وہیلر نے ووٹنگ کی تجویز پیش کی۔ تقریباً تمام ہی لوگوں نے ہتھیار ڈالنے کے حق میں فیصلہ دیا' چنانچہ محض نصف گھنٹے بعد وہیلر کی جانب سے جنگ سے دستبرداری کا پیغام نانا صاحب کو بھجوا دیا گیا لیکن اس نے شرط رکھی تھی کہ ہم صرف اسلحہ ہی اپنے پاس نہیں رکھیں گے بلکہ ہر شخص بیس کے بجائے ساٹھ راؤنڈ اپنے ساتھ لے جائے گا۔

جانے کیوں اس کے باوجود جنرل وہیلر' نانا صاحب کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ جب جولا پرشاد اور عظیم اللہ اس سے ملنے آئے تو جنرل نے ان سے بھی اپنے شبہے کا اظہار کیا لیکن وہ نانا صاحب کے دستخطوں سے جاری ہونے والا ایک حلف ساتھ لائے تھے۔ جس میں جنرل کے تمام شبہات کو باطل قرار دیا گیا تھا۔

عظیم اللہ کی تفصیلات کے مطابق دریا تک جانے کے لیے بار برداری کے جانور صبح سویرے پہنچ جاتے جہاں کشتیاں ہمیں الہٰ باد لے جانے کو تیار ہوتیں۔

وہ رات ہم نے تقریباً جاگ کر گزاری۔ یوں لگتا تھا جیسے موت کا سایا ہٹ رہا ہو اور لوگوں کو نئی زندگی کی نوید ملنے والی ہو۔ گزشتہ کئی ہفتوں کے بعد پہلی مرتبہ بیرکوں کے باہر آگ جلائی گئی۔ زخمیوں کو کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے لایا گیا۔ حتیٰ کہ بچوں کو بھی کھلے میدان میں کھیلنے کودنے سے منع نہیں کیا گیا۔

تمام افراد روانگی میں مصروف تھے۔ وہاں اتنا سامان کسی کے پاس نہیں بچا تھا کہ باقاعدہ پیکنگ کی جاتی پھر بھی ضروری اشیاء اکٹھی کی جا رہی تھیں۔ اس اثنا میں جنرل وہیلر نے اب تک انگریز سرکار کے وفادار مقامی فوجیوں کو جمع کر کے ..... کہا تھا کہ وہ رات کی تاریکی میں جنوب کی سمت فرار ہو جائیں تاکہ صورت حال بگڑ جانے کی صورت میں صبح انہیں اپنے ہم وطنوں کے غیظ و غضب کا نشانہ نہ بننا پڑے۔ بہت سے دوسرے فوجیوں کی طرح یلدرم نے بھی اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خود میں نے بھی اسے چلے جانے کو کہا تو وہ بری طرح ناراض ہو گیا۔

''بھلا بھائیوں کو مصیبت کے وقت تنہا چھوڑا جاتا ہے؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا تو میں خاموش ہو گیا۔ وہ مجھے بھائی ہی سمجھتا تھا اس لیے میں مزید کچھ کہہ کر اس کے جذبوں کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

◈ ◈ ◈

دن کا اجالا پھیلتے ہی باغی آ پہنچے۔ وہ ہماری روانگی کے انتظامات کر چکے تھے۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہوا کہ کن مشکلات کا شکار ہیں۔ دو سو سے زائد افراد زخمی تھے۔ جنہیں دریا تک پہنچایا جانا تھا۔ عورتیں اور بچے ان کے علاوہ تھے۔ کچھ بوڑھے ایسے بھی تھے جنہیں گزشتہ چند ہفتوں سے نامناسب اور کم خوراک نے اتنا ناتواں کر دیا تھا کہ کسی سہارے کے بغیر کھڑے بھی نہ رہ سکتے تھے ہر کوئی تھکا تھکا اور بیزار بیزار سا دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آزادی کو قریب دیکھ کر اس کے بارے میں تمام تصورات دم توڑ گئے ہوں۔

سورج بلند ہوتے ہی کانپور سے انگریزی دستوں کا انخلا شروع ہو گیا۔

چھکڑوں میں زخمیوں کو لادا گیا۔ عورتوں اور بچوں کے لیے بھی انہی پر جگہ بنائی گئی۔ انگریز

سپاہی ان چھکڑوں کے اردگرد چل رہے تھے۔ میدان کے پار اور درختوں کے جھنڈ کی آڑ سے باغی بھی ہماری پسپائی کا نظارہ کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن انہوں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے اشتعال پھیلتا اور نہ ہی انہوں نے ہم سے کوئی تعرض کیا۔

دو سویلین انگریزوں نے ٹوٹی ہوئی بیرک کی چھت پر لہرانے والا وہ یونین جیک اتار لیا جو اس مقام پر انگریز عمل داری کا آخری ثبوت تھا۔ جھنڈا وہیلر کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کی حفاظت نہ کر سکا تھا۔

بوڑھے ایورٹ کو ایک پالکی میں سوار کیا گیا۔ مور قافلے کے آگے آگے تھا۔ وہ بار بار اپنی وسل بجا کر چھکڑوں اور پالکیوں کو ایک لائن میں رہنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ میں قافلے کے آخری حصے میں شامل تھا اور وائی برٹ کے ساتھ سپلائی ویگن کا چارج سنبھالے ہوئے تھا جب کہ ہمارے عقب میں باغی تھے۔ جو خالی ہو جانے والی بیرکوں میں مزید توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔

بیرکوں سے دریا کا فاصلہ محض ایک میل تھا لیکن ہم ابتدائی مرحلے پر ہی بری طرح تھک گئے قافلے میں کوئی خاص نظم بھی نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے میدان پار کرنے میں ہمیں ایک گھنٹہ لگ گیا ہمارے اردگرد باغی فوجیوں کے علاوہ کانپور شہر کے باسی بھی جمع ہو گئے تھے۔ جو ہماری شکست خوردگی کا تماشا دیکھ دیکھ کر زیر لب ہنس رہے تھے۔

میدان کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا پل تھا۔ قافلے کے تمام چھکڑے ایک ایک کر کے پل کو پار کر گئے تھے لیکن جب میری اسٹور ویگن پل پار کر رہی تھی تو درختوں کے قریبی جھنڈ سے فائر کی آواز سنائی دی۔ فوراً ہی ایک چیخ بلند ہوئی جس کے بعد مزید گولیاں چلنے لگیں۔

وہائٹنگ حواس باختہ سا میرے پاس پہنچا اور صورت حال کے بارے میں دریافت کرنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا ہمارا ایک کارپورل بھاگتا ہوا ہمیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

''غضب ہو گیا سر..... جلدی چلیں.....'' اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ ''وہ شیطان کرنل ایورٹ کو قتل کر رہے ہیں۔ وہ اسے درختوں میں لے گئے ہیں اور.....''

وہائٹنگ نے جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی درختوں کی جانب بھاگنا چاہا لیکن پل پر موجود ایک باغی سپاہی نے اسے کمر سے تھام لیا۔ ایک لمحے کے لیے میں یہی سمجھا کہ اب وہائٹنگ کی باری

ہے۔ کارپورل کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی۔ وہ اپنا خنجر نکال کر باغی پر جھپٹا لیکن باغی کے ارادے ہمیں خطرناک دکھائی نہیں دیے۔ وہ محض وہائٹنگ کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نہیں صاحب.....خبردار.....وہاں نہ جائیں.....اگر آپ بھی وہاں گئے تو وہ آپ کو بھی مار ڈالیں گے۔ آپ اپنی جان بچائیں اور دریا کی طرف چلیں۔''

وہائٹنگ بدستور باغی سے زور آزمائی کر رہا تھا لیکن وہ باغی سے زیادہ طاقتور نہ تھا۔ ایک مرحلے پر وہائٹنگ کو بھی غصہ آ گیا لیکن کارپورل نے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔

''یہ صحیح کہہ رہا ہے' صاحب'' کارپورل نے باغی کی تائید کی۔ ''وہ آپ کے ساتھ بھی کرنل جیسا سلوک ہی کریں گے۔ ہمیں جلد از جلد دریا پر پہنچنا چاہیے ورنہ ہماری عورتوں اور بچوں کا حشر بھی کرنل ایورٹ سے مختلف نہ ہوگا۔''

اچھا ہی ہوا کہ بات وہائٹنگ کی سمجھ میں آ گئی' ورنہ جانے کیا ہوتا۔ وہ آگے بڑھ گیا لیکن چند ہی ثانیوں بعد میں نے اسے بعض مقامی سپاہیوں کے ہمراہ درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتے دیکھا۔

اب صورت حال مزید گھمبیر ہو گئی تھی۔ جنرل ونہیلر کو اس بارے میں مطلع کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے کارپورل کو اسٹوروگن کی نگہداشت کرنے کو کہا اور خود قافلے کے اگلے حصے کی طرف دوڑ لگا دی۔ جنرل قافلے میں سب سے آگے چل رہا تھا اس لیے مجھے بھاگتا دیکھ کر راستے میں تمام چھکڑوں کے مسافر مجھ سے پوچھتے رہے کہ کیا ہوا ہے۔ لیکن میں انہیں نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا' حتیٰ کہ مجھے دریائے گنگا کا چوڑا پاٹ اور موتی گھوڑا گھاٹ دکھائی دینے لگا۔

گھاٹ پر آدمی تھے۔ ابتدائی چھکڑے وہاں پہنچ چکے تھے۔ لوگ ان سے اتر کر اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں کئی کشتیاں لنگر انداز تھیں۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ہر شخص کی کوشش تھی کہ وہ پہلے کشتی پر سوار ہو جائے۔ زخمی بے یار و مددگار اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ عورتیں اور بچے ایک جانب سمٹے ہوئے تھے جبکہ ان کے مرد چلا چلا کر دریافت کر رہے تھے کہ کشتیوں پر سوار ہونے کی ترتیب کیا ہوگی!

ایک شخص بلند آواز میں چیخ رہا تھا۔ ''تقریباً تمام عورتیں اور چھوٹے بچے کشتی نمبر بارہ تا سولہ میں سوار ہوں گے۔''

لیکن کسی کو علم نہ تھا کہ کشتی نمبر بارہ اور سولہ کہاں لنگر انداز ہیں؟

گھاٹ کے دونوں جانب باغی رائفلیں لئے مستعد کھڑے تھے۔ عظیم اللہ بھی وہاں موجود تھا۔ وہیلر اس کے قریب کھڑا کسی مسئلے پر بات کر رہا تھا۔ میں ان کی طرف بڑھا تو مجھے عظیم اللہ کی آواز سنائی دی۔

''لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آٹا کشتیوں پر موجود ہے' آپ خود جا کر دیکھ لیں .....اوہ .....کرنل فلیش مین .....اچھا ہوا تم آ گئے .....میرے خیال میں کرنل، کشتیوں کا معائنہ کر لینا چاہیے کہ سب کچھ ان پر موجود ہے یا نہیں؟''

میں جنرل کا اشارہ پا کر پانی میں اتر گیا اور کشتیوں کی طرف بڑھا۔ کشتیاں بڑی بڑی تھیں۔ ان کے ملاح مقامی ہی تھے جو کہ کمر سے اوپر عریاں تھے۔ کشتیوں پر واقعی غلے کی بوریاں موجود تھیں۔ چنانچہ میں نے واپس آ کر جنرل کو آگاہ کیا' اور جنرل نے اپنے آدمیوں کو کشتیوں پر سوار ہو جانے کی ہدایت کر دی۔

زخمیوں کو سب سے پہلے پہنچایا گیا جس کے بعد عورتوں اور بچوں کی باری آئی۔ مقامی اور برطانوی سپاہی سب سے آخر میں سوار ہوئے۔ جنرل کی ہدایت پر میں لوڈنگ کی نگرانی کر رہا تھا۔ کچھ افسران کشتیوں پر جا چکے تھے۔ سینئر افسران کے لیے ایک الگ کشتی مخصوص کی گئی تھی جس پر جنرل وہیلر بھی موجود تھا۔

میں نے وہائٹنگ کی آواز سنی تو اس کی طرف بڑھا۔ وہ کہہ رہا تھا'' .....اسے اس کی پالکی میں ہی گولی مار دی گئی تھی .....کم از کم چھ گولیاں اس کے جسم میں پیوست تھیں۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔'' اس نے غصے کے عالم میں اپنا ہاتھ اس طرف لہرایا جدھر عظیم اللہ، تانتیا توپ اور نانا کے افسران کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ خود نانا موجود نہیں تھا۔

''لیکن تم خود ہی بتاؤ' اس سلسلے میں کیا' کیا جا سکتا ہے۔'' جنرل وہیلر نے کہا'' یہ بے شک غداری ہے لیکن خدا کا شکر ادا کرو کہ اس بدنصیب کے سوا تمام لوگ بحفاظت یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہم ان سے کوئی احتجاج نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے ہمیں ہی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لیے بہتر ہے کہ جو ہوا اسے بھول جاؤ اور خود کو اور اپنے باقی ساتھیوں کو بچانے کی کوشش کرو۔''

وہائٹنگ اب بھی جذباتی ہو رہا تھا لیکن وائی برٹ اسے کھینچ کر دور لے گیا۔ باغیوں نے بھی کشتیوں سے رفتہ رفتہ دور ہٹنا شروع کر دیا تھا۔

''ارے فلیش! ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا۔'' میرے کانوں میں مور کی آواز پڑی تو میں اس کی طرف پلٹا۔ اس کا بازو زخمی تھا جبکہ لباس کیچڑ سے آلودہ تھا۔ ''باغیوں نے ہمارے چار وفادار سپاہیوں کو بھی گولی ماری ہے۔''

''وہ ان کی نظر میں انسان نہیں جانور تھے۔'' وہائٹنگ دور سے چلایا۔ اس نے مور کا جملہ سن لیا تھا۔ ''شاید تمہیں علم نہیں کہ ہلاک ہونے والوں میں تمہارا پٹھان اردلی بھی شامل ہے۔ انہوں نے اسے گڑھے میں گولی ماری تھی''۔

درد کی ایک تیز لہر میرے پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یلدرم مر گیا۔ وہ مجھے بھائیوں کی طرح ہی عزیز تھا۔ یوں لگا جیسے واقعی میرا کوئی بھائی جدا ہو گیا ہو۔ مجھے اس پر غصہ بھی آنے لگا کہ آخر اس نے میری خاطر جنرل وہیلر کی پیشکش کو کیوں ٹھکرایا تھا کہ مقامی سپاہی اگر چاہیں تو فرار ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ فرار ہو جاتا تو کم از کم زندہ تو رہتا' لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

''.....آؤ دوست!'' مور نے مجھے ایک طرف کھینچا تو میں اپنی سوچوں کے بھنور سے نکل آیا۔ ''ہم آخری کشتی میں سوار ہوں گے۔ وہ اس کشتی میں.....''

گھاٹ کے دوسری طرف درختوں کے اوپر ایک بگل سنائی دیا تو میں نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ سامنے پہاڑی پر ایک ایسی بات رونما ہو رہی تھی جو بظاہر ناقابل یقین تھی۔ میں یہی سمجھا کہ مجھ پر ابھی تک یلدرم کی موت کی خبر کا اثر ہے۔ میں نے پلکیں جھپکائیں لیکن حقیقت حقیقت ہی رہی۔ پہاڑی کی ڈھلوان پر موجود سینکڑوں باغی اپنا ایک ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر فائرنگ پوزیشن لے رہے تھے۔ ان کی رائفلوں کا رخ ہماری جانب تھا۔

''مائی گاڈ .....'' ایک آواز بلند ہوئی۔ اس نے کچھ اور بھی کہا لیکن وہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں دب گیا۔ میں نے اپنے برابر کسی کی چیخ سنی اور پھر مور نے مجھے دھکا دے کر پانی میں گرا دیا۔ میں غوطہ کھا کر اُبھرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جس کے نتیجے میں میرا سر درمیانی کشتی سے بری طرح ٹکرایا مجھے چکر سا آ گیا۔ لیکن شکر تھا کہ مجھ پر بے ہوشی طاری نہیں ہوئی تھی۔

پانی کے اوپر سے اب گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں گھوم کر کشتی کی دوسری جانب چلا گیا تا کہ صورت حال کا جائزہ لے سکوں۔

باغی اب ڈھلوان سے اُترنا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن وہ اب بھی کشتیوں پر فائرنگ کر رہے تھے۔ درختوں کے جھنڈ میں مجھے ایک ہلکی توپ بھی دکھائی دی جس کے گولے وقفے وقفے سے بے یارومددگار کشتیوں پر گر رہے تھے۔

میں نے وہیلر کو ساحل پر کیچڑ میں لت پت دیکھا۔ وہ مارے غصے کے چیخ رہا تھا۔

''غداری..... بھاگو..... جلد.....''

ایک برطانوی سپاہی نے کمر سے پکڑ کر اُسے پانی میں گرا دیا ورنہ باغیوں کی کئی گولیاں اس کے جسم میں گھس جاتیں۔

گھاٹ پر قیامت صغریٰ برپا تھی۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے میں مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ مور میرے قریب ہی پانی میں موجود تھا جبکہ وائی برٹ اپنے زخمی بازو کے باوجود تیر کر ہمارے پاس آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مور اس کی مدد کو بڑھا تو میں نے خود کو لعنت ملامت شروع کر دی میں ایک بار پھر صحیح انداز میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ نانا صاحب نے بدعہدی کی تھی۔

دریا میں اب کئی لاشیں تیر رہی تھیں۔ مرد گولیوں کا نشانہ بنے تھے جبکہ عورتیں اپنی جان بچانے کے لیے پانی میں کود گئی تھیں لیکن بدحواسی میں تیر نہیں سکی تھیں۔ کئی عورتوں کے بازوؤں میں اب بھی بچے موجود تھے جو اپنی ماؤں کی طرح زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

کئی گولیاں اس کشتی کی طرف آئیں جس کی آڑ میں میں موجود تھا۔ میں نے فوراً سر جھکا کر غوطہ لگا دیا۔ کچھ دیر بعد جب میں دوبارہ دریا کی سطح پر نمودار ہوا تو لاشوں کی تعداد بڑھ چکی تھی اور پانی کی سرخی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔

نانا صاحب نے واقعی کمال کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس نے ہمارے کشتیوں میں سوار ہونے کا انتظار کیا اور عین اس وقت جب ہم اپنی آزادی کا یقین کر چکے تھے اس نے ہم پر موت کے دہانے کھول دیے تھے۔

میرے قریب ہی کئی کربناک چیخیں اُبھریں تو میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ ایک کشتی ڈوب رہی تھی جبکہ اس کے مسافر اپنی جان بچانے کے لیے پانی میں ہاتھ پیر مار رہے تھے اور چیخ

رہے تھے لیکن کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔ ٹھیک اسی وقت ہلکی توپ کا گولہ زندگی کی جدوجہد میں مصروف ان لوگوں کے عین درمیان آ کر گرا اور وہ چھوٹے بڑے چیتھڑوں میں تبدیل ہو کر پانی کے بہاؤ میں شامل ہو گئے۔

اب دریا کی دوسری جانب سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ باغیوں نے ہمیں دونوں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں نے ان سے بچنے کے لیے کشتیوں کے ساتھ ساتھ آگے کی سمت تیرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ وہیلر، وائی برٹ اور چند ایک دوسرے افسران تھے۔ مور گھاٹ کے ساتھ بندھا ہوا کشتی کا رسہ کھولنے میں مصروف تھے۔

مجھے دیکھ کر مور نے چیخ کر کچھ کہا جو فائرنگ کی وجہ سے مجھے سنائی نہیں دیا۔ اس نے دوبارہ منہ کھولا لیکن ایک گولی اس کے سر کے عقبی حصے میں آ کر لگی اور اس کا بھیجا چاروں طرف بکھر گیا۔ اس کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور پانی میں جا گرا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ میں اپنی اور کشتی پر موجود دوسرے افراد کی زندگیاں ضرور بچا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے کشتی کے پہلو میں جا کر خنجر سے رسہ کاٹ ڈالا اور اسے بہاؤ کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد ہی میں اپنی کوشش کی میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے باوجود میں کئی سو گز تک کشتی کی آڑ میں اس کے ساتھ ساتھ تیرتا رہا اور آخر کار اس کے عرشے پر کود آیا۔

سب سے پہلے میں نے وہیلر کو دیکھا۔ اس کی گردن میں گولی نے ایک گہرا شگاف ڈالا تھا۔ وہ مر چکا تھا، یا مر رہا تھا اس کے ارد گرد کئی زخمی پڑے تھے۔ ان کی کراہوں سے کشتی گونج رہی تھی۔ دو سپاہی اپنی رائفلیں سنبھالے اب بھی ساحل کی طرف گولیاں برسا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ہم باغیوں اور باغی ہماری فائرنگ رینج سے دور ہو گئے لیکن عقب سے گولیاں اور توپ چلنے کی آواز ہنوز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے دو اور کشتیوں کو دیکھا جو دریا کی موجوں پر اِدھر اُدھر ڈول رہی تھیں لیکن ان کے مقابلے میں ہماری کشتی صحیح سمت جا رہی تھی جس پر نصف درجن سے زائد افراد موجود تھے۔ (18)

جب ہم مکمل طور پر خطرے سے نکل آئے تو میں نے اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیا۔ وہیلر مر چکا تھا۔ اس کے برابر وائی برٹ لیٹا تھا اس کی آنکھیں بند اور دونوں بازو خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کسی کی تیز کراہ سنائی دی تو میں نے پلٹ کر دیکھا وہ ٹرنر تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں سے بے تحاشہ خون بہہ رہا تھا۔ وہائٹنگ ایک چپو سنبھالے ہوئے تھا۔ ڈیلا فورڈ' تھامسن اور سارجنٹ گریڈی زخمی ہونے کے باوجود چپو چلا رہے تھے لیکن ایسٹ مر چکا تھا۔

''مجھے افسوس ہے دوست!'' میں زیر لب بڑبڑایا۔ ''میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں موت کے منہ میں چھوڑ کر بھاگوں گا نہیں' لیکن تم نے میرا انتظار تو کیا ہوتا۔''

ایسٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دے بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ وہ تو اس دنیا میں جا چکا تھا جہاں سوال و جواب کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔

میں خاصی دیر سر جھکائے اس کے قریب بیٹھا رہا اور اپنی قسمت پر رشک کرتا رہا کیونکہ کشتی پر موجود افراد میں سے میں واحد شخص تھا جس کے بدن پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔

ہماری کشتی کانپور کے موتی گھاٹ سے بچ کر آنے والی واحد کشتی تھی۔ باقی تمام کشتیوں کو ان کے مسافروں سمیت تباہ کر دیا گیا تھا لیکن عورتوں اور بچوں کی کشتیوں کو ہر ممکن طور پر بچا لیا گیا تھا۔ باغی انہیں پکڑ کر واپس ساحل پر لے گئے تھے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ساحل پر جانے والے ان بدنصیبوں پر کیا بیتی تھی؟

ہم سورج غروب ہونے تک سفر کرتے رہے۔ جب تاریکی ہوئی تو ڈرتے ڈرتے کشتی کو کنارے لگایا۔ کچھ دیر تو سکون رہا لیکن پھر اچانک ہی کنارے کی طرف سے ڈھول بجنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہم ابھی ڈھول بجنے کی وجہ جاننے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ کئی آتشیں تیر ہمیں اپنی جانب آتے دکھائی دیے۔ ایک تیر وہائٹنگ کو لگا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ ہم نے فوراً اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں اور کنارے سے کچھ فاصلے پر موجود سایوں پر فائرنگ کرنے لگے۔ ساتھ ہی ہم کشتی کو دوبارہ دریا کے وسط میں لے جانے کی کوششیں کرنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم مزید کوئی نقصان اٹھائے بغیر کامیاب رہے اور پھر صبح تک ہم نے اپنا سفر موقوف کرنے

کی کوئی کوشش نہیں کی۔

دن کے اجالے میں ہم نے کشتی کنارے لگائی۔ دریا کے ساتھ ساتھ جنگل پھیلا ہوا تھا لیکن بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہاں کوئی دشمن ہمارا منتظر ہوگا۔ دریا کی دوسری جانب دور دور تک ہرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور ایسی کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آتی تھی جسے کسی طور پر بھی خطرے کی علامت سمجھا جا سکتا۔(19)

وائی برٹ کا اندازہ تھا کہ ہم الہ آباد سے سو میل دور ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ راستہ طویل ہونے کے ساتھ ساتھ کٹھن بھی ہے کیونکہ ہمیں اپنی منزل تک باغیوں کے علاقے سے ہی گزرنا تھا۔ کشتی پر مجموعی طور پر دو درجن افراد موجود تھے۔ جن میں سے نصف اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل تھے، لیکن ہمارے پاس اسلحہ بے حد کم تھا اور اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ہمیں کہیں سے اسلحہ مل جاتا۔

کشتی بذات خود دگرگوں حالت میں تھی۔ گولیوں نے اسے جگہ جگہ سے ادھیڑ ڈالا تھا۔ جابجا خون بکھرا ہوا تھا کیونکہ میرے سوا تقریباً ہر شخص زخمی تھا۔

ہم نے اچھی طرح دیکھ بھال کے ساحل سے قریب ہی اپنا کیمپ قائم کیا جس کے بعد میں نے وہاں موجود افسران کا ایک اجلاس طلب کیا کیونکہ عہدے کے لحاظ سے میں ان سب سے سینئر تھا۔

میری خواہش تھی کہ ہم کشتی کے ذریعے الہ آباد تک کا سفر جاری رکھیں۔ چند ایک میری حمایت میں تھے جبکہ باقیوں کا خیال تھا کہ ہمیں نزدیک ہی کوئی ایسا گاؤں تلاش کرنا چاہیے جہاں کے رہنے والے اب بھی انگریز کے وفادار ہوں تاکہ زخمیوں کا علاج ہو سکے۔

وائی برٹ نے تجویز پیش کی کہ ہمیں دوست دیہات کی تلاش کے لیے ایک پارٹی روانہ کرنی چاہیے جس کی سربراہی میں کروں۔ میں دل ہی دل میں اسے کوسے بغیر نہ رہ سکا۔ ظالم نے کس خوبصورتی سے سب کی بلا میرے سر منڈھ دی تھی۔

میں ذرا دیر کو جھجکا لیکن پھر پارٹی کی سربراہی پر آمادہ ہو گیا۔ ''لیکن تم لوگوں کو آخر کار میرے بغیر الہ آباد جانا پڑے گا۔'' میں نے کہا ''مجھے ایک رائفل اور ایک چاقو درکار ہے، جبکہ ہر شخص کو مجھ سے الوداعی مصافحہ کرنا ہوگا۔''

چنانچہ ہم درجن بھر افراد کوئی دوست دیہات تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے' میرے ذہن میں تھا کہ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو بہتر ہے ورنہ میں اکیلا ہی ان سے الگ ہو کر کانپور واپس چلا جاؤں گا جہاں میں یلدرم کی ہلاکت کا بدلہ لینے کے لیے جانا چاہتا تھا۔

ابھی ہمیں جنگل میں داخل ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک چھوٹا سا مندر دکھائی دیا۔ جو درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک پگڈنڈی مندر کی طرف جاتی تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ سالہا سال سے کسی انسان کے قدم یہاں نہیں پہنچے۔ میں نے ڈیلا فورڈ اور سارجنٹ گریڈی کو مندر کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا جنہوں نے واپس آ کر رپورٹ دی کہ مندر خالی ہے۔

میں اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت دینے ہی والا تھا کہ وہ باقی لوگوں کو بھی یہیں لے آئیں کہ جنگل میں دور کہیں ڈھول بجنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس قسم کی آوازیں ہم نے گزشتہ شب بھی سنی تھیں جن کے نتیجے میں آتشیں تیروں سے واسطہ پڑا تھا اور اب پھر ڈھول کا یہ بھوت مجھے اپنی طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔

میں اپنے ساتھیوں کو متنبہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک تیز سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ایک جانب سے سنسناتا ہوا تیر آیا اور سارجنٹ گریڈی کی پسلیوں میں ترازو ہو گیا۔ وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ زمین پر گرا جس کے ساتھ ہی چاروں سمت سے ننگ دھڑنگ وحشیوں نے ہم پر ہلہ بول دیا۔

میں نے ایک گولی چلائی۔ خدا جانتا ہے کہ وہ کدھر کو گئی۔ اس کے بعد میں نے مندر کی طرف دوڑ لگا دی۔ دو تیر مجھ سے پہلے مندر کے دروازے کو لگے لیکن میں محفوظ رہا۔ ڈیلا فورڈ اور تھامسن بھی مندر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب وحشیوں پر گولیاں برسا رہے تھے۔

وحشیوں نے دروازے پر حملہ کر دیا۔ ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ہم انہیں دروازے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بات بھی ہمارے حق میں جاتی تھی کہ ان کے پاس آتشیں ہتھیار نہیں تھے' محض تیر اور لمبی لمبی تلواریں تھیں۔ ان کی تلواریں تو اس وقت تک بے کار تھیں جب تک وہ قریب نہ آ جاتے' البتہ تیروں نے ہمیں بے حد پریشان کیا تھا۔ تھامسن اور مرفی تیر لگنے سے خاصے زخمی ہوئے تھے۔

ہم گولیاں چلا رہے تھے اور وہ گر رہے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی تعداد کم نہیں ہو پا رہی

تھی۔رفتہ رفتہ وہ مندر کے قریب آتے جارہے تھے۔

اچانک مجھے ڈیلافورڈ کی چیخ سنائی دی۔''آگ.....آگ .....وہ مندر کو آگ لگا رہے ہیں۔''

ڈیلافورڈ صحیح کہہ رہا تھا۔اسی وقت دھوئیں کے مرغولے دروازے سے اندر آنے لگے۔ تھامسن نے میرا بازو تھام لیا ساتھ ہی وہ چلا رہا تھا۔''ہمیں ہر حال میں ان کا گھیرا توڑنا ہے۔''

''سامنے کی طرف فائر کرو_____بھاگو_____''

فیصلہ فوری کرنا تھا۔سوچنے کا مطلب موت کو گلے لگانا تھا۔وہ اور ڈیلافورڈ دو دوسرے آدمیوں کو لے کر دروازے کی طرف بڑھے۔

''فائر!''تھامسن کی آواز سنائی دی۔

بہ یک وقت کئی گولیاں چلیں اور ہم نے سر جھکا کرارنے بھینسے کی طرح دوڑ لگا دی۔کئی تیر ہمارے سروں کے اوپر اور دائیں بائیں سے سنسناتے ہوئے گزرے لیکن ہم دوڑتے چلے گئے۔ ڈیلافورڈ میرے آگے آگے تھا اور میں اس کے قدموں کے نشانات پر بھاگ رہا تھا۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ ہم کس طرح فرار ہوئے۔بس اتنا یاد ہے کہ جب دریا کے کنارے پہنچے تو ہمارے سینے دھونکنی کی مانند چل رہے تھے اور پھیپھڑے جیسے پھٹے جارہے تھے۔

ہمارا خیال تھا کہ کنارے پر پہنچ کر ہم محفوظ ہو جائیں گے لیکن وہاں ایک اور آزمائش ہماری منتظر تھی۔ڈیلافورڈ کیچڑ میں کھڑا چلا رہا تھا۔

''وہ لوگ چلے گئے ہیں.....وائی برٹ.....مائی گاڈ! کشتی جا چکی ہے.....''

کنارہ خالی تھا۔ کیمپ بھی ویران نظر آرہا تھا۔ہم نے دریا میں دور دور تک نگاہیں دوڑائیں لیکن کشتی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے۔

ابھی ہم کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ اب کیا کریں کہ عقب سے ڈھول کی وہی آوازیں سنائی دینے لگیں جو جنگل میں وحشیوں کے حملے سے قبل سنائی دی تھیں۔پھر ان آوازوں میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹیں اور شور وغل بھی شامل ہو گیا۔وحشی دوبارہ حملے کے لیے آرہے تھے۔

میں نے وقت ضائع کیے بغیر دریا میں چھلانگ لگا دی۔دوسروں نے میری تقلید کی اور ہم

نے پاگلوں کی مانند تیرنا شروع کر دیا۔ دوسرا کنارہ بہت دور تھا البتہ دریا کی نچلی طرف بعض ریتلے ٹاپو موجود تھے جہاں پہنچ کر وحشیوں سے محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ ہم انہی ٹاپوؤں کی طرف تیرنے لگے۔

میرے عقب میں ڈیلافورڈ' تھامسن' مرفی اور سلیون تھے جبکہ باقی وحشیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ ڈیلافورڈ سب سے پیچھے تھا۔ وحشی دور رہ گئے تھے۔ یہ بھی شکر تھا کہ انہوں نے دریا میں کود کر ہمارے تعاقب کا فیصلہ نہیں کیا تھا ورنہ شاید ہمیں کہیں بھی پناہ نہ ملتی۔

''مگر مچھ!'' اچانک مجھے ڈیلافورڈ کی آواز سنائی دی تو میں پلٹا۔ وہ گنگا کے تیز پانیوں میں ایک جانب اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اُدھر دیکھا اور برف کی طرح منجمد ہو گیا۔

سو گز دور واقع جس ٹاپو کی طرف ہم بڑھ رہے تھے۔ اس کے ساحل پر مجھے کچھ لمبی اور بھوری چیزیں ناقابل یقین تیزی کے ساتھ پانی میں اترتی دکھائی دیں۔ ان کی لمبی اور بھاری دُمیں کوڑے کی طرح پانی پر پڑ رہی تھیں۔ وہ درجنوں مگر مچھ تھے جو ہمیں شکار سمجھ کر ہماری طرف لپکے تھے۔

میں نے پلٹ کر دریا کے وسط کی جانب تیرنا شروع کر دیا۔ کچھ فاصلے پر ایک ٹاپو تھا۔ جس کا ساحل مگر مچھوں سے پاک تھا۔ میرا رخ اُدھر ہی تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ ڈھارس بھی تھی کہ مگر مچھ پانی کے تیز دھاروں کو پسند نہیں کرتے' چنانچہ اگر ہم دریا کے وسط میں چلنے والے تیز دھارے تک پہنچ جاتے تو ان سے جان چھوٹ جاتی۔

میں تیزی سے ہاتھ پیر چلانے لگا۔ مگر مچھ بدستور ہمارے تعاقب میں تھے۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں۔ کچھ دور آنے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری روح فنا ہو گئی۔ ایک مگر مچھ مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر آ پہنچا تھا۔ وہ اپنا بھیانک جبڑا کھولے میری طرف بڑھ رہا تھا جبکہ پانی کا تیز دھارا مجھ سے پانچ سات گز دور تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اب موت یقینی تھی۔ مجھے انتظار تھا کہ کب مگر مچھ کے تیز اور نوکیلے دانت اپنے جسم میں محسوس ہوں ..... اسی وقت کسی نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ لیا میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ سلیون تھا جو مجھے پانی کے تیز دھارے کی طرف کھینچ رہا تھا۔

اگلے ہی لمحے میں تیزی کے ساتھ مگر مچھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ میں نیم بے ہوش ہو رہا تھا۔ مجھے صرف اسی قدر یاد آ سکا کہ دو افراد نے مجھے پکڑ کر خشکی پر کھینچا تھا اس کے بعد میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

◈◈◈

قسمت ایک ایسی تیز رفتار قوت ہے جو وقت کی پروا کیے بغیر مثبت اور منفی راستوں پر سفر کرتی ہے۔ میرے ساتھ بھی قسمت کی یہی تیزی کارفرما تھی۔

سب سے پہلے میں میرٹھ پہنچا جہاں سے بغاوت نے جنم لیا لیکن میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تا کہ کانپور کے جہنم میں کود سکوں۔ اس جہنم سے مجموعی طور پر پانچ افراد زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور میں ان میں سے ایک تھا۔ پھر ہم جنگل میں وحشیوں کے درمیان گھر گئے تو بھی میں خوش قسمت ٹھہرا۔ مگر مچھ بھی مجھے کچھ نہ کہہ سکے اور میری جان بچ گئی..... لیکن حقیقت یہ تھی کہ اگر مگر مچھ ہمارا تعاقب نہ کرتے تو ہم کبھی اس ہندوستانی راجہ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوتے جو اب بھی سرکار کا وفادار تھا۔

مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے سے پہلے ڈیلا فورڈ اور سلیون نے خشکی پر کھینچا تھا۔ جب میں ہوش میں آیا تو بہت سے مقامی افراد ہمارے اردگرد جمع تھے۔ پہلے میں بری طرح ڈر گیا لیکن فورڈ نے مجھے بتایا کہ وہ دریجا سنگھ کے آدمی ہیں جو جنگل کے وسط میں واقع ایک قلعہ کا حکمران ہے اور اب بھی انگریزوں کا حامی ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ انسان کی زندگی واقعی قسمت کی محتاج ہے۔

مقامی ہمیں مہاراج کے قلعے میں لے گئے۔ وہ ایک موٹا تازہ اور قوی الجثہ شخص تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی ہمیں انگریز فوج کے پاس بھجوانے کے انتظامات کرے گا۔ ہم تھکے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی میرے چاروں ہمراہی زخمی بھی تھے اس لیے اگلے پانچ ہفتوں تک یہ ممکن نہ ہو سکا۔

وہیں قیام کے دوران ہمیں بغاوت کی تازہ ترین صورت حال کے بارے میں علم ہوا۔

کانپور سے انگریزی فوج کی شکست اور وہاں سے ان کے انخلا نے بغاوت پر جلتی پر تیل کا کام کیا اور بغاوت پوری وادی گنگا اور وسطی ہندوستان میں پھیل گئی۔ مہو اور آگرہ سمیت

درجنوں شہروں کے گیریژنوں نے بغاوت کر دی اور انگریز سپہ سالاروں میں سے معزز ترین سپہ سالار ہنری لارنس کو جنگ کے بعد لکھنؤ میں قلعہ بند ہونا پڑا۔ اسے نہ صرف جنگ میں شکست ہوئی بلکہ باغیوں نے لکھنؤ کا محاصرہ بھی کر لیا۔

انگریزوں کے طرف سے بس یہ اچھی خبر ہمیں ملی تھی کہ جنرل ہیولاک نے الہٰ باد سے پیش قدمی کر کے کانپور میں باغیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ نو دن کی جنگ کے بعد اسے شہر میں داخل ہونے میں کامیابی ہوئی اور ہمارے وہاں سے فرار ہونے کے ٹھیک تین ہفتے بعد اس نے ان بیرکوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جنہیں ہم نے پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اسے وہاں جو کچھ ملا اس کے بارے میں پوری دنیا آگاہ ہے۔ (20)

جب ہم لوگ موتی گھاٹ سے فرار ہوئے اور باقی مردوں کو گولی مار دی گئی تو عورتوں اور بچوں کی کشتیوں پر باغیوں نے قبضہ کر لیا۔ نانا انہیں واپس ساحل پر لے گیا اور دو سو کے قریب عورتوں اور بچوں کو بی بی گڑھ نامی ایک مقام پر قید کر دیا۔ جہاں اس قدر گندگی، گھٹن اور تعفن تھا کہ ان میں سے تیس ایک ہفتے کے اندر اندر ہلاک ہو گئے۔

جب جنرل ہیولاک کی پیش قدمی کی خبریں نانا صاحب تک پہنچیں تب تمام زندہ عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا گیا۔ بعض قریب المرگ اور زخمی بچوں کو ایک کنویں میں پھینک دیا گیا اور وہ وہاں سسک سسک کر مر گئے۔ ہیولاک کے فوجیوں نے بی بی گڑھ کو گھٹنے گھٹنے خون میں ڈوبا پایا۔

میں نے بی بی گڑھ میں ہونے والا سانحہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن جب چند ہفتوں کے بعد میں کانپور پہنچا تو بطور خاص بی بی گڑھ گیا۔ دیواروں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ننھے منے لوتھڑے اب بھی موجود تھے۔ کنویں کے پاس ہڈیوں کے ننھے منے پنجر بھی پڑے دکھائی دیے۔

کانپور میں ہونے والے سانحے نے ہمارے آدمیوں پر بھی بہت برا اثر ڈالا اور وہ جنونی بن گئے۔ انہوں نے ہر اس شخص کو بے دریغ قتل کر ڈالا جس کا بغاوت سے ذرا سا بھی تعلق تھا۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ کانپور کے قتل عام سے پہلے انگریز فوج، باغیوں سے کسی قسم کی رعایت کر رہی تھی۔ وہ پہلے بھی مقامیوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار رہی تھی لیکن اس واقعے کے بعد ان سرگرمیوں میں کچھ اور تیزی آ گئی تھی۔ جنرل ہیولاک اور جنرل نیل نے کانپور کے شہریوں سے

اپنے آدمیوں کی ہلاکت کے گن گن کر بدلے لیے تھے۔

میرے اندازے کے مطابق جنگ میں مصروف دونوں فریق ہی خوف زدہ تھے۔ مقامیوں نے بغاوت کی تھی اور انہیں خدشہ تھا کہ یہ ناکام ہوگئی تو بھیانک سزا ملے گی جبکہ انگریزوں کو اس بات کا خطرہ تھا کہ وہ بزور قوت ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں۔ وہ کہیں بھی کمزور پڑے تو مقامی انہیں کبھی معاف نہ کرتے۔

بہر حال صورت حال جو بھی تھی۔ وادی گنگا میں ہم نے ایک خونی موسم گرما گزارا تھا۔ کانپور میں، جنرل ہیولاک سے میری طویل ملاقاتیں ہوئیں جن کے دوران، میں نے اسے اعتماد میں لے کر لارڈ پالمرسن اور اپنے ہندوستان آنے کی وجوہات کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی میں نے اسے کہا کہ اب مجھے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جسے بنیاد بنا کر ہندوستان میں رکوں اس لیے میں فوری طور پر انگلینڈ واپس جانا چاہتا ہوں۔

''نہیں'' جنرل نے فوری طور پر سر نفی میں ہلا دیا۔ ''مشن بے شک اپنی اہمیت کھو چکا ہے لیکن ہمیں تجربے کار ہاتھوں کی اب بھی ضرورت ہے۔ اس ملک کی قسمت اب بھی ترازو میں پڑی ہے اس لیے میں تم جیسے سپاہی کو واپس بھیجے جانے کے حق میں نہیں۔ ابھی تمہارے لیے بہت کام باقی ہے۔'' وہ چند ثانیے رک کر مجھے دیکھتا رہا' پھر گویا ہوا ''میں تمہیں اپنے اسٹاف میں شامل کرلوں گا' فلیش مین!''

میں چاہتے ہوئے بھی کوئی اعتراض نہ کر سکا کیونکہ وہ فوراً ہی اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ پہلے اس نے چند باغیوں کو پھانسی دینے کے احکامات صادر کیے۔ پھر نیل کو ایک خط لکھوایا اور آخر میں اپنے ایڈجوٹنٹ پر دہاڑنے لگا۔

یوں میں جنرل ہیولاک کے اسٹاف میں شامل ہوگیا اور میری فوری واپسی کی امیدیں ختم ہوگئیں۔ میں کسی ہائی کمان سے بھی رجوع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ موجودہ ہنگامی صورتحال میں وہ جنرل ہیولاک کے احکامات سے سرتابی کی جرأت نہیں کرے گی۔

مجھے ہیولاک نے اپنا انٹیلی جنس ایڈی مقرر کیا تھا۔ جو ان دنوں پیش آنے والے حالات کے حساب سے ایک محفوظ اور مضبوط عہدہ تھا۔

میں تندہی سے اپنی خدمات انجام دینے لگا لیکن کبھی کبھی مجھے اس مشن کا خیال بھی آتا جس

کے لیے پالمرسن نے مجھے ہندوستان بھیجا تھا۔ جھانسی اور وہاں کی رانی لکشمی بائی کو تو میں کبھی فراموش کر ہی نہیں سکا تھا۔ مگر فی الحال میں اسے محض یاد ہی کر سکتا تھا۔ وہاں جا نہیں سکتا تھا۔

بغاوت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ زیادہ پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ نانا صاحب نے کانپور میں شکست کھانے کے بعد ملک کے بالائی حصے میں اودھم مچا رکھا تھا۔ دہلی ہنوز باغیوں کے قبضے میں تھا۔ جنرل ہیولاک کانپور میں موجود تھا لیکن صورتحال ایسی تھی کہ وہ محض چالیس میل دور لکھنؤ میں محصور ہنری لارنس کی مدد کو نہیں جا سکتا تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہیولاک نے کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کئی مرتبہ کانپور سے نکلا لیکن محض دس میل آگے جانے کے بعد اسے واپس آنا پڑا۔ پورا علاقہ باغیوں کے نرغے میں تھا اور وہ انگریزوں کی اتنی شدید مزاحمت کر رہے تھے کہ ان کے قدم جم ہی نہیں پا رہے تھے۔

برا یہ ہوا کہ لائیڈز کے ایڈوانس گارڈز آرا کے مقام پر باغیوں کے ہاتھوں مارے گئے اور اب کیننگ کلکتہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ اس نے کوئی حکمت عملی وضع نہیں کی اور نہ ہی کسی قسم کے احکامات جاری کیے۔

لیکن میں خود انٹیلی جنس ایڈی کی حیثیت سے پوری طرح مستعد تھا۔ صورت حال پر میں نے کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی اور اپنے جاسوسوں کے ذریعے گرد و پیش سے مکمل طور پر باخبر تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ اس بحران سے نمٹنے کے لیے کوئی ایسی حکمت عملی وضع کی جائے جس میں ہمارا کم سے کم نقصان ہو۔ شروع میں تو مجھے ایسی کوئی سبیل نظر نہیں آئی لیکن جب مجھے پتا چلا کہ جنرل کیمبل، کمانڈر انچیف بن کر آ رہا ہے تو مجھے ڈھارس سی ہوئی کیونکہ وہ اس وقت سلطنت برطانیہ کا سب سے تجربے کار اور بہترین جنرل تھا۔

ستمبر میں ہم نئے انتظامات کے تحت لکھنؤ روانہ ہوئے۔ اوٹرام ہمارا سربراہ تھا جو جنرل سے زیادہ کوئی درزی دکھائی دیتا تھا۔ راستے بھر بارش ہوتی رہی لیکن جنرل اوٹرام نے پیش قدمی موقوف نہیں کی۔ میں قافلے کے بالکل آخری سرے پر انٹیلی جنس گاڑی میں موجود تھا جہاں مجھے پل پل کی تحریری رپورٹیں، قیدیوں کے بارے میں رپورٹس اور اردگرد کے دوست راجے مہاراجوں کے متعلق ضروری معلومات مل رہی تھیں۔

شدید بارش کے باوجود باغیوں نے منگل واڑہ اور لکھنؤ کے قریب عالم باغ کے مقام پر

انگریزی فوج کو خاصا نقصان پہنچایا۔ مجھے ان نقصانات کے بارے میں بھی ایک ایک چیز کی رپورٹ ملی۔ وقتاً فوقتاً میں بھی بارش میں باہر نکلتا رہا اور ہیولاک کو مختلف نوعیت کے پیغامات روانہ کرتا رہا۔ ان میں سے ایک اب تک مجھے یاد ہے کہ بالاخر دہلی سرنگوں ہو گیا اور جان نکلسن کو گولی لگ گئی ہے۔

آخر کار ہم لکھنؤ تو پہنچ گئے لیکن ہیولاک اور اوٹرام دونوں میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کیا جائے۔ باغی پورے شہر میں مچھروں اور مکھیوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے چنانچہ جلد ہی یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ ہماری فوج سوائے محاصرے کے کوئی کارنمایاں انجام نہیں دے سکتی۔ ہم سات ہفتوں تک محاصرہ کیے پڑے رہے اور اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ کب باغیوں کے پاس راشن ختم ہو اور کب وہ ہمارے سامنے گھٹنے ٹیکیں۔

جس رات ہم لکھنؤ میں داخل ہوئے، میری طبیعت سخت خراب تھی۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ قے پر قے ہو رہی تھی۔ چنانچہ صبح ہونے سے پہلے پہلے میں ہیضے کا شکار ہو چکا تھا، جو زندگی میں دوسری بار ہوا تھا۔

کوئی پندرہ دن میں چارپائی سے لگا رہا۔ میری حالت کسی نیم مردہ چوہے سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور اسی وقت ایک دل خوش کن خبر ہمیں ملی کہ کیمبل، لکھنؤ کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ ہم نے گیریژن پر تو قبضہ کر لیا تھا لیکن شہر کے کئی علاقے اب بھی باغیوں کے نرغے میں تھے اس لیے کیمبل کے آنے کی خبر سے تمام ہی لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔

کانپور کے برعکس لکھنؤ میں ہم زیادہ وسیع علاقے کا دفاع کر رہے تھے۔ بہت سے عالی شان مکانات جو جزوی طور پر تباہ ہو چکے تھے، ہمارے قبضے میں تھے۔ جب میں صحت یاب ہوا اور اپنی کوٹھری سے باہر آیا تو مجھے ایک بنگلے میں بھیج دیا گیا جہاں ہیولاک اپنے اسٹاف ممبرز کے ساتھ مقیم تھا لیکن اس نے یہ سوچ کر کہ میں اوٹرام ہیڈ کوارٹرز میں زیادہ سودمند ثابت ہوں گا، مجھے وہاں بھیج دیا۔ ہیولاک ان دنوں کمانڈ کرنے میں زیادہ حصہ نہیں لے رہا تھا۔ اور اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ گوبن باغ میں صرف کرتا اور مطالعے میں مصروف رہتا تھا۔

وہ 9 یا 10 نومبر کی صبح تھی جب جنوبی سمت جہاں اینڈرسن کی کمپنی تعینات تھی، ایک زوردار

ہنگامے کے آثار نمودار ہوئے' پتا چلا کہ جنرل کیمبل لکھنؤ کے بہت قریب پہنچ چکا ہے اور یہ ہنگامہ دراصل اسی جوش وخروش کا نتیجہ ہے۔ جو اینڈرسن کی کمپنی میں اسے دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ صرف بڑے ہی نہیں بچے بھی خوشی سے کھنڈر بنی عمارتوں میں اچھل کود کرنے لگے تھے۔

اور پھر ہمیں بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دور' بہت دور گولیاں چل رہی تھیں۔ کسی نے باقاعدہ ردھم میں گانا شروع کر دیا۔ ''کیمبل آ رہا ہے ہُر ا' ہُر ا'' لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ مبارکباد دے رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ جیسے کیمبل نہیں' انہیں نئی زندگی کو نوید دینے یسوع مسیح زمین پر اتر آئے ہوں۔

اوٹرام کے چہرے سے بھی خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے چُرٹ کے چند لمبے لمبے کش لیے اور اسٹاف کانفرنس طلب کر لی۔ شاید اس کے نزدیک خوشی کے اظہار کا یہی طریقہ تھا۔

اب تک وہ باغیوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کے لیے مقامی جاسوسوں کا سہارا لے رہا تھا لیکن اب جبکہ کیمبل امدادی فوج لے کر اس کے دروازے پر آ پہنچا تھا تو وہ چاہتا تھا کہ اسے جنگی حکمت عملی کے بارے میں ہدایات دے کہ کس طرح وہ ریذیڈنسی تک پہنچنے کے لیے لکھنؤ کی گلیوں اور سڑکوں پر پھیلے ہوئے باغیوں سے مقابلہ کرے۔ باغیوں کی تعداد ساٹھ ہزار اور کیمبل کی فوج کی تعداد محض پانچ ہزار تھی۔ اس لیے اوٹرام اسے ایسا محفوظ راستہ بتانا چاہتا تھا جس سے گزرتے وقت کم سے کم تصادم اور نقصان ہو۔

میں اس سلسلے میں سوائے اس کے، اوٹرام کی کوئی مدد نہ کر سکا کہ اس کے پیغام کو خفیہ فرانسیسی زبان میں منتقل کر دیا اور پھر آرام کرنے کے لیے بغلی کمرے میں چلا آیا۔ سہ پہر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو کئی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں جن میں اوٹرام کی آواز سب سے نمایاں تھی۔

''ایک ایسے شہر میں سے سفید فام کا مقامیوں کے بھیس میں گزرنا خطرے خالی نہیں جس کے چپے چپے پر باغیوں کا قبضہ ہے۔ اگر وہ پکڑ لیا گیا اور پیغام ان کے ہتھے چڑھ گیا' تو پھر کیا ہوگا نپیئر؟''

''درست!'' نپیئر نے اس سے اتفاق کیا۔ ''میرے خیال میں پیغام سے زیادہ مناسب ایک گائیڈ کا بھیجنا ہوگا جو کیمبل کو راستہ بتا سکے اور اس سلسلے میں کیوانا ف بہتر رہے گا۔ وہ مقامیوں

کی طرح تمام راستوں سے واقف ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں'' اوٹرام نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ کسی صورت مقامی نہیں لگے گا۔ اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ ہے' بال گہرے سرخ ہیں' آنکھیں نیلی ہیں۔ ہندی بھی انگریزوں کے لہجے میں بولتا ہے..... دوسرا شخص کانن جی ہے لیکن وہ تو کیمبل کو صحیح گائیڈ بھی نہ کر پائے گا' کجا یہ کہ اس پر اتنے اہم پیغام کے سلسلے میں بھروسا کر لیا جائے۔''

''کانن جی کا کہنا ہے کہ وہ کیواناف کے ساتھ نہیں جائے گا' وہ تنہا جانے کو تیار ہے کیونکہ بقول اس کے کیواناف کی موجودگی میں پکڑے جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔''

میں دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ میں کیواناف کو جانتا تھا۔ وہ ایک آئرش سویلین تھا جس نے محاصرے کے دن تقریباً زیر زمین رہ کر گزارے تھے۔ لیکن اسے کیمبل کے فوجی دستوں تک پہنچنے کی ذمے داری سونپی جا رہی تھی۔ میں اوٹرام کے مسئلے کو بھی سمجھ رہا تھا۔ کیواناف واقعی کیمبل کے لیے ایک بہترین گائیڈ ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن شرط یہی تھی کہ وہ بہ حفاظت وہاں تک پہنچ جائے۔ میرے خیال میں امکان اس بات کا تھا کہ باغی اسے بہ آسانی شناخت کر لیتے اور پھر تشدد کے ذریعے اس سے پیغام اگلوانا ان کے لیے کوئی مشکل کام ثابت نہ ہوتا۔ وہ انتظار کرتے کہ کیمبل پیش قدمی کرے اور جب کیمبل آگے بڑھتا تو وہ..... میں اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکا کیونکہ اس صورت میں کیمبل یا اس کے فوجیوں کے بچنے کے امکانات صفر ہوتے۔

''تب پھر میرے ذہن میں ایک اور آدمی کا نام آ رہا ہے۔'' مجھے اوٹرام کی آواز دوبارہ سنائی دی ''وہی ایک ایسا شخص ہے جو مقامیوں کے درمیان سے بالکل انہی کے انداز میں سلامت گزر جائے گا' تم بھی اسے جانتے ہو گے.....''

میں چارپائی سے اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا جو باغ میں کھلتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اوٹرام کس کا نام لینے جا رہا ہے۔ ابھی میں نے بہ مشکل پانچ چھ قدم ہی اٹھائے تھے کہ دروازہ دھڑام سے کھلا اور اوٹرام اس کے بیچوں بیچ کھڑا دکھائی دیا۔ چرٹ اس کے ہاتھ میں تھا جسے اس نے میری جانب اٹھا رکھا تھا۔

''فلیش مین! یہی ہمارا آدمی ہے نپیئر' کیا تم اس سے بہتر آدمی پیش کر سکتے ہو؟''

یقیناً نپیئر ایسا نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی میں سرتابی کی جرأت کر سکتا تھا چنانچہ اوٹرام نے اپنے

تئیں مجھے اس مشن کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی غرض سے بہت سے دلائل دیے لیکن میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ فرار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اوٹرام کو جانے کس طرح میرے پہلے کارناموں کی بھنک مل گئی تھی اس لیے مجھے اپنی سابقہ شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے بھی یہ سب کچھ کرنا تھا۔

چنانچہ وہ شام میں نے اپنا حلیہ بدلنے اور جلد کی رنگت تبدیل کرنے میں صرف کی۔ ایک آدھ مرحلے پر میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ میں اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر انکار کر دوں لیکن اوٹرام اور نپیئر کی نظریں بہت تیز تھیں۔ وہ فوراً سمجھ جاتے کہ میں غلط بیانی کر رہا ہوں۔

میں نے اپنی تیاری مکمل کی تو کیواناف بھی تیار ہو کر آ گیا۔ اس نے رضا کارانہ طور پر میرے ساتھ جانے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ میرا بہروپ ایک مقامی بازاری شخص کا تھا جسے دیکھ کر سب لوگ نے انگلیاں دانتوں میں داب لی تھیں۔ وہ میری کارکردگی دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

اوٹرام نے کیمبل کے لیے پیغام کیواناف کے حوالے کیا تو اس کی تیز نگاہوں نے باری باری ہمارا طواف کیا۔ ''میرے خیال میں تم لوگوں کو یہ بتانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ پیغام دشمن کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے۔'' اس نے اپنے چرٹ سے ایک طویل کش لے کر ہمیں مخاطب کیا۔ ''ایسا ہونے کا مطلب صرف اور صرف ہماری تباہی ہے۔''

ہم دونوں ہی اس بات سے آگاہ تھے' چنانچہ ہم نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیے۔

تب اوٹرم نے ہمیں ہمارے روٹ سے آگاہ کیا۔ ہمیں شمالی گھاٹ سے تیر کر دریا پار کرنا تھا اور پھر پل کے ذریعے واپس ریذیڈنسی کے مغرب میں آنا تھا۔ یہاں سے ہم جنوب کی طرف شہر کے درمیان سے گزر کر دوسری جانب جا پہنچتے جہاں کیمبل کے ہراول دستے موجود تھے۔ کیواناف جو گلیوں سے واقف تھا' وہاں پہنچنے کا راستہ خود متعین کرتا جبکہ بات چیت کی ساری ذمے داری میری تھی۔

اوٹرام نے روانگی سے قبل ہم دونوں کی آنکھوں میں جھانکا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ تمام ساتھیوں نے ہم سے ہاتھ ملائے میں اس وقت خود کو پریوی کونسل کا کوئی رکن سمجھ رہا تھا۔ میری گردن فخر سے تنی ہوئی تھی جب کہ کیواناف مجھ سے زیادہ پر جوش تھا۔

پہلے اس نے اور پھر میں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ اگر کوئی برا وقت آیا تو ہم جان دے دیں گے لیکن اس پیغام کو دشمن کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔

مگر اس کی کوئی خاص نوبت نہیں آئی۔ ہم دریا پار کر کے دوسری سمت پہنچے اور وہاں سے پل کے ذریعے دوبارہ شہر میں داخل ہو گئے۔ کیوناف کی حالت مجھ سے زیادہ بدتر تھی۔ پانی نے ہماری جلد کی رنگت کو کسی حد تک دھو ڈالا تھا لیکن اطمینان یہ تھا کہ رات کے وقت جلد کا یہ ہلکا پن زیادہ محسوس نہیں ہوگا۔ مجھے اس سے زیادہ پریشانی کیوناف کے انداز و اطوار سے ہوئی تھی۔ وہ کوشش تو کر رہا تھا کہ اپنے چلنے کے انداز سے برطانوی نہ لگے لیکن میرے جیسا کوئی بھی کائیاں شخص محض ایک نظر دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ مقامی نہیں۔

میں نے اسے زیادہ تر خاموش رہنے کو کہا تھا کیونکہ اسے ہندی پر عبور نہیں تھا۔ ایک مقام پر اس نے مجھے روک لیا اور تقریباً سرگوشی کے انداز میں بولا ''یہ مسجد.....اور وہاں.....پھر وہ پتھر کا پل.....تمہیں نظر آ رہا ہے فلیشی.....اسے یہیں ہونا چاہیے.....ہمارے پاس کمپاس ضرور ہونا چاہیے تھے۔''

کچھ دیر وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا' پھر مجھے کہنی سے ٹہوکا دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ میں بھی خاموشی سے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ہم حتی المقدور گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ لیکن پھر ہم چوک بازار پہنچ گئے۔ میں نے یہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہاں روشنی بے حد کم تھی۔ باغیوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی لیکن وہ اپنے مشغلوں میں مصروف تھے چنانچہ ہم ان کی خصوصی توجہ حاصل کیے بغیر آگے بڑھ گئے۔

کچھ دور تک تو سکون رہا لیکن پھر اچانک اس نے میرا بازو پکڑ کر روک لیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے سرگوشی میں کیوناف سے پوچھا۔

''یہ مجھے قیصر باغ کا علاقہ لگتا ہے۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ تب مجھے اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ ہم راستہ کھو بیٹھے ہیں۔ میں نے وقت ضائع کیے یا پریشان ہوئے بغیر ایک راہ گیر کو روکا اور اس سے علاقہ کا نام پوچھا۔

''جنگلی گنج'' اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا لیکن اس نے ہمیں مشکوک نگاہوں سے ضرور دیکھا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس نے وہاں رک کر ہماری اصلیت جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''اگر یہ جنگلی گنج ہے تو پھر مرزا کبڑا کہاں ہے؟'' راہ گیر کے جانے کے بعد کیوناف خود کلامی کے انداز میں بولا۔

میرا دل تو چاہا کہ گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالوں اور خود آگے بڑھ جاؤں لیکن میں نے خود پر قابو پالیا اور اسے لے کر آگے بڑھ گیا' میں دوبارہ کسی راہ گیر کو روک کر راستہ پوچھنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

میری یہ احتیاط رائیگاں نہیں گئی۔ ایک جگہ رک کر کیوانا ف نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا ''مجھے پتا چل گیا ہے کہ ہم کہاں ہیں؟ یہ مولوی جناب گارڈن ہے' اس لیے ہمیں بائیں سمت چلنا چاہیے۔''

چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور حیدر کینال تک پہنچ گئے جہاں سے برطانوی لائنز تک کا راستہ بالکل سیدھا اور آسان تھا۔ ہمیں اب کوئی رکاوٹ درپیش نہیں تھی راستے میں کئی مقامات پر باغیوں کے فوجی دستے اور کسانوں کے گروہ بھی دکھائی دیے لیکن کسی نے ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا اور ہم بآسانی اپنے ساتھیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس سلسلے کا ایک دلچسپ پہلو یہ رہا کہ میں راستے بھر کیوانا ف کو اس کی بزدلی اور بوکھلاہٹ پر کوستا رہا۔ ایک آدھ بار تو اس نے پھنسوا ہی دیا ہوتا' اگر میں بروقت صحیح فیصلہ نہ کر لیتا۔ ایک مرتبہ میں نے جل کر اس سے کہا کہ میں تمہاری اس بہادری کے صلے میں تمہیں وکٹوریہ کراس دلوا دوں گا۔ وہ اس وقت تو خاموش رہا لیکن جب جنگ کے بعد واقعی اسے وکٹوریہ کراس دیا گیا تو مارے ندامت کے میں کچھ بول نہ سکا تھا۔ میرے لیے کسی تمغے کی تو درکنار کسی سند تک کی سفارش نہ کی گئی تھی جبکہ کیوانا ف کو وکٹوریہ کراس دینے کی توجیہہ یہ پیش کی گئی کہ اس نے سویلین ہو کر ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جو بہادر سے بہادر فوجی بھی شاید انجام نہ دے سکتا۔ حالانکہ صرف میں ہی نہیں بلکہ خود کیوانا ف بھی اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اس کے اس عظیم کارنامے میں میرا کتنا ہاتھ تھا۔

کیمبل نے لکھنؤ کو واگزار کرانے میں محض ایک ہفتہ لیا۔ (21) اس کے ساتھ ترانواں ہائی لینڈرز دستہ تھا۔ جس میں زیادہ تر سکھ تھے۔ انہوں نے راستہ تو وہی اختیار کیا جس کی نشاندہی ہم نے کی تھی لیکن وہ جتنے ظالم اور سفاک ثابت ہوئے اس کی توقع کم از کم مجھے نہیں تھی۔ انہوں نے ہر شے کو تباہ و برباد کر دیا جو ان کے راستے میں حائل ہوئی۔ جنرل کیمبل اور اس کے اسٹاف چیف مینسفیلڈ نے کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی تھی۔ ان کے احکامات کو سن کر کبھی تو میں یہ محسوس

کرنے لگتا جیسے ان میں کوئی بہت ہی خونخوار قسم کی بدروح حلول کر گئی ہو۔

بہر حال کیمبل مار دھاڑ کرتا برطانوی گیریژن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پیئر اور اوٹرام نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس موقع پر ایک پینٹر نے تصویر بھی بنائی جس میں فوج کے سربراہوں کو ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے دکھایا گیا تھا۔ گھوڑے کی پشت پر سوار میں بھی وہیں موجود تھا۔ میں نے ایک ہاتھ اس طرح فضا میں بلند کر رکھا تھا جیسے اس ملاقات پر بے حد خوشی کا اظہار کر رہا ہوں۔ (22)

لکھنؤ کا کچھ حصہ ہنوز باغیوں کے قبضے میں تھا۔ جنرل کیمبل نے باغیوں کو وہیں رہنے دیا اور فوج لے کر کانپور چل دیا جہاں تانتیا توپ' گیریژن کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ کیمبل نے اسے وہاں سے مار بھگایا اور وادی گنگا سے مزاحمت ختم کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا جبکہ ایک نئی فوج کی تشکیل بھی عمل میں آئی جس کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ کرسمس کے بعد دوبارہ لکھنؤ جاتی اور نہ صرف پورے شہر کو باغیوں سے چھڑاتی بلکہ ریاست اودھ میں سے ان کا نام ونشان تک مٹا دیتی۔

مجھے ایک بار پھر انٹیلی جنس کا کام سونپ دیا گیا تھا۔ میں کانپور سے ذرا فاصلے پر دریا کی دوسری جانب اونا میں تھا جہاں ہماری نئی فوج جمع ہو رہی تھی۔ وہاں کسی قسم کی کوئی فکر نہیں تھی بس ایک بار مجھے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا جب میں نے ایک اعلیٰ سوسائٹی کی طوائف کو کانپور کے پریڈ گراؤنڈ میں مدعو کر لیا تھا۔ اس غلطی پر حکام بالا کی طرف سے مجھے بے حد لتاڑا گیا جس کی وجہ سے پورا موسم سرما کڑکا سا گزرا۔

لیکن اس واقعے کا باغیوں سے ہماری لڑائی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم بدستور گرانڈ ٹرنک کے ساتھ ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے اور انہیں گوالیار کی طرف دھکیل رہے تھے۔ جہاں تانتیا توپ اپنی بچی کھچی فوج کے ہمراہ موجود تھا۔ وہاں باغیوں کو نئے سرے سے جمع کر رہا تھا تاکہ سرکار کے خلاف جدوجہد کو تیز کر سکے۔

جھانسی بھی وہیں تھا۔ انٹیلی جنس رپورٹوں میں روزانہ اس کا تذکرہ ہوتا تھا۔ لکشمی بائی کو باغی رانی اور غدار ملکہ کہا جا رہا تھا۔ کیونکہ خبریں ملی تھیں کہ جھانسی کے قتل عام کے بعد اس نے انگریز سرکار کے ساتھ جس وفاداری کا اظہار کیا تھا وہ اس سے مکر گئی ہے اور اس نے نانا اور باغی شہزادوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ جب پہلی مرتبہ مجھے اس کا علم ہوا تو مجھے دھچکا سا لگا تھا۔ میں اسے اب

تک بھولا نہیں تھا۔ اس کا خوبصورت چہرہ اور مخصوص جملہ اب بھی میرے ذہن میں تھا۔ ''ہم اپنے جھانسی سے دست بردار نہیں ہوں گے.....ہم اپنے جھانسی سے دستبردار نہیں ہوں گے۔''

لیکن اب اس نے خود اپنی حرکتوں سے اس کام کو آسان کر دیا تھا۔ جنرل روز کی سرکردگی میں ہماری جنوبی افواج شمال میں گوالیار اور بندھیل کھنڈ کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں۔ جلد ہی وہ دیگر باغی شہزادوں اور اپنی ڈاکوؤں پر مشتمل فوج کے ہمراہ کچلی جاتی لیکن مجھے اس بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ ظاہر ہے اگر وہ انگریز کا ساتھ دیتی تو اس کا راج بچ سکتا تھا مگر اس راستے کا انتخاب اس نے خود کیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جھانسی کے بارے میں رپورٹیں بڑھتی گئیں۔ رانی میرے ذہن پر قبضہ جماتی گئی۔ میں نے بارہا ایک فوجی کے انداز میں سوچنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ کسی نہ کسی حوالے سے مجھے وہ دن ضرور یاد آ جاتے تھے جو میں نے اس کی معیت میں گزارے تھے۔ مجھے اس کا ریشمیں بدن یاد آتا جو شیشوں سے آراستہ و پیراستہ محل میں ایک جھولے پر ہلکورے لیا کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ کیا وہ اب بھی وہاں ہلکورے لے رہی ہوگی یا اپنے باغ میں بندروں اور طوطوں کے ساتھ کھیل رہی ہوگی یا دریا کنارے کے جنگل میں گھڑ سواری کر رہی ہوگی .....لیکن کس کے ساتھ؟ وہ اس رات کے بعد اپنے کتنے چاہنے والوں کو اس حویلی میں بلا چکی ہوگی؟ میں جوں جوں اس کے بارے میں سوچتا میرے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ جانے کیوں رانی نے میرے دل میں ایک عجیب سا مقام حاصل کر لیا تھا۔

بہر طور موسم سرما رفتہ رفتہ گزرتا رہا اور شمال میں ہماری مہم اپنے اختتام کے قریب پہنچتی رہی۔ مجھے اس کا پتا اس وقت چلا جب دی ٹائمز کا نمائندہ بل رسل' جنرل کیمبل سے ملنے لکھنؤ پہنچا۔ اخباری نمائندوں کی آمد فتح کی نشانی ہوا کرتی تھی۔ (23)

ہمارے ساتھ تیس ہزار فوجی اور مضبوط آرٹلری تھی لیکن میں خود خطرناک معاملات سے دور مینسفیلڈ کے انٹیلی جنس پیپرز کے انباروں تلے دبا ہوا تھا۔ ہم جہاں سے گزرتے باغیوں کو تہس نہس کر دیتے۔ ہمارے گنر زان کے مورچوں کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتے۔ بالائی علاقوں اور آئرلینڈ کے فوجی انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ ہمارے انجینئرز نہ صرف عمارتیں بلکہ مسجدیں' مندر اور گوردوارے بھی منہدم کرتے جا رہے تھے تاکہ ہندوستان میں رہنے والوں کو بتا

سکیں کہ اس ملک کا صحیح آقا کون ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق لوٹ مار میں مصروف تھا۔

یہ ایک خونی میلہ تھا جس میں تمام لوگ اپنی اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے تھے۔ ایسا ہی واقعہ مجھے یاد ہے جو لکھنؤ میں (شاید بیگم محل میں) پیش آیا۔ میں نے بالائی علاقوں کے رہنے والوں کو دیکھا' ان کی رائفلیں ایک سمت پڑی تھیں۔ ان کے سینے کھلے ہوئے تھے جن پر موتیوں کے ہار چمک رہے تھے۔ گورکھے زر و جواہر کی تلاش میں اپنے چاقوؤں سے ریشمی ملبوسات اور انسانی جسموں کی چیر پھاڑ میں مصروف تھے۔ سکھ انفنٹری سونے کے ہار پہنے رقص کر رہی تھی۔ ہر جانب قریب المرگ لوگ تھے۔ زخمی اور ان کی کراہیں تھیں۔ لیکن ہمارے فوجی ان تمام باتوں سے بے پروا اپنے ہی ہم وطنوں کو لوٹنے میں مصروف تھے۔

میرے ایک راجپوت اردلی نے بھی اس لوٹ' مار میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ ہیروں کی ایک زنجیر میرے پاس لایا جسے میں نے دس روپوں میں خریدا لیکن اسی زنجیر کو میں نے کلکتہ کے ایک جوہری کے پاس ساڑھے سات ہزار پاؤنڈ میں فروخت کیا۔ اس وقت بھی مجھے یقین تھا کہ جوہری نصف قیمت بھی ادا نہیں کر رہا۔

اس کے علاوہ ہم آفیسرز نے بھی خوب لوٹ مار کی اور اچھی طرح اپنے دل کی حسرتیں مٹائیں۔ (24) میں اس وقت بھی اپنے حصے کی لوٹ مار کا حساب ہی کر رہا تھا جب جنرل مینسفیلڈ نے مجھے شانے پر تھپکی دی۔ ''سر کولن اسی وقت تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

میں نے اپنا چرٹ فوراً جلتی ہوئی آگ میں اچھالا اور چیف کے ٹینٹ کی طرف چل دیا۔

جنرل کولن کیمبل میرا ہی منتظر تھا ''تم جھانسی کی رانی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی براہ راست سوال کیا۔

مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ جھانسی کے بارے میں روزانہ ہی خبریں مل رہی تھیں اور جنرل کیمبل خود بھی اس مشن کے بارے میں جانتا تھا جو میں لارڈ پالمرسن کے لیے انجام دے رہا تھا۔

میں نے جواب دیا کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور ہم نے اکٹھے بہت سی باتیں کی ہیں۔

''اور اس کا شہر.....اس کا قلعہ؟'' کیمبل نے پوچھا

''میں نے اس کا قلعہ گھوم پھر کر نہیں دیکھا سر!'' میں نے جواباً کہا۔''ہماری زیادہ تر ملاقاتیں محل میں ہوتی تھیں۔اس لیے میں شہر کے بارے میں بھی زیادہ نہیں جانتا.....''

''لیکن سر ہوگ روز سے تو زیادہ ہی جانتے ہوگے۔''جنرل نے میری بات کاٹی اور ساتھ والی میز سے ایک کاغذ اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا''اور یہ اس کا اپنا خیال ہے۔اس نے اپنے تازہ ترین خط میں تمہارا بطور خاص ذکر کیا ہے۔''

مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو جنرلوں کے منہ سے اپنا نام سن کر آپے سے باہر ہو جایا کرتے تھے۔لہٰذا میں خاموش ہی رہا۔

''یہ رانی!'' بالآخر کیمبل ہی بولا تھا''کیسی عورت ہے؟''

میں نے کہنا شروع کیا کہ وہ ایک قابل' باصلاحیت اور زیرک حکمران ہے۔جو لوگ اسے بے وقوف سمجھتے ہیں' درحقیقت وہ خود بے وقوف ہیں۔

''کیا وہ خوبصورت ہے؟ کیمبل نے اگلا سوال کیا۔

''ہاں''میں نے اعتراف کیا''وہ بے پناہ خوبصورت ہے''اور جنرل کیمبل تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔

میں مزید کچھ کہے بغیر خاموشی سے اسے تکتا رہا۔

''سر ہوگ نے تمہیں جھانسی بلوایا ہے' اور میں تمہیں وہاں بھجوا رہا ہوں''

میں اب بھی چپ رہا۔جانے اس کے ذہن میں کیا تھا تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی بولا۔

''ہمارے علاقے میں بغاوت اب ختم ہونے کو ہے۔یہاں' اودھ' روہیل کھنڈ اور بندھیل کھنڈ میں بچے کھچے فوجی رہ گئے ہیں جو کسی بھی وقت ہمارے ہتھے چڑھ سکتے ہیں لیکن جھانسی اب بھی باغیوں کی آخری امید ہے۔یہ شہر ہمارے لیے بھی لوہے کا چنا ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ رانی کے پاس دس ہزار افراد اور قلعے کی مضبوط دیواریں ہیں۔سر ہوگ نے شہر کا محاصرہ کر رکھا ہے لیکن اب تک وہ اندر داخل ہونے کی کوئی سبیل پیدا نہیں کر سکا۔سر ہوگ اب بعض سفارتی ہتھکنڈے استعمال کرنا چاہتا ہے۔تم چونکہ رانی اور اس کی مملکت کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو اس لیے سر ہوگ تمہیں اپنے لیے ضروری خیال کرتا ہے۔لارڈ کیننگ اور سر ہوگ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ تم اس عورت سے نمٹنے کے لیے بہترین ثابت ہو سکتے ہو۔''جنرل نے احتیاط کے ساتھ میری آنکھوں

میں جھانکا ''اس لیے کہ وہ جھانسی کی رانی کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔''

◈◈◈

اگر وہ چڑیلوں کی طرح بدصورت ہوتی یا اپنی موجودہ عمر سے بیس سال بڑی ہوتی تو کوئی اس قسم کی خواہش نہ کرتا۔ جھانسی پر قبضہ کرلیا جاتا اور بوڑھی رانی کو بغیر سوچے سمجھے گولی سے اڑا دیا جاتا لیکن کیننگ' ہمارا گورنر جنرل، پرلے درجے کا بے وقوف شخص تھا۔ اس نے ہزاروں برطانویوں کو مقامی باغیوں کی بغاوت کی بھینٹ چڑھا دیا تھا لیکن شاید وہ ایک نوجوان اور خوبصورت باغی شہزادی کی موت سے خوفزدہ تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ پورے ہندوستان میں شہرت حاصل کر چکی تھی اور کیننگ کو ڈر تھا کہ کہیں اس کی موت کسی نئی بغاوت کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ وہ ہندوستان کی جون آف آرک تھی۔ اس لیے کیننگ چاہتا تھا کہ خواہ کتنے ہی مقامی یا برطانوی کیوں نہ مر جائیں اسے زندہ گرفتار کیا جائے۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میرے نزدیک اپنی بیوی الزبتھ کے علاوہ کوئی عورت اتنی قیمتی نہ تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ رانی لکشمی بائی بھی اس سے کم نہ تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اس کے خلاف اس سازش کا حصے دار نہ بنوں کیونکہ میں اسے واقعی بچانا چاہتا تھا لیکن شاید میرے لیے یہ کسی بھی طور ممکن نہ تھا۔

میں نے جھانسی پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ تاخیر کی۔ اس امید پر کہ شاید اس سے پہلے سارا معاملہ ختم ہو چکا ہو۔ میرے پاس اس تاخیر کا بہت مضبوط جواز تھا کہ لکھنؤ سے جھانسی تک دو سو میل کا علاقہ باغیوں سے اٹا پڑا تھا۔ میرے ساتھ پٹھان گھڑ سواروں کا دستہ تھا جو کسی بھی صورتحال سے اچھی طرح نمٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود میں مارچ کے آخری ہفتے میں جھانسی پہنچا۔

جنرل روز اب بھی شہر کے دفاع کو اپنی گنوں سے توڑنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس کی فوج قلعے میں داخل ہونے کو بے چین تھی لیکن ابھی تک اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔

روز ایک اچھا سپاہی تھا۔ کیمبل کی طرح محتاط لیکن اس سے دگنا' تیز رفتار۔ باغیوں کی دفاعی

پوزیشنوں کو دیکھ کر جنرل روز کی ناکامی پر کوئی حیرت نہیں کی جاسکتی تھی۔ جھانسی کی مضبوط دیواریں چمکتے سورج کی گرمی میں اب بھی مضبوط کھڑی تھیں۔ قلعے پر باغیوں کا سرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ دیواروں کے آس پاس برطانوی فوجوں کے غول کے غول جمع تھے جو وقفے وقفے سے قلعے پر گولہ باری کرتے لیکن اندر سے انہیں پیش قدمی کا موقع نہ دیا جاتا۔ دیواروں کے عقب میں دس ہزار جیالے موجود تھے جو جی داری سے انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔

لیکن جنرل روز مایوس نہیں تھا۔ ''ہم ایک ہفتے میں انہیں نکال باہر کر سکتے ہیں'' اس نے مجھے بتایا اور ہاتھ سے قلعے کی دیواروں کے ان حصوں کی طرف اشارہ کیا جو گولہ باری سے کمزور ہو گئے تھے اور کسی بھی لمحے ان میں شگاف ہو سکتے تھے ''جونہی یہ شگاف بڑے ہوئے' رات کی تاریکی میں ہمارے فوجی قلعے پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تب اندر موجود تمام لوگ ہمارے رحم و کرم پر ہوں گے لیکن ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ رانی کو کس طرح محفوظ رکھا جائے؟ تم اس موضوع پر ہمارے لیے اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہو۔ کیا تمہارے خیال میں وہ رضا کارانہ طور پر ہتھیار ڈال دے گی۔؟''

ہم اس وقت ایک چٹان پر کھڑے تھے۔ ہمارے بالکل سامنے محاصرہ کرنے والی برطانوی فوجوں کی گنیں تھیں جن کے دھماکوں سے زمین بری طرح لرز رہی تھی۔ فضا دھواں دھار ہو رہی تھی جس میں گنرز تک چھپ گئے تھے۔ وہ چیونٹیوں کی مانند اِدھر اُدھر رینگ کر گنیں لوڈ کر رہے تھے تاکہ دشمن کی نگاہ میں نہ آئیں۔ دور دور تک جہاں نگاہ جاتی تھی کیولری کے کیمپ تھے۔ لائٹ ڈریگنز کی سرخ جیکٹیں اور حیدر آبادی ٹروپرز کے خاکی کوٹ صاف دکھائی دے رہے تھے۔

ہمارے آگے پیچھے دو میل کے فاصلے پر پرانی چھاؤنی کے کھنڈرات کے پاس انفنٹری بریگیڈ کے خیموں کی نہ ختم ہونے والی قطاریں تھیں جو اس بات کے منتظر تھے کہ کب گنیں جھانسی شہر کی فصیل میں شگاف ڈالیں اور کب وہ پیش قدمی شروع کریں۔ سب کی نگاہیں شہر کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جہاں کئی جلنے والی عمارتوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔

اسی دھوئیں کے پار کسی جگہ وہ بھی موجود تھی۔ اپنے ٹھنڈے دربار روم یا ٹیرس میں۔ اپنے مخصوص بندروں سے کھیلتی ہوئی یا ممکن ہے اپنے فوجی سربراہوں سے کسی اجلاس میں مصروف ہو۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی وہی الفاظ ہوں گے ''ہم اپنے جھانسی سے دست بردار نہیں ہوں گے۔''

''ہتھیار ڈال دے گی؟'' میں نے اپنے خیالات سے چونک کر جنرل کا لفظ دہرایا۔ ''نہیں' مجھے اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی''

''تم اسے بہتر جانتے ہو'' اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ گزشتہ چند گھنٹوں کے دوران جب بھی رانی کا نام آیا تھا وہ انہی نظروں سے مجھے دیکھتا تھا۔ ''ہم نے صلح صفائی کی کوشش بھی کی ہے'' جنرل روز نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا تھا ''لیکن ابھی تک کوئی مثبت جواب نہیں مل سکا البتہ ہمارا خیال ہے کہ شاید وہ اپنی آبادی پر گولہ باری زیادہ عرصے برداشت نہ کر سکے جب کہ وہ یہ بھی جانتی ہو کہ گولہ باری کے بعد پیدل فوج آگے آئے گی جو اس کے لوگوں کو کاٹ کر رکھ دے گی' میرا مطلب ہے کہ ایک عورت کی حیثیت سے شاید وہ اتنی جی دار نہ ہو' تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ کیسی عورت ہے؟''

''ایک قابل احترام خاتون'' میں نے جواب دیا ''بے انتہا محبت کے قابل' وہ فرانسیسی سینٹ استعمال کرتی ہے۔ جانوروں پر بے حد مہربان ہے' دن میں کئی بار عبادت کرتی ہے۔ شیشے لگے کمرے میں اپنے جھولے میں بیٹھی ہلکورے لیتی رہتی ہے۔ اپنے شہر کی معزز خواتین کو پارٹیوں پر مدعو کرتی ہے اور جرائم پیشہ افراد کو کڑی سزائیں دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھی شہسوار بھی ہے۔''

''گڈ' گاڈ! کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''اس کے عاشقوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' جنرل کے ایک اسٹاف ممبر نے دریافت کیا ''ہم نے سنا ہے کہ اس نے اپنے حرم میں مضبوط اور توانا قسم کے مرد پال رکھے ہیں جو ہر رات.....''

''اس نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا'' میں نے تیز لہجے میں اس کا جملہ کاٹا ''نہ میں نے اس سے پوچھا' اور میرے خیال میں اگر تمہارا اس کا سامنا ہو جائے تو تم بھی نہیں پوچھ پاؤ گے۔''

''بہر حال'' جنرل روز نے ایک بار پھر اپنے مخصوص انداز میں مجھے گھورا ''ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس کے بارے میں کیا کیا جائے؟''

یہ وہ مسئلہ تھا جس سے میں اگلے تین روز تک الجھتا رہا۔ اس عرصے میں ہماری توپیں جنوبی

دیوار میں ایک شگاف ڈالنے میں کامیاب ہوگئی تھیں اور جو لوگ اس شگاف کی مرمت کرنے آگے بڑھے تھے انہیں بھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ آٹھ انچ کے مارٹروں نے ان کی گن پوسٹوں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ صورت حال اس حد تک ہمارے حق میں ہوگئی تھی کہ 29 تاریخ کو جنرل روز نے اپنی انفنٹری کو پیش قدمی کے احکامات دے دیے تھے جبکہ دوسری طرف ہم بدستور رانی کو زندہ سلامت پکڑنے کے منصوبے پر کام کر رہے تھے۔

میں نے ذاتی طور پر اس مسئلے کے بارے میں خوب سوچا تھا اور ہر بار اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر ہماری انفنٹری جھانسی میں داخل ہوگئی تو رانی کو زندہ گرفتار کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ وہ یقیناً جنگ میں حصہ لیتی اور بالآخر ماری جاتی۔ یہ سوچ کر میرے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔

لیکن میں خون کی اس ہولی میں اس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟ کیا کسی ایک مخصوص پلاٹون کو یہ احکامات دے دیے جاتے کہ وہ اس کے محل میں داخل ہو کر ہر قیمت پر اسے زندہ گرفتار کر لائے لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے بحفاظت باہر لے آتے۔ اگر ذاتی طور پر میں اسے محل سے نکال لانے کی ذمے داری قبول کر لیتا تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ محفوظ رہتی۔ اپنے افسران کی گندی ذہنیت سے میں پوری طرح واقف تھا۔ اسے برطانوی دستوں کی حفاظت میں کلکتہ بھیج دیا جاتا جہاں ہمارے بڑے اس کے مستقبل کا فیصلہ کرتے۔ خاصا طویل اور کٹھن سفر تھا۔ اگر میں اس دستے کے ہمراہ ہوتا تو وہ اپنے دشمنوں میں ایک جانے پہچانے چہرے کو دیکھ کر یقیناً خوش ہوتی' خاص طور پر ایک ایسے چہرے کو جس کے ساتھ اس کے ماضی کی کچھ یادیں بھی وابستہ تھیں۔

میرے ذہن میں ایک بار پھر جھانسی کی وہ حویلی اور اس کا تانبے کا سابدن در آیا شاید زندگی بھر میں اس رات کی یادوں سے دامن نہ چھڑا سکتا تھا۔

میں روز کے پاس پہنچا اور اسے اپنی سوچوں سے آگاہ کر دیا.....لیکن صرف پہلے حصے سے یعنی خصوصی پلاٹون والے آئیڈیا سے .....باقی حصے کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا.....ہم دونوں اس کے خیمے میں ڈنر پر تھے۔ وہ توجہ سے میری بات سنتا رہا جس کے بعد انکار میں سر ہلانے لگا۔

''نہیں'' بالآخر وہ بولا۔ ''ہمیں اس کے محل تک پہنچنے سے پہلے ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ جنگ سے پہلے ہی اسے محفوظ مقام تک پہنچانا ہوگا۔''

''لیکن یہ کیسے ہوگا؟'' میں نے دریافت کیا ''ہم اپنے فوجی دستے شہر میں بھیجنے سے قبل کسی کو اسے اغوا کرنے یا ساتھ لانے کے لیے تو نہیں بھیج سکتے۔ وہ جھانسی کی گلیوں میں سوگز بھی نہ جانے پائے گا اور اگر کسی طرح کامیاب ہو بھی گیا تب بھی رانی کے پاس پٹھان محافظ ہیں جو اس کے محل کے چپے چپے کی حفاظت کرتے ہیں''

''نہیں'' اس نے پرخیال انداز میں کہا اور اپنا چرٹ اٹھالیا ''فوجی دستے کی حد تک میں متفق ہوں..... لیکن سیاسی چال..... تمہارا کیا خیال ہے لیسٹر؟''

وہ نوجوان ہیری لیسٹر تھا' جنرل روز کا گیلو پر۔ ہم دونوں کے علاوہ صرف وہی وہاں موجود تھا۔ بس گزشتہ دس سالوں سے اسے جانتا تھا۔

''رشوت!'' وہ بولا ''اس کے افسران کو کس قسم کی پیشکش کی جائے''

''اس میں بے حد پیچیدگی ہے'' روز نے کہا ''اس سے سوائے رقم کے ضیاع کے کچھ نہیں ہوگا''

''ان لوگوں نے اس کا نمک کھایا ہے'' میں نے اظہار خیال کیا ''تم لوگ انہیں نہیں خرید سکتے۔ موجودہ حالات میں کسی خفیہ پیغامبر کو بھیجے جانے کا خطرہ بھی مول نہیں لیا جاسکتا..... میں تو یہی سمجھتا ہوں سر! کہ آخر کار بات اسی خصوصی پلاٹون پر آئے گی۔ ایک باصلاحیت مقامی افسر اور اس کے ساتھ قابل جوان.....''

''نہیں'' جنرل روز نے زور زور سے نفی میں گردن ہلائی ''ہمیں دھوکے سے اسے باہر لانا ہوگا۔ ایک امکان یہ ہے کہ ہم شہر پر دھاوا بول دیں لیکن اس کے لیے راستہ کھلا رکھیں۔ اگر ہم آرکا گیٹ سے اپنی کیولری پکٹس ہٹالیں تو وہ لوگ ہماری اس کمزوری کو بھانپ لیں گے اور جب ہماری باغی خاتون یہ دیکھے گی کہ اس کے شہر پر گولہ باری ہو رہی ہے تو یقیناً فرار ہونے کے بارے میں سوچے گی..... ارے یہ تو بتاؤ کہ ہندوستانی عورتیں گھڑسواری کرسکتی ہیں؟''

''میں نے بتایا تھا سر کہ وہ بہت اچھی گھڑسوار ہے۔ ایک پولش لانسر کی طرح۔ اگر اسے کوئی شک نہ ہوا تو وہ ایسا ہی کرے گی لیکن ذرا سا بھی شک ہوا تو.....''

''وہ اب تک گولہ بارود کی اتنی بو سونگھ چکی ہے کہ اسے کسی اور قسم کی بو کا احساس ہی نہیں ہوگا'' جنرل نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''وہ تانتیا یا کسی اور باغی لیڈر سے جا ملنے کے لیے یقینی طور پر شہر چھوڑ

دے گی اور ہم آرکارڈ پر اس کے منتظر رہیں گے' تمہارا کیا خیال ہے دوستو؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

مجھے تجویز بھلی لگی تھی جبکہ لیسٹر نے تو باقاعدہ اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''میرے خیال میں اسے آزمانا چاہیے'' جنرل روز خود ہی بولنے لگا ''لیکن ایک جزوی منصوبے کے طور پر لارڈ کیننگ' رانی کو زندہ گرفتار کرنے کے معاملے کو بے حد اہمیت دے رہا ہے۔ ہمارے پاس ایک ایسا ٹرمپ کارڈ بھی موجود ہے جسے ہم رانی کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں'' وہ میری طرف مڑا ''اور وہ تم ہو فلیش مین''

میں بیئر کے گلاس سے گھونٹ بھر چکا تھا چنانچہ میں نے ٹھسکے سے بچنے کے لیے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے ''میں' سر؟'' میں نے ایک طویل سانس لی ''کس طرح سر؟ میرا مطلب ہے' کیا.....؟''

''تم اس عورت کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو' سو ہم اس موقع کو ضائع نہیں کر سکتے۔ اس سے تمہاری جان پہچان ہمارے لیے بہت سودمند ہوگی۔ میں تمہارے علاوہ کسی ایسے سفید فام کو نہیں جانتا جو اس سے اس قدر قریب رہا ہو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے سر! لیکن میں نہیں سمجھتا.....''

''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم بات چیت کے ذریعے اسے باہر نکال سکتے ہیں۔ ہم اس بات سے متفق ہیں کہ ہتھیار ڈالنے کی دوسری پیشکشیں بے کار ہیں ..... لیکن ایک خفیہ اور نجی پیشکش ..... میری اور لارڈ کیننگ کی ضمانت کے ساتھ ..... یقینی طور پر ایک مختلف معاملہ ہوگا۔ خاص طور پر یہ پیشکش ایک ایسا برطانوی افسر دے جس پر وہ اعتماد کرتی رہی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور جنرل روز نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

''پیشکش میں اسے یقین دہانی کرائی جائے گی کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دے تو اس کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔ اسے جھانسی سے دست بردار نہیں ہونا پڑے گا۔ اور نہ ہی خود اس کی بے عزتی یا بے حرمتی کی جائے گی۔ بھلا وہ اس سے کیسے انکار کرے گی؟ اور اگر وہ رضامند ہو جاتی ہے تب اسے' اس خفیہ راستے سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے جو آرکا گیٹ خالی کر کے ہم اسے فراہم

کریں گے۔ وہ اپنے لوگوں کو کہہ سکتی ہے کہ فرار کی کوشش وہ ذاتی طور پر کر رہی ہے' البتہ جونہی وہ شہر سے نکلے گی ہم اسے پکڑ لیں گے۔ رانی کے علاوہ کسی اور شخص کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی کہ فرار کا پہلے سے منصوبہ بنایا گیا تھا۔''

لیسٹر نے تیوری چڑھائی ''کیا وہ اسے قبول کر لے گی .....اور اپنے شہر اور عوام کو برطانوی فوجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے گی؟'' اس نے مجھے گھورا۔

''یقیناً!'' جنرل روز نے نسبتاً بلند آواز میں کہا ''وہ برطانوی ضمانتوں پر یقیناً بھروسا کرے گی۔ میں نے دیکھا ہے کہ مقامی حکمران اپنی جان سے زیادہ کسی بات کو اہمیت نہیں دیتے' کیا خیال ہے فلیش مین؟''

میں نے ایک ڈوبتے ہوئے شخص کے تاثرات چہرے پر سجا کر جنرل کو دیکھا ''لیکن یہ دیتی ہے سر! وہ ان سے کبھی غداری نہیں کرے گی۔'' مجھے یقین تھا کہ میں جو بات کہہ رہا تھا رانی ویسا ہی کرے گی۔

''لیکن مجھے یقین ہے کہ تم غلطی پر ہو فلیش مین'' جنرل روز نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''ہم اس منصوبے کو آزمائیں گے ضرور!''

''لیکن اگر میں سفید جھنڈے کے ہمراہ اندر جاؤں اور اس سے نجی ملاقات پر اصرار کروں تو.....''

''یہ سفید جھنڈے کی بات تم سے کسی نے کہی ہے؟ اس طرح تو سارا راز افشا ہو جائے گا۔ اس کے عوام کو پتا چل جائے گا کہ ان سے چھپا کر کچھ کیا جا رہا ہے'' اس نے میز پر انگلیاں بجاتے ہوئے مجھے دیکھا ''میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ تم ہمارے ٹرمپ کارڈ ہو؟ تم صرف اسے اچھی طرح جانتے ہی نہیں ہو' بلکہ ان چند افراد میں سے ایک ہو جو جھانسی کے اندر جا سکتے ہیں اور اس سے نجی طور پر مل سکتے ہیں'' جنرل نے ایک قہقہہ لگایا ''تم اس سے پہلے بھی تو ملتے رہے ہو؟ اور پھر مجھے پتا ہے کہ کیوا ناف کے ساتھ لکھنؤ میں سے گزرنے والا پٹھان کون تھا؟''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ میں اپنے مقدر پر غور کرنے لگا کہ کس کس کے ہاتھوں استعمال ہوں گا؟ پہلے پالمرسن' پھر اوٹرام اور اب روز۔ تینوں ہی ان پاگلوں میں شامل تھے جن کے خیال میں' میں واحد آدمی تھا جو ان کے مقاصد کے حصول میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

پچھلے سارے واقعات میں تو میں کامیاب رہا تھا۔ اسی بنا پر اب مجھ سے کہا جا رہا تھا میں رانی جھانسی کو فرار ہونے پر آمادہ کروں۔ اگر وہ رضامند ہو گئی تو مجھے اسے بتانا ہوگا کہ وہ کس طرح آرکا گیٹ کو استعمال کرے جبکہ اس وقت پورا جھانسی شہر ہماری گولہ باری کی زد میں ہوتا۔ اس سلسلے میں وقت کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ جنرل روز کے خیال میں جھانسی کی اینٹ سے اینٹ بجائے جانے سے قبل رانی کا فرار بے حد ضروری تھا۔

''اور اگر اس نے پیشکش نامنظور کر دی..... جیسا کہ میں جانتا ہوں' وہ کر دے گی؟'' میں نے دریافت کیا۔

''تب پھر تم آرکا گیٹ سے متعلق اسے کوئی بات نہیں بتاؤ گے'' جنرل نے مجھے ہدایت کی ''جب وہ پیشکش قبول کر لے' پھر اسے بتانا کہ کس طرح اور کس راستے سے فرار ہوا جا سکتا ہے۔ بالفرض وہ فوری طور پر فرار نہ بھی ہوئی تب بھی مجھے یقین ہے کہ آخری لمحات پر وہ ایسا ہی کرے گی' تب بھی ہم اسے بچ کر جانے نہ دیں گے''

''اور میں _____ اگر اس سے انکار کر دیا تو _____؟''

''میرے خیال میں وہ تمہیں یرغمالی بنا لے گی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرے گی''

جنرل روز نے قہقہہ لگایا لیکن میں اندر سے کانپ اٹھا ایک بار پھر مجھے جہنم میں دھکیلا جا رہا تھا اور میں جاننے بوجھنے کے باوجود اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا لکشمی بائی میری بات سنے گی؟ یقیناً نہیں۔ وہ اس وقت فرار ہونے کی کوشش کرے گی جب سب کچھ کھو چکی ہو گی لیکن فی الوقت وہ اپنے عوام کو مرنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑے گی تب وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ مجھے وہ وقت بھی یاد تھا جب میں نے شمشیر زنی کے مقابلے میں اسے ہرایا تھا۔ وہ میرے بازوؤں میں تھی۔ میں نے اپنے ہونٹوں سے اس کے ادھ کھلے لبوں کو چھوا تھا۔ پھر وہ حویلی بھی مجھے یاد تھی..... نہیں..... وہ مجھے نقصان نہیں پہنچائے گی..... میرے ذہن میں وہ ٹھگ بھی آئے جنہوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ ممکن ہے وہ اگنتیف کی کوئی سازش رہی ہو۔ جھانسی کا قتل عام تھا۔ وہ کس حد تک اس میں ملوث تھی؟ کیا وہ واقعی اتنی ہی ظالم اور بے رحم تھی؟ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میرا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ مجھے پریشان کرے گی یا ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔

جنرل روز نے محض تیس سیکنڈ کے اندر اندر ایک ایسا طریقہ ڈھونڈ نکالا جس پر عمل کر کے میں بحفاظت جھانسی میں داخل ہو سکتا تھا۔ اگلا سارا دن مجھے اپنی جلد رنگنے اور بھیس بدلنے کو درکار تھا جس کے بعد رات کو حیدر آبادی کیولری فصیل شہر میں ہونے والے شگاف کی طرف پیش قدمی شروع کر دیتی۔ وہ کچھ محافظوں کو قتل کرتے پھر پیچھے ہٹ آتے لیکن ایک مقامی بدمعاش کو وہیں چھوڑ آتے جو درحقیقت کرنل فلیش مین ہوتا۔ میں اس طرح بہ آسانی اندر چلا جاتا اور گلیوں گلیوں اس کے محل تک جا پہنچتا۔

سارا دن میں نے ایک سپاہی کی گندی یونیفارم میں گزارا تا کہ رات کی تاریکی میں تھرڈ کیولری کے ایک باغی کا کردار بخوبی ادا کر سکتا۔ وہ لمحہ تو میں کبھی نہ بھولا جب میرے اردگرد پھیلے ہوئے حیدر آبادی ٹروپرز نے گولہ باری شروع کر دی۔ روز نے مجھے شانوں پر تھپکی دی اور پھر اپنے دستوں کو پیش قدمی کے احکامات دینے لگا۔

دور بائیں جانب ہماری نائٹ بیٹریز فائرنگ کر رہی تھیں۔ یہ دشمن کی توجہ ہٹانے کے لیے ہو رہا تھا۔ میں گھوڑے پر سوار اپنے محافظوں کے ہمراہ آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے قریب ہی ایک رائفل گرجی اور پھر کسی کی چیخ سنائی دی۔ لیکن اندھیرے میں مجھے یہ علم نہ ہو سکا کہ گولی کھانے والا مر گیا ہے یا زندہ ہے ..... میں اپنے گھوڑے کی گردن سے چپک گیا تھا اور وہ اندھا دھند شگاف کی طرف بھاگ رہا تھا۔

حیدر آبادی میرے اردگرد چیخ چلا رہے تھے۔ وہ دور دور تک پھیل گئے تھے۔ صرف چار افراد میرے قریب تھے ان میں سے دو میرے آگے پیچھے اور دو دائیں بائیں چل رہے تھے۔ مجھے صرف وہی دکھائی دے رہے تھے۔ باقی سارا علاقہ اور تمام لوگ دھوئیں کی چادر کے اس پار تھے۔

ہم شگاف تک پہنچے ایک جانب سے کئی باغی ہماری سمت بڑھے۔ میرے دائیں بائیں اور آگے موجود سواران کی راہ میں ڈٹ گئے۔ میں نے بھی اپنی تلوار نکال لی لیکن اس کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں با آسانی شگاف تک پہنچ گیا اور پھر گھوڑے سے اتر کر ایک طرف دبک گیا وہاں پتھروں کے کئی بڑے بڑے ڈھیر تھے جنہوں نے آسانی سے مجھے اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔

میرے چاروں ساتھی کافی دیر تک باغیوں سے الجھے رہے۔ پھر تلواروں کے ٹکراؤ کی آوازیں دم توڑ گئیں' لیکن مجھے کبھی یہ پتا نہ چل سکا کہ ان میں سے کامیابی کس کے حصے میں آئی تھی۔ باغیوں نے میرے ساتھیوں کو مار ڈالا تھا یا خود باغیوں کا صفایا ہو گیا تھا' لیکن مجھے ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔

میں کوئی پون گھنٹہ وہیں دبکا رہا جس کے بعد نکل کر آگے بڑھا۔ وہ ایک گلی تھی جو خالی پڑی تھی لیکن دور کونے پر جلتی ہوئی آگ اور اس کے گرد متعدد مقامی نظر آ رہے تھے۔ میں انہی کی زبان میں دوستانہ الفاظ بولتا ہوا ان کے قریب سے گزر گیا لیکن انہوں نے عام سے انداز میں مجھے دیکھا اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئے۔

دو منٹ بعد میں نے بازار سے ایک چپاتی اور چند مرچیں خریدیں۔ میں نے ہوٹل والے کی اس بات سے اتفاق کیا کہ صاحب لوگ کبھی شگاف تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

اس کے باوجود کہ اس وقت صبح کے تین بجے تھے' تنگ گلیاں یوں بارونق تھیں جیسے دوپہر کا وقت ہو۔ ہر جگہ بارہویں مقامی انفنٹری کے سپاہی گھوم رہے تھے۔ ان کے ساتھ رانی کی مرہٹہ فوج' بھیل سپاہی اور قبائلی بھی تھے جو جھانسی کے دفاع کے لیے آئے تھے۔

جا بجا تباہ شدہ مکان اور دکانیں بھی مجھے دکھائی دیں جو یقینی طور پر ہمارے گولوں کا نشانہ بنی تھیں لیکن ایک حیران کن بات یہ تھی کہ کسی شخص کے چہرے پر کوئی تردد یا پریشانی نظر نہیں آئی تھی بلکہ اس کے بجائے وہ ایک عجیب طرح کے جوش میں مبتلا تھے۔ میرے قریب سے ایک چھکڑا گزرا جس پر کارتوس لدے ہوئے تھے۔ اسے چھ قلی کھینچ رہے تھے۔ ''یہ ایک ہزار انگریزوں کے لیے تو کافی ہوں گے'' میں نے فوراً ہوٹل والے کو کہا۔

''یقیناً!'' اس نے میری تائید کی ''ہر گولے کے ساتھ مارکیٹ ٹیکس میں ایک آنے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب تو زندگیاں بھی مہنگی ہو گئی ہیں' دوست!''

''کیا رانی اپنے خزانے سے اس کی ادائیگی نہیں کرتی؟'' میرا انداز کرید کرنے والا تھا۔

''ہو.....ہو.....ہو.....سنو اسے کیا کہہ رہا ہے'' وہ یوں ہنسا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہو ''ادائیگیوں کے لیے ہم غریب اور لڑنے کے لیے وہ لوگ ہیں''

''میں نے سنا ہے کہ آج رات وہ کوئی خفیہ اجلاس منعقد کر رہی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟''

میں نے پوچھا۔

''اس نے مجھے تو دعوت نہیں دی۔'' اس نے میرا مضحکہ اڑایا'' اور نہ ہی کہا ہے کہ جب وہ محل چھوڑ جائے تو میں استعمال کرلوں۔''

میں نے اسے ادائیگی کی اور الوداعی انداز میں ہاتھ ملاتا قلعے کی طرف چل دیا۔ میں نے وہ کچھ معلوم کرلیا تھا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ ذرا دیر بعد میں محل کے دروازے پر موجود تھا جس کی دونوں اطراف سرخ جیکٹیں پہنے ہوئے پٹھان پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے اپنی پگڑی درست کی جس سے نصف سے زیادہ چہرہ چھپ گیا۔ پھر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ پیغام نکال لیا جو میں نے اور روز نے بڑی احتیاط کے ساتھ تیار کیا تھا اور سنتری کی طرف بڑھا۔ میں نے اس سے گارڈ کمانڈر کو بلانے کے لیے کہا۔

گارڈ کمانڈر بکتا جھکتا باہر آیا تو میں نے پیغام اس کے ہاتھ پر رکھ دیا'' یہ صرف اور صرف رانی کے لیے ہے' کوئی اور اسے ہاتھ نہ لگائے۔ اسے فوری طور پر اس کے پاس لے جاؤ۔''

اس نے سرتاپا مجھے گھور کر دیکھا پھر پیغام پڑھنے کی کوشش کرنے لگا'' یہ کیا ہے اور تم کون ہو؟''

''اگر رانی پسند کرے گی تو خود تمہیں بتا دے گی۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا اور دیوار سے ٹیک لگالی۔ ''لیکن اگر تم نے تاخیر کی تو وہ تمہارے شانوں کو سر سے محروم کر دے گی''

وہ پیغام کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ نوجوان لیسٹر نے اپنی خاندانی کریسٹ کی سیل اس پر لگا دی تھی جسے گارڈ کمانڈر سرکاری نشان سمجھ رہا تھا۔ وہ چند ثانیے وہیں کھڑا رہا لیکن پھر پلٹ کر اندر کو چل دیا۔ جاتے ہوئے وہ محافظوں کو اشارہ کر گیا تھا کہ مجھ پر نظر رکھیں۔

میرا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میں نے اور روز نے بڑی احتیاط کے ساتھ پیغام تیار کیا تھا۔ تاکہ اگر یہ غلط ہاتھوں میں بھی چلا جائے تو زیادہ نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ مزید احتیاط کے طور پر اسے فرانسیسی میں تحریر کیا گیا تھا جو رانی بخوبی سمجھ اور پڑھ سکتی تھی۔

''پرفیوم اور تصویر لانے والا شخص یہاں موجود ہے۔ اس سے تنہا ملو اور اس پر اعتماد کرو۔''

روز اس سادہ سے پیغام پر اچھل پڑا تھا۔ اس کے خیال میں اگر کوئی اور اس پیغام کو پکڑ بھی لیتا تب بھی وہ میرے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔ البتہ یہ بات میرے ذہن میں ضرور تھی

کہ پٹھان پیغام کو براہ راست رانی تک لے جائے گا اور وہ فوراً ہی سمجھ جائے گی کہ پیغام لانے والا کون ہے؟ لیکن اگر وہ پیغام رساں کا اندازہ نہ کر سکی تو کیا میں واپس جنرل روز کے ہیڈ کوارٹر پہنچ سکوں گا؟ اگر پیغام اس نے کسی اور کو دکھا دیا تو پھر.....

قدموں کی آہٹ سے میری سوچیں ادھوری رہ گئیں! میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ حوالدار اندھیرے میں سے برآمد ہوا۔ دو سپاہی اس کے عقب میں تھے۔ قریب آ کر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر سر سے آگے آنے کا اشارہ کیا اور واپس چل دیا۔ میں اس کے عقب میں تھا جبکہ دونوں سپاہی محافظوں کے طور پر سب سے پیچھے آنے لگے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا اس نے پیغام ذاتی طور پر رانی کو دیا ہے لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ جلد ہی پتا چل جائے گا۔

محل کے اندرونی دروازے پر روشنی تھی۔ کئی پٹھان چوکیدار مستعد کھڑے تھے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔

''اندر چلو'' حوالدار کے حلق سے غراہٹ جیسی آواز ابھری اور میں اس کے پیچھے گارڈ روم میں داخل ہو گیا۔ اندر تیز روشنیاں تھیں جن کی وجہ سے میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ چند لمحوں بعد جب میں دیکھنے کے قابل ہوا تو مجھے کمرے کے وسط میں رانی کا چھوٹے قد کا مصاحب اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا جسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ تو اس پاگل کی بچی نے مصاحب کو میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ روز کے خفیہ منصوبے میں دراڑ پڑ گئی تھی اور.....

''تم ہی وہ آفیسر ہو جو برطانوی ملکہ کے تحفے رانی کے لیے لائے تھے؟'' اس کا انداز سوالیہ تھا۔ ''سرکار کے سفیر.....کرنل ہیری فلیش مین؟''

میں ایک لمحے کے لیے تو سن ہو گیا لیکن پھر میں نے اپنی پگڑی اتار دی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

''ہاں!'' میں نے جواب دیا ''میں کرنل فلیش مین ہوں۔ مجھے فوری طور پر رانی کے پاس لے چلو۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ ہاتھوں کو عجیب سے انداز میں حرکت دے رہا تھا.....پھر ایک جلتی ہوئی شے ہم دونوں کے درمیان آ گری۔

پہلے تو میں اسے کوئی پتنگا سمجھا لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ جلتی ہوئی سگریٹ تھی جس کے پیچھے پیلے رنگ کا ماؤتھ پیس بھی موجود تھا۔ ''خوش آمدید' کرنل فلیش مین!'' ایک جانی پہچانی مردانہ آواز سنائی دی تو میں پلٹا اور ایک بار پھر ساکت رہ گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جو کچھ دیکھ رہا تھا' وہی حقیقت تھی۔

وہ اگنتیف تھا۔

اس کا وہ ہاتھ ابھی تک اٹھا ہوا تھا جس سے سگریٹ پھینکا گیا تھا۔ میں نے کئی بار پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا۔ میں اسے ہزاروں میل دور چھوڑ آیا تھا اور اس بات کی کوئی توقع نہ تھی کہ وہ کسی جن کی طرح یہاں آ نمودار ہوگا۔

''خوش آمدید' کرنل!'' اس نے دوبارہ اپنا جملہ دہرایا'' مجھے یقین ہے کہ دونوں کی خوب گزرے گی!''

میں دھڑکتے دل کے ساتھ دشمنوں میں تنہا رہ گیا تھا۔ اگنتیف نصف نیلی اور نصف براؤن آنکھ کے ساتھ مجھے گھور رہا تھا۔

''میں اس ملاقات کا بڑی شدت سے منتظر تھا۔'' اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی'' جب سے میں نے تمہارے ہندوستان کے مشن کے بارے میں سنا تھا ..... ارے ہاں تمہیں شاید علم نہیں کہ تمہارے اس مشن کے بارے میں تم سے پہلے مجھے پتا چلا تھا۔ لارڈ پالمرسن کے خفیہ منصوبے اور خفیہ اجلاس اتنے خفیہ نہیں، جتنے وہ سمجھتا ہے۔ خیر اب ہم مل بیٹھے ہیں تو تم سے خوب باتیں ہوں گی''

''لیکن میرا تم سے کوئی تعلق نہیں'' میں حلق کے بل چیخا تھا۔ ''میرا کام رانی لکشمی بائی سے ہے..... میں نے اس سے کہا تھا کہ اسے فوری طور پر میری آمد سے مطلع کرو! جاؤ جا کر اسے بتاؤ.....''

اگنتیف کا تھپڑ میرے منہ پر پڑا تو جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں لڑکھڑا گیا لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز معمول کے مطابق تھی'' یہ ضروری نہیں' کرنل'' اس نے کہا تو چھوٹے قد کا مصاحب کھسک

گیا۔ ''ہر ہائی نس کو ایک تیسرے درجے کے جاسوس کے لیے زحمت نہیں دی جا سکتی۔ اس گیدڑ سے میں خود نمٹ لوں گا۔''

''تم سؤر کے بچے ہو'' میں پھر دھاڑا ''میں رانی کے لیے سر ہوگ روز کا سفیر ہوں .....کسی روسی کتے کے لیے نہیں .....تم مجھے روکنے کی کوشش نہ کرو'' دو سپاہیوں نے اچانک ہی آگے بڑھ کر مجھے دائیں بائیں سے گرفت میں لے لیا۔ میں نے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔ ''میں اسٹاف آفیسر ہوں! تم مجھے چھو بھی نہیں سکتے۔ میں.....''

''اسٹاف آفیسر! سفیر!'' اگنتیف کی برف کی سی سرگوشی مجھے سنائی دی ''تم یہاں اپنے گندے بھیس میں داخل ہوئے ہو' ایک گندے جاسوس کی طرح' اور دعویٰ کرتے ہو کہ سفیر ہو؟ اگر تم واقعی سفیر ہو تو پھر رن کی روشنی میں جھنڈے کے ساتھ کیوں نہیں آئے'' اس کا چہرہ پتھرایا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک اور تھپڑ مجھے جڑ دیا۔ ''میں تمہیں تمہاری اصلیت بتاؤں گا.....کیونکہ تم ایک مکار جھوٹے ہو جس کے کسی لفظ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ غداری تمہاری سرشت میں شامل ہے یا اس بار کسی کو قتل کرنے آئے ہو؟'' اس کا ہاتھ بڑھا اور اس نے میری کمر سے بندھا ریوالور اتار لیا۔

''یہ جھوٹ ہے'' میں چلایا ''کسی کو بھی سر ہوگ روز کے پاس بھیجو .....وہ تمہیں بتائے گا'' دروازے پر مصاحب مجھے دوبارہ دکھائی دیا۔ ''تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو'' میں اس سے مخاطب ہوا ''جاؤ جا کر رانی کو بتاؤ''

مگر وہ وہیں کھڑا رہا اور اگنتیف کی طرف سے احکامات کا انتظار کرتا رہا جس کا غصہ اب کم ہو گیا تھا۔ وہ سپاہیوں کی طرف مڑا ''اسے نیچے لے چلو۔''

''تم کوئی اختیار نہیں رکھتے'' میں بلند آواز میں بولا۔ ''نہ ہی میں تمہیں جواب دہ ہوں روسی بھیڑیے! مجھے جانے دو' میں رانی سے ملنے آیا ہوں''

وہ مجھے کھینچتے رہے اور میں مصاحب سے مطالبہ کرتا رہا کہ جا کر رانی کو بتاؤ۔ وہ مجھے ایک دروازے سے گزار کر سیڑھیوں کی سمت لے چلے جو تہ خانے میں جا رہی تھیں۔ اگنتیف اور مصاحب ہمارے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ میں چلا چلا کر جدوجہد کر رہا تھا لیکن ان کی کوشش تھی کہ رانی کو میری آمد کی خبر نہ ہونے پائے۔

سپاہیوں نے مجھے ایک ایسے ڈرم کے ساتھ باندھ دیا جو زمین سے کسی قدر بلند تھا۔اس کے ساتھ رسیاں بھی لگی ہوئی تھیں جو چھت سے پیوست چرخیوں سے گزر کر دوبارہ زمین کی طرف آ رہی تھیں۔تب مجھے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں نے میوری کو بھی اسی طرح قتل کیا ہوگا۔دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے میرے ہاتھ پیر باندھ دیے۔میں چیختا رہا لیکن وہ بہروں کی طرح اپنے کام میں مصروف رہے۔

مصاحب تہ خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا جبکہ اگنیف سگریٹ سلگانے لگا۔سپاہی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔سگریٹ سلگا کر اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے رسیاں کھینچنی شروع کر دیں۔چند ہی لمحوں بعد میں چھت سے الٹا لٹک رہا تھا۔میرا سارا خون' سر اور دماغ میں سمٹ آیا تھا جبکہ میرے حلق سے کراہیں خارج ہونی شروع ہو گئی تھیں۔

''مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' اگنیف کی آواز سنائی دی ''تمہارا منصوبہ کیا ہے؟ ہر ہائی نس سے تمہاری ملاقات کا کیا مقصد ہے' اور جب میں تمہارے جوابات سے مطمئن ہو گیا .....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میری آنکھوں میں جھانکا ''اس وقت تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔''

''خدا کے لیے' اگنیف!'' میں چلا اٹھا ''تم میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتے! میں برطانوی آفیسر ہوں۔ایک سفید فام..... مجھے جانے دو گدھے! پلیز..... خدا کے نام پر۔ .....میں تمہیں بتاتا ہوں.....'' جانے ان سپاہیوں نے کیا کیا کہ میری ہڈیاں تک کڑکڑانے لگی تھیں ''نہیں .....نہیں! مجھے جانے دو ..... میں ایک شریف آدمی ہوں .....لعنت ہو تم پر..... خدا کے لیے..... پلیز.....''

میرے ہاتھوں میں بندھی زنجیر کو ایک جھٹکا لگا۔آہنی کڑا میرے گوشت میں گڑنے لگا تو میں مارے درد کے چلا اٹھا۔یوں لگ رہا تھا کہ کوئی تیز دھار چاقو میرے جسم میں پیوست ہو گیا ہو۔

اگنیف میرے قریب آ گیا ''تم یہاں کیوں آئے تھے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے جانے دو! تم خونی کتے ہو!'' اس کے عقب میں مجھے مصاحب اپنے قدموں پر کھڑا ہوتا دکھائی دیتا تو میں اس کی طرف رخ کر کے چیخا ''بھاگو! بھاگو موٹے بندر! اپنی مالکن کو بتاؤ .....اسے بلاؤ.....جلدی.....''

ڈرم ایک بار پھر گھوما اور لفظوں کے بجائے میرے حلق سے چیخیں آزاد ہونے لگیں۔ میں مسلسل چیختا رہا حتیٰ کہ میری آواز بند ہوگئی۔ تب میں نے اس شیطان کو اپنے چہرے پر جھکتے دیکھا۔

''نہیں.....نہیں.....خدا کے لیے نہیں.....میں تمہیں بتاتا ہوں'' درد اب مجھ سے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے مجھے بولنا تھا۔ میں نے اپنا سر اِدھر اُدھر پٹخنا شروع کر دیا۔ دل ہی دل میں' دعا کرنے لگا۔ کہ کاش مصاحب بھاگ کر جائے اور رانی کو بلا لائے۔

''نہیں.....میں تمہیں بتاؤں گا.....انہیں روکو.....میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سچ بولوں گا.....اوہ گاڈ.....پلیز.....دوبارہ نہیں.....''

''بہت اچھے'' وہ غرایا۔ ''جلدی سے پھوٹو''

''جنرل روز.....'' میری آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی'' میں اس کا ماتحت ہوں.....اس نے مجھے بھیجا ہے.....رانی سے ملاقات کے لیے.....پلیز.....خدا گواہ ہے یہی سچ ہے.....اوہ! انہیں کہو کہ مجھے نیچے اتاریں.....''

''گوآن!'' ہڈیوں کو سرد کر دینے والی اس کی آواز ابھری ''تمہارا پیغام کیا تھا؟''

''میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا.....'' میں اس کی خوفناک آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ جو مجھے دھندلائی ہوئی نظر آ رہی تھیں کیونکہ میری اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پھر اس کے عقب میں' میں نے کوئی سرگرمی سی محسوس کی.....سیڑھیوں کے اوپر.....میں نے بڑی مشکل سے ادھر دیکھا اور پھر میرا جسم جیسے ہوا میں اڑنے لگا۔ کوئی بہت بڑا بوجھ میرے ذہن و دل سے ہٹ گیا تھا۔

دو پٹھان محافظ سرخ رنگ کی جیکٹیں پہنے ہوئے اوپر والی سیڑھی پر کھڑے تھے جبکہ ان کے درمیان سے سفید رنگ کا ایک جسم تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ میری سوچوں کے مطابق وہ خوبصورت تھی لیکن اس لمحے وہ حوروں سے بڑھ کر حسین اور دلربا نظر آ رہی تھی۔

سفید کپڑوں میں ملبوس جھانسی کی رانی لکشمی بائی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہوں لیکن درد کی شدت اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں

تب ہی اس کی غصے میں ڈوبی ہوئی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

''اسے فوری طور پر روکو..... بند کرو یہ سب کچھ'' تہ خانے میں پھیلا سناٹا محسوس کر کے مجھے اپنا کلاس روم یاد آ گیا جب مس کے داخل ہونے سے وہاں قبر جیسی خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔

میں نے خود کو زمین کی طرف آتے محسوس کیا اور پھر یوں سکون طاری ہو گیا جیسے کسی نے میرے بدن سے درد کو نچوڑ لیا ہو۔ میں نیم بے ہوش اور ہمت سے عاری ہو چکا تھا۔ لیکن ایک عورت کے سامنے اپنی کم مائیگی کا احساس، توہین آمیز تھا۔

''تم مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں اگلوا سکتے'' میں پوری قوت صرف کر کے بلند آواز میں بولا تھا۔ ''تم روسی بھیڑیے! میں پہلے مر جانا پسند کروں گا'' میں نے کوشش کر کے ایک آنکھ کھولی تا کہ اردگرد کا جائزہ لے سکوں لیکن وہ اگنتیف پر غصہ اتارنے میں مصروف تھی۔

''کیا یہ تمہارے حکم سے ہوا ہے؟'' رانی کی غضبناک آواز سنائی دی ''کیا تم جانتے ہو' یہ کون ہے؟''

اگنتیف نے جلتی ہوئی سگریٹ ایک طرف پھینکی اور اسے تعظیم دینے کے لیے جھک گیا۔ ''یہ ایک جاسوس ہے ہائی نیس! جو بھیس بدل کر آپ کے شہر میں داخل ہوا ہے''

''یہ ایک برطانوی آفیسر ہے'' وہ اپنے سفید نقاب کے عقب سے غرائی ''سرکار کا سفیر' جو ہمارے لیے ایک پیغام لایا تھا..... ہمارے لیے..... وہ کہاں ہے؟''

اگنتیف نے اپنی جیب سے پیغام نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ رانی نے پیغام لے کر پڑھا اور پھر اگنتیف سے مخاطب ہوئی۔

''شیر خان نے ہمیں بتایا ہے کہ اس نے یہ پیغام صرف ہمیں پیش کرنے کا حکم دیا تھا'' رانی بدستور غصے میں تھی۔ ''لیکن ہم اسے تمہارے پاس دیکھ رہے ہیں۔ کس بے وقوف نے یہ تمہارے حوالے کیا؟ تم نے اسے کیوں پڑھا؟ اور پھر ہماری اجازت کے بغیر اس سے سوالات .....''

''یہ ایک مشکوک پیغام تھا' ہائی نس'' اگنتیف مردہ سی آواز میں بولا ''اور یہ شخص سو فیصد ایک جاسوس.....''

''تم ایک جھوٹے اور مکار شخص ہو۔'' میں نے اس کا جملہ کاٹا ''تم اچھی طرح جانتے تھے کہ

میں کون ہوں۔ اس کی بات مت سنو' لکشمی ..... ہائی نس ..... یہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر دوبارہ اگنتیف کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''یہ جاسوس ہے یا نہیں' تمہیں یہ یاد رہنا چاہیے کہ یہاں حکومت ہم کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں بعض اوقات تم یہ بھول جاتے ہو' کاؤنٹ اگنتیف!''

اگنتیف یوں خاموش تھا جیسے اس کے منہ میں زبان نہ رہی ہو وہ کڑی نظروں سے کچھ دیر اسے گھورتی رہی۔ پھر اس نے مجھے اور وہاں موجود لوگوں کو دیکھا اور آخر میں نگاہیں دوبارہ اگنتیف پر جا ٹکیں۔

''ہم خود اس شخص سے بات کریں گے اور فیصلہ کریں گے کہ اس کا کیا کرنا ہے' تم جا سکتے ہو' کاؤنٹ!''

وہ دوبارہ تعظیم کے لیے جھک گیا۔ ''میں معذرت خواہ ہوں' اگر میرے عمل سے آپ کو کوئی زحمت ہوئی۔ میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کے اور اپنے مشترکہ کاز کے لیے کیا تھا' آپ کی حکومت کے لیے یور ہائی نس .....'' وہ ایک ثانیے کے لیے رکا پھر بولا ''..... اور اپنے شاہ کے لیے ..... میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ کو یہ احساس نہ دلا سکا کہ یہ شخص ایک خطرناک برطانوی ایجنٹ اور مکار .....''

''ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ یہ کون اور کیا ہے'' رانی نے تیزی سے کہا۔ اگنتیف نے بغیر کچھ کہے' جھک کر اسے آداب کیا اور خارجی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دو سپاہی اس کے پیچھے روانہ ہوئے تھے۔ شیر خان نے ان کے عقب میں دروازہ بند کر لیا اور تہ خانے میں صرف ہم چار افراد رہ گئے۔

لکشمی بائی ایک سفید مجسمے کی طرح اپنی جگہ ایستادہ تھی۔ چھوٹے قد کا مصاحب اس سے ایک قدم پیچھے اپنی گول مٹول آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شیر خان دروازے پر تھا جبکہ میں زمین پر بندھا پڑا تھا۔

''تھینک یو' یور ہائی نس'' خاموشی کی مہر میں نے توڑی تھی ''مجھے معاف کیجیے گا کیونکہ میں آپ کے حضور آداب بجا نہیں لا سکا' کیونکہ .....''

میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا' وہ بے تاثر چہرہ لئے میری طرف نگراں تھی۔ میں نے اپنا

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے جواب کا انتظار کیا لیکن جب وہ خاموش رہی تو میں دوبارہ بولا ''اگر آپ کا حوالدار میری بندشیں کھول دے.....''

لیکن وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ میں اچانک ہی خود کو بے چین محسوس کرنے لگا کیونکہ اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہی پھر باوقار انداز میں آگے بڑھی اور سخت آواز میں گویا ہوئی۔

''وہ تم سے کیا معلوم کرنا چاہتا تھا؟''

اس کے لہجے نے میری رہی سہی ہمت بھی چھین لی۔ میں جواب دینے سے پہلے خود ہی ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ہاتھ اور پیر اب بھی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے ''وہ آپ سے میری ملاقات کی نوعیت دریافت کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

اس نے پہلے میری کلائیوں کی زنجیر کو دیکھا' پھر نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کر لیں۔ ''اور کیا تم نے اسے بتا دیا؟''

''نہیں'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی ''میں ان لوگوں کو پسند کرتا ہوں جو تہذیب کے دائرے میں رہ کر مجھ سے سوالات کریں''

وہ اپنے مصاحب کی طرف مڑی ''کیا یہ سچ ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''سو فیصد ہائی نس'' وہ فوراً آگے کی سمت جھک آیا۔ ''کرنل صاحب نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ حتیٰ کہ ان کے حلق سے ایک چیخ بھی برآمد بھی نہیں ہوئی ..... وہ ظالم' ظلم کرتے ہوئے یہ بھی بھول گیا تھا کہ یہ ایک افسر صاحب ہیں.....''

وہ بے وقوف اپنی مالکن کے ساتھ ساتھ میری ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ وہ میری طرف بھی اس انداز سے دیکھ رہا تھا جیسے مجھ سے شاباشی کا متمنی ہو۔

رانی پلٹ کر شیر خان کی طرف متوجہ ہوئی اور سر سے اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ شیر خان نے فوراً تعمیل کی۔ میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ یقیناً وہ اسے حکم دینے والی تھی کہ.....

''اس کی بندشیں کھول دو'' وہ بولی اور میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ شیر خان نے آگے بڑھ کر جلدی جلدی میری بندشیں کھول ڈالیں۔

''اسے اپنے ساتھ لے کر آؤ'' اگلے ہی لمحے اس کی سخت آواز دوبارہ سنائی دی اور میری رہا

ہونے کی خوشی ماند پڑ گئی ''ہم اس سے خود سوالات کریں گے''

مزید کچھ کہے بغیر وہ مڑی اور تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ مصاحب اس کے عقب میں تھا جبکہ شیر خان مجھے سہارا دیے چل رہا تھا۔

''ہائی نس سے میری شکایت نہ کیجئے گا' حضور!'' اس نے میرے کان میں سرگوشی کی ''روشی صاحب کو پیغام بے شک میری غلطی تھی' لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ آپ کو نقصان پہنچانا چاہ رہا ہے تو میں بھاگ کر ہر ہائی نس کو بلا لایا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا' ورنہ یہ سب نہ ہوتا۔''

میں خاموش رہا۔ ظاہر ہے اسے کہتا بھی کیا۔ مجھ پر جو گزرنا تھی وہ تو گزر چکی تھی۔ اگر وہ پہلے ہی تھوڑی سی عقل استعمال کر لیتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

شیر خان مجھے تہ خانے سے نکال کر راہداری میں لے آیا اور پھر ایک دروازے سے گزار کر ایک دربار روم میں لے آیا۔ اس کا تمام فرنیچر سفید رنگ کا تھا۔ فرش پر دبیز قالین اور دیواروں پر ریشمیں پردے پڑے تھے۔ دیوان اور کشن ایرانی ٹائپ کے تھے۔ فضا میں پرفیوم کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ مجھ پر اب تک اداسی طاری تھی جو لکشمی بائی کو دیکھنے کے باوجود کم نہیں ہوئی تھی۔

وہ ایک نسبتاً کم اونچے دیوان پر براجمان تھی۔ اس کا مصاحب ہم سے پہلے وہاں آ پہنچا تھا اور اس کے کان میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گیا..... دو خدمت گار خواتین بھی موجود تھیں لیکن وہ خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''اسے وہاں کھڑا کر دو'' رانی نے انگلی سے فرش کے وسط کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور ہاتھ پشت پر باندھ دو۔''

شیر خان نے کسی مشینی آدمی کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ میں نے کوئی اعتراض یا جدوجہد نہیں کی تھی۔

''تم سب لوگ جا سکتے ہو'' رانی کا اگلا حکم سنائی دیا۔ ''شیر خان البتہ دروازے کی دوسری جانب موجود رہے گا۔''

میں حیران ہو گیا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے جا رہی ہے۔ مصاحب اور دونوں عورتیں آگے پیچھے باہر چلی گئیں۔ شیر خان بھی ایک دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ کمرے میں ہم دونوں تنہا رہ گئے۔ میں کمرے کے وسط میں کھڑا تھا جب کہ وہ دیوان پر بیٹھی تھی۔

پھر میری آنکھوں نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ وہ دیوان سے اٹھی اور کسی تتلی کی مانند اڑتی ہوئے میری سمت بڑھی۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے تھے۔ جسم کپکپا رہا تھا۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر سسکنے لگی۔

''اوہ جان ..... ہمارے محبوب ..... بالآخر تم واپس آ گئے ..... اور! ہم تو سمجھے بیٹھے تھے کہ اب تمہیں کبھی نہ دیکھ سکیں گے'' اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

''ممکن ہے تم ہمیں پاگل سمجھو' لیکن یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔''

میری کیفیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ میں خود بھی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں یا کھلی آنکھوں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ صرف دو گھنٹے پہلے میں برطانوی فوجوں کے درمیان محفوظ جنرل روز کے خیمے میں موجود تھا میرے ہاتھ میں برانڈی کا گلاس تھا۔ اور نگاہیں دلی ٹائمز کے ایک پرانے شمارے پر مرکوز تھیں۔ پھر میں گولیوں اور تلواروں سے بچتا ہوا پہلے جھانسی اور پھر رانی کی محل میں داخل ہوا' جہاں میں ایک بھیڑیے کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ تشدد سے مجھے ہلاک کر دینے کا خواہشمند تھا۔

اور اب میں جھانسی کی رانی کے دربار روم میں موجود تھا۔ اس حالت میں کہ وہ مجھے دیکھ کر سسکیاں بھر کر رو رہی تھی۔ میں بھی گھٹنوں کے بل اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کی ریشمیں زلفوں سے اٹھنے والی مہک مجھے بے خود کیے دے رہی تھی۔ مگر میں ان ناگن زلفوں سے کھیلنے سے قاصر تھا۔

''انہوں نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے نا جان!'' وہ جھک کر ایک ہاتھ سے میرے زخمی گھٹنے کو سہلانے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی پیچھے ہٹی اور میرا چہرہ اپنے دونوں میں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''میں خوش قسمت ہوں لکشمی' کہ مجھے تم جیسی محبوبہ ملی ہے'' میں نے سرگوشی کی ''تم بہت خوبصورت ہو' اتنی خوبصورت کہ تمہارے حسن کی تعریف کرنے کو میرے پاس الفاظ نہیں۔''

''ہم سمجھتے تھے تم مر چکے ہو'' اس نے میرے بازو کو بھینچ لیا اور میں پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھ آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے لگا ''ہم نے اس عرصے میں باقاعدہ تمہارا سوگ منایا ہے کیونکہ ہمیں حویلی کے قریب مردہ ڈاکو ملے تھے اور ہم نے سوچا تھا کہ شاید تم بھی ..... لیکن تم محفوظ ہو اور دوبارہ ہمارے پاس آ گئے ہو ..... اور! ہم تمہیں کیسے بتائیں کہ ہم تم سے بے تحاشا محبت کرتے

ہیں.....''

میں نے یہ جملہ پہلے بھی شمار عورتوں کے منہ سے سنا تھا۔ اب ان عورتوں کی تعداد بھی مجھے یاد نہیں تھی لیکن جس انداز میں رانی نے اپنی محبت کا اعتراف کیا تھا اس سے قبل کسی نے نہیں کیا تھا۔

''لکشمی .....چنبیلی .....میرے ہاتھ کھول دو'' میں نے آہستگی سے کہا تو وہ مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے پہلے دروازے کو دیکھا' پھر مسکراتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوگئی۔

''ہمیں افسوس ہے کہ ہم یہ نہیں کر سکتے .....کم از کم اس وقت نہیں .....کسی کو ہمارے تعلق کے بارے میں علم نہیں ہونا چاہیے .....ان کے لیے تم ایک قیدی ہو..... ایک جاسوس جسے برطانوی فوج نے بھیجا ہے.....''

''میں اس کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ میں اس لیے خفیہ طور پر آیا تھا کہ میرے پاس تمہارے لیے جنرل روز کا ایک پیغام موجود تھا۔ لکشمی .....میری پیاری .....تمہیں اسے قبول کرنا ہے.....کیونکہ یہ زندگی کی پیش کش ہے' براہ کرم مجھے کھول دو تا کہ میں تمہیں بتا سکوں۔''

''ٹھہرو'' وہ بولی ''آؤ' یہاں بیٹھو'' اس نے مجھے سہارا دے کر ایک دیوان پر لا بٹھایا ''فی الحال یہی بہتر ہے کہ ہم تمہیں بندھا رہنے دیں .....اوہ جان! یہ طویل عرصے کے لیے نہیں ہوگا' ہم وعدہ کرتے ہیں .....لیکن اگر کوئی اچانک اندر آ گیا تو کیا ہوگا؟ .....ہم تمہیں شربت پلاتے ہیں .....اور وہ روسی بھیڑیا'' اس نے اپنی ننھی سی مٹھی لہرائی ''اسے اس ظلم کا حساب دینا ہوگا .....ہم اسے تباہ کر دیں گے .....وہ اور اس کا زار آقا' دونوں جہنم میں جائیں۔''

ونڈرفل! میں نے دل ہی دل میں اسے داد دی۔ وہ اٹھ کر ایک تپائی کی طرف بڑھ گئی جہاں شربت کی صراحی موجود تھی۔ چند ہی ثانیوں میں وہ میرے لیے شربت لے آئی۔

''اس رات اگنتیف نے مجھ پر ٹھگوں سے حملہ کرایا تھا .....وہ میری آمد کے ساتھ ہی میرے پیچھے لگ گیا تھا جاسوسی کرنے اور بغاوت کو ہوا.....''

میں رک گیا اچانک ہی مجھے یاد آ گیا کہ آخر کار اس وقت وہ بغاوت کے سربراہوں میں سے ایک تھی۔ اس سے قطع نظر کہ ذاتی طور پر اگنتیف کے لیے اس کے خیالات کیا تھے، وہ اس کا

حمایتی اور رفیق تھا۔

رانی نے شاید میرے جملے نظر انداز کر دیے تھے' کیونکہ اس نے خاموشی سے شربت کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا تھا۔ جب تک میں شربت پیتا رہا وہ اپنی جگہ کھڑی رہی پھر گلاس رکھ کر وہ میرے برابر بیٹھ گئی۔

''اگر ہم تم سے نہ ملے ہوتے' یا تمہیں اچھی طرح پرکھ نہ چکے ہوتے تو ہم بھی تمہیں سرکار کا بھیجا ہوا ایک سرد' بے جان اور بے حس سفیر ہی سمجھتے لیکن .....'' وہ دیوان سے اتر کر گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گئی اور میرے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لئے'' .....لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ تم دوسروں جیسے نہیں۔ تم مہربان' رحم دل اور دوسروں کا موقف سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہو۔ اور پھر .....اس دن' جب دربار روم میں ہم نے شمشیر زنی کی تھی .....ہم نے اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کی تھی .....ایک عجیب سی کسک .....جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی' اور بعد ازاں .....''

''حویلی میں'' میں بے قراری سے بول اٹھا ''اوہ لکشمی' وہ میری زندگی کا سب سے حیران کن لمحہ تھا.....کیا تم ایک سیکنڈ کے لیے میرے ہاتھ نہیں کھول سکتیں؟''

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں اجنبیت کے سائے لہرائے اور پھر اس نے رخ بدل لیا لیکن اس کی گرفت میرے ہاتھوں پر سخت ہو گئی تھی۔

'' .....اور پھر جب تم غائب ہو گئے اور ہم نے سمجھا کہ تم مر چکے ہو تو ہم خود کو کھوکھلا محسوس کرنے لگے'' وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی آواز بلند نہ ہونے پائے ''تب ہمیں کوئی شے بھی اچھی نہ لگتی تھی' نہ اپنا آپ' نہ جھانسی .....پھر شمال میں برطانوی چھاؤنیوں میں سرخ آندھیاں چلنے کی خبریں ملنے لگیں .....یہ آندھیاں ہماری ریاست تک آ پہنچیں .....انہوں نے سب کو مار ڈالا' لیکن ہم بے بس تھے .....'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی جیسے اپنے کیے پر پشیمان ہو'' .....ہم کر بھی کیا سکتے تھے؟ شاید اسی بے بسی کا نام راج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں راج سے نفرت ہو گئی ہے .....ہمارا اپنا چچیرا بھائی نانا' جھانسی کو آرکا یا گوالیار کے ہاتھ بیچنے کو تیار ہو گیا ہے' مگر تم ان باتوں کو کیا سمجھو گے؟ تم تو برطانوی ہو۔''

''میری پیاری!'' میرے لہجے میں دنیا بھر کی مٹھاس تھی ''تمہیں میرے سامنے اس طرح کا

معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہیں کرنا چاہیے' تم بھلا کر بھی کیا سکتی تھیں؟ ..... بہر حال یہ پرانی باتیں ہیں' جو ہونا تھا ہو چکا ..... میں اسی لیے یہاں آیا ہوں کہ مستقبل کے خطرات سے تمہیں بچالوں اور پھر ....."

ہمیں اب کسی شے کی پروا نہیں" اس نے پیارے بھرے انداز سے مجھے ٹوکا "تم جو ہمارے پاس آ گئے ہو" وہ دوبارہ جھکی اور اس کے ہونٹ ایک بار پھر میرے چہرے کا طواف کرنے میں مصروف ہو گئے۔

"تمہیں پروا کرنا ہوگی" میں نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا "دیکھو _____ میں جنرل روز کی طرف سے آیا ہوں اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' اسے اس کی ہدایت کلکتہ سے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے دی ہے' وہ تمہیں بچانا چاہتے ہیں! اگر تم چاہو تو!"

"وہ چاہتے ہیں ہم ہتھیار ڈال دیں" رانی اٹھ کر مجھ سے دور ہو گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات یکدم ہی بدل گئے تھے "ان کی خواہش ہے کہ ہم اپنے جھانسی سے دستبردار ہو جائیں"

"ڈارلنگ ..... یہ تو ہر حال میں چھن جائے گا ..... کسی بھی دن وہ دیواریں توڑ کر اندر آ گھسیں گے اور سب کچھ ختم ہو جائے گا ..... تم اس بات سے واقف ہو اور تمہارے مشیر بھی اچھی طرح جانتے ہیں حتیٰ کہ اگنتیف بھی ..... ویسے وہ شیطان یہاں کب سے ہے اور کیا کر رہا ہے؟"

"وہ یہاں ہی نہیں' میرٹھ اور دہلی میں بھی تھا ..... ہر اس جگہ جہاں بغاوت ہوئی ..... شروع دن سے ..... وہ اپنے ساتھ روسی مدد کا وعدہ لے کر آیا تھا۔ اپنے آقا کی طرف سے" اس نے کندھے اچکائے "ہمیں علم نہیں ..... لیکن ہم نے خیبر کے اس پار روسی فوجوں کے اجتماع کے بارے میں سنا ہے ..... کچھ لوگ انہیں خوش آمدید کہیں گے ..... ہم سمیت ..... لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' خاص طور پر اب اگر جھانسی پر سرکار کا قبضہ ہو گیا تو وہ تانتیا یا نانا کے پاس چلا جائے گا' یہ الگ بات ہے کہ ہم' تم پر تشدد کے جرم میں اسے مروا ڈالیں۔"

میں خوش ہو گیا' لیکن اس خوشی میں اپنے مطلب کی بات نہیں بھولا۔

"لیکن انہیں جھانسی کی ضرورت نہیں" میں نے رانی کو بتایا "وہ تمہیں چاہتے ہیں" اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا لیکن میں رکا نہیں "وہ باغیوں کے ساتھ کوئی شرائط طے نہیں کریں گے

.....کیونکہ تمہاری فوج میں نصف باغی ہیں اور ان کے لیے کوئی معافی نہیں۔ چنانچہ وہ شہر پر چڑھ دوڑیں گے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے' لیکن وہ تمہیں زندہ بچانا چاہتے ہیں' اگر تم تنہا خود کو ان کے حوالے کردو' تب وہ تمہیں .....'' میں اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا'' .....تمہیں سزا نہیں دیں گے۔''

''وہ ہمیں کیوں چھوڑیں گے؟'' ایک ثانیے کے لیے اس کی آنکھوں میں آگ سی لہرائی ''اب تک انہوں نے کسے بخشا ہے؟ وہ ہمیں زندہ کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟ جبکہ اس سے پہلے وہ انسانوں کو توپوں کے دہانوں سے باندھ کر اڑا چکے ہیں' بغیر مقدمے چلائے انہیں پھانسی دے چکے ہیں اور شہر کے شہر جلا کر راکھ کر چکے ہیں۔ کیا وہ نانا یا تانتیا یا عظیم اللہ کو چھوڑ دیں گے' اگر نہیں تو پھر رانی جھانسی ہی کیوں؟''

یہ اتنا آسان سوال نہیں تھا جس کا جواب فوری طور پر دے دیا جاتا۔ نہ ہی میں سچ کہہ سکتا تھا۔ وہ میری اس بات کو کبھی قبول نہ کرتی کہ یہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ایک سیاسی چال ہے۔

''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے'' میں نے احتیاط سے بات شروع کی ''اس کی وجوہات کچھ بھی ہوں.....''

''یہ اس لیے ہے کہ ہم ایک عورت ہیں؟'' اس نے نرمی سے کہا اور پھر میرے مقابل آ کھڑی ہوئی ''اور برطانوی ایک عورت کے خلاف جنگ نہیں کرتے'' وہ کئی لمحوں تک یک ٹک مجھے گھورتی رہی ''کیا اس لیے کہ ہم خوبصورت ہیں؟ اور کیا وہ ہمیں لندن لے جانا چاہتے ہیں؟ رومنوں کی طرح' جیسے وہ اپنے قیدیوں کو دیدار عام کے لیے.....''

''یہ ہمارا اسٹائل نہیں'' میں نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹی ''یہ درست ہے کہ ہم عورتوں کے خلاف نہیں لڑتے.....اور.....لیکن.....تم.....مختلف ہو.....''

''ان کے لیے؟ لارڈ کیننگ کے لیے؟ جنرل روز کے لیے؟ وہ ہمیں نہیں جانتے' پھر انہیں ہمارا خیال کیوں ہے؟ تم لوگوں میں سے کوئی.....'' وہ رکی اور گھٹنوں کے بل پھر میرے سامنے بیٹھ گئی' اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ''.....تم؟ کیا تم نے ہمارے لیے بات کی ہے؟ ہماری سفارش کی ہے؟ تم لارڈ پالمرسن کی طرف سے آئے تھے.....کیا تم نے ہمیں بچانے کے لیے کہا ہے؟''

میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جنرل روز کے اس عظیم منصوبے کی پشت پر وہ میرا ہاتھ سمجھے گی۔ پہلے تو میں خاموش رہا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کی ہمدردیاں سمیٹنے کا اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں ملے گا' چنانچہ کچھ دیر میں اسے گھورتا رہا پھر جھینپنے کے سے انداز میں سر جھکا لیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور میری ٹھوڑی اوپر اٹھالی۔ وہ بری طرح مجھ پر فریفتہ ہو چکی تھی۔

''کیا واقعی تم نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا' یہاں آنے کا..... ہمارے لیے؟''

''تم جانتی ہو' میں تمہارے بارے میں کیا سوچتا ہوں!'' میں نے پیار بھرے انداز میں اسے دیکھا ''جس وقت میں نے پہلی بار تمہیں جھولے پر دیکھا تھا' اسی لمحے سے تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ دنیا میں کسی بھی شے سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہوں' تمہیں!''

وہ کئی ثانیے تک ساکت بیٹھی مجھے دیکھتی رہی' پھر سرگوشی کے سے انداز میں بولی ''آج رات ..... ہم نہیں سمجھتے ..... ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ تم ہمارے پاس آ گئے ہو ..... جبکہ ہم تمہیں کھو چکے تھے ..... ہمارے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ تم ہم سے سچی محبت کرتے ہو یا نہیں بلکہ یہ بہت ہے کہ تم ہمارے پاس آ گئے ہو' لیکن اب.....''

میں یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ وہ کہیں دوبارہ رونہ دے لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا ''وہ لوگ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''صرف یہ کہ تم ہتھیار ڈال دو..... اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''لیکن کیسے؟ اگر شہر پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ اور باغیوں کو معافی نہیں دی جاتی تو ہم کیسے .....؟''

''ان کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں'' میں نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا ''اس کا بھی انتظام ہو جائے گا' اگر میں تمہیں بتاؤں کیسے' تو تم وہ سب کچھ کرو گی؟''

''اگر تم بعد میں ہمارے ساتھ رہو'' اس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں ''ہم وہی کریں گے جو وہ کہیں گے'' میں نے لحظے بھر کے لیے روز کو پس پشت ڈال دیا ''شہر پر حملے کے بعد ہماری فوجیں قلعے کی طرف بڑھیں گی'' میں نے اسے بتایا ''تمہیں بہر صورت فرار کے لیے تیار رہنا ہوگا ..... آرکا گیٹ کے راستے۔ ہم اس وقت تک وہاں سے اپنی کیولری پکٹ ہٹا چکے ہوں گے تاکہ یہ محفوظ طریقے سے ہو سکے۔ تم آرکا روڈ پر آگے بڑھو گی اور پھر تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا

.....گھبرانا نہیں' بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا''

''ایسا ہی ہوگا'' اس نے اثبات میں سر ہلایا ''لیکن شہر کا کیا ہوگا؟''

''اس پر قبضہ کر لیا جائے گا لیکن کوئی لوٹ مار نہیں ہوگی .....'' روز نے مجھ سے اس کا وعدہ کیا تھا' چنانچہ میں نے یہی بات رانی کو بتا دی۔ ''لوگ اگر مزاحمت نہیں کریں گے تو انہیں بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔ باغی .....ان کے لیے بھی یہی شرائط ہوں گی۔''

''اور وہ لوگ کیا کریں گے.....ہمارے ساتھ؟ کیا وہ ہمیں قید کر دیں گے؟''

مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہ تھا۔ نہ ہی میں کوئی حتمی بات کہہ سکتا تھا۔ وہ یقینی طور پر اسے ہندوستان کے کسی ایسے دور دراز علاقے میں جلاوطن کر دیتے جہاں وہ ان کے لیے پریشانی کا باعث نہ بن سکتی۔

''نہیں'' میں نے جواب دیا ''وہ تم سے بہت اچھے انداز میں پیش آئیں گے.....''

میں اسے مختلف راجوں' مہاراجوں کی مثالیں دے کر یقین دلانے لگا کہ انگریز اس سے ایسا ہی سلوک کریں گے جو ایک رانی کے شایان شان ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے اس حد تک قائل کر لیا کہ وہ مسکرانے لگی۔ اب وہ میرے برابر بیٹھ کر بے فکری سے باتیں کر رہی تھی۔

لیکن جب میں نے تجویز پیش کی کہ وہ چند ثانیوں کے لیے میرے ہاتھ کھول دے تا کہ میں اسے لپٹا کر پیار کر سکوں تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور کہنے لگی کہ ہم لوگ پہلے ہی خاصا وقت ضائع کر چکے ہیں' مزید وقت صرف ہوا تو لوگ بلاوجہ شک کرنے لگیں گے۔ اس نے ایک بار پھر ہونٹوں کے ذریعے مجھے اپنی محبت کا یقین دلایا اور کہا کہ مجھے کچھ دیر اور صبر و تحمل کے ساتھ قیدی بن کر رہنا ہوگا تا کہ اس کے لوگوں کو شک نہ ہو لیکن جونہی مناسب وقت آیا وہ مجھے اپنے پاس بلا لے گی۔

''اور پھر ہم اکٹھے نکل چلیں گے.....چند ایک قابل اعتماد افراد کے ہمراہ'' اس نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ''اور تم ہماری حفاظت کرو گے اور جب ہم سرکار کے پاس پہنچیں گے تو ہم سے محبت کرو گے؟''

میں نے جواب کے طور پر اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے آئینے کے سامنے جا کر اپنا نقاب درست کیا اور دیوان پر جا بیٹھی۔ میں دوبارہ کمرے کے وسط میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے چہرے پر سختی کے تاثرات پیدا کیے اور پھر اپنے چھوٹے سے گانگ پر

ضرب لگائی۔ شیر خان دیہاتی فائر بیر یگیڈ کی طرح اندر داخل ہوا۔ مصاحب اور خدمت گار عورتیں اس کے پیچھے تھیں۔

''اس قیدی کو شمالی ٹاور میں لے جاؤ'' وہ پورے وقار کے ساتھ بولی ''اسے خوفزدہ کرنے کی ضرورت نہیں، بس اس کا خیال رکھنا شیر خاں!''

میں بے شک وہاں قید میں تھا لیکن مستقبل سے بہر حال مایوس نہ تھا۔ مجھے امید تھی کہ جنرل روز کا منصوبہ کامیاب ہوگا۔

شیر خان نے مجھے رانی کے حکم کے مطابق ایک کمرے میں پہنچا دیا جس میں تقریباً تمام بنیادی سہولتیں میسر تھیں لیکن اس آرام دہ ماحول کے باوجود میرے لیے وہ ایک جیل ہی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ شیر خان ایک اچھا جیلر ثابت ہوا اور اس نے میری ضروریات کا ہر ممکن خیال رکھا تھا۔

قید خانے میں بھی مجھے رانی نہیں بھولی۔ مجھے اس سے پر جوش خیر مقدم کی توقع تو تھی لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ اس قدر جذباتی انداز میں مجھ سے ملے گی۔ ممکن ہے وہ خود بھی فرار کے راستے تلاش کرتی رہی ہو اور اب بڑی مشکل سے اسے ایک شخص مل گیا تھا جو اسے بہ حفاظت شہر سے نکال سکتا تھا۔ مجھ پر التفات کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی لیکن میں اس موضوع پر زیادہ سوچ کر اپنی قوتیں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا مستقبل ایک عورت کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اور اب دیکھنا یہ تھا کہ پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

اگلے روز شہر میں نقارے اور جنگ کے طبل بجنے لگے تو میں یہی سمجھا کہ جنرل روز نے حملہ کر دیا ہے لیکن بعد ازاں شیر خاں نے مجھے بتایا کہ یہ ایک دھوکا تھا۔ بقول اس کے، تانتیا توپ بیس ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر جھانسی واگزار کرانے آیا تھا۔ جنرل روز نے اپنی بھاری آرٹلری کو بدستور محاصرے پر چھوڑا اور باقی فوج کو لے کر چند میل دور بہنے والے دریائے بیتوا کی طرف روانہ ہو گیا تھا تاکہ تانتیا کو سزا دے سکے۔ (25) اسی وقت اس نے جھانسی پر حملے کا حکم دے دیا تھا تاکہ ان لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو سکے جو تانتیا کے آنے کی خبر سن کر جنرل روز پر جوابی حملے کی تیاریوں

میں مصروف ہو گئے تھے۔

''جھانسی میں باغیوں کی اس قدر تعداد موجود ہے کہ اگر وہ شہر سے باہر نکل کر حملہ کر دیں تو تمہاری فوج چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ جائے۔'' شیر خان نے مجھے بتایا ''لیکن ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں اور اب سرکار کے ہاتھوں ان کی شکست مقدر ہو چکی ہے۔''

میں نے اسے یاد دلایا کہ وہ بھی باغیوں کا ساتھی ہے اور اگر جھانسی فتح ہو گیا تو اس کا انجام بھی باغیوں سے مختلف نہ ہو گا۔

''میں باغی نہیں'' اس نے جواب دیا ''بلکہ رانی کا تنخواہ دار سپاہی ہوں۔ میں نے اس کا نمک کھایا ہے اور ایک یوسف زئی کی حیثیت سے اس کے لیے اس طرح لڑتا ہوں جیسا کہ انگریزوں کی طرف سے گائیڈز میں رہ کر لڑتا تھا۔ صاحب لوگ باغیوں اور ان افراد میں فرق کو واضح طور پر سمجھتے ہیں جو وفاداریاں ثابت کرنے کے لیے لڑتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ عزت سے پیش آئیں گے اگر میں زندہ رہا تو .....''

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ فوری طور پر مجھے یلدرم کا خیال آیا۔ شیر خان بھی دوسرا یلدرم تھا۔

''تمہارے لیے ایک اور خبر بھی ہے حضور!'' ذرا دیر بعد وہ دوبارہ بولا ''میرے خیال میں تمہارے ساتھیوں نے اس روسی صاحب کو پھانسی دے دی ہے۔ وہ رات کو تانتیا سے ملنے روانہ ہوا تھا لیکن واپس نہیں آیا۔''

مجھے دلی خوشی ہوئی تھی۔ اس کے مرنے سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اب میری راہ کی رکاوٹ نہیں بنے گا۔ مجھے یقین تھا کہ رانی کے فرار اور بعد میں انگریزوں کے ہاتھوں گرفتاری کا ڈرامہ بخوبی پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

میرا خیال تھا کہ تانتیا کے باوجود جنرل روز جھانسی پر حملہ آور ہونے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرے گا لیکن اس سے اگلا دن اور رات بھی میں نے اپنی کوٹھری میں دور سے آنے والی بھاری توپوں کی گولہ باری کی آواز سنتے ہی گزاری۔ تیسری رات البتہ میں نے گولہ باری کچھ وقفے کے لیے رکنے کی آوازیں سنیں۔ کچھ دیر سکون رہا جس کے بعد ہلکے ہتھیاروں کی فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ برطانوی انفنٹری نے پیش قدمی کا آغاز کر دیا ہے۔ شہر میں بھی

مجھے کئی دھماکے سنائی دیے تھے۔

''وہ شہر میں موجودہ ہیں'' صبح ناشتے پر شیر خان نے مجھے آگاہ کیا ''باغی میری توقعات سے زیادہ بہتر انداز میں لڑ رہے ہیں' حملہ آوروں کو گلیوں اور سڑکوں پر خاصی مشکلات کا سامنا ہے'' اس نے رک کر فخریہ انداز میں اپنے شکاری چاقو کو تھپتھپایا ''شاید ہر ہائی نس مجھے بھی آنے والوں کے گلے کاٹنے کی اجازت دے دیں لیکن آپ فکر نہ کریں' تسلی سے ناشتہ کریں حضور!''

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ رانی نے ابھی تک شیر خاں کو اپنے راز میں شامل نہیں کیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ رات ہونے کا انتظار کرے گی' پھر فرار ہو جائے گی۔ اس وقت تک ہمارے فوجی یقیناً قلعے کے دروازے پر دستک دے رہے ہوں گے۔ چنانچہ میں بدستور اپنی کوٹھری میں بیٹھا فائرنگ اور دھماکے سنتا رہا حتیٰ کہ رات کے وقت یوں لگنے لگا جیسے یہ سب محض چند سو گز کے فاصلے پر ہو رہا ہو۔ اندھیرا ہوا تو میں نے اپنی کوٹھری کی کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جھانسی پر اللہ تعالیٰ نے سرخ روشنائی الٹ دی ہو۔

مجھے نہیں معلوم اس وقت کیا بجا تھا جب میں نے اپنی کوٹھری کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور پھر شیر خان اپنے دو محافظوں کے ساتھ ٹارچیں لئے اندر داخل ہوا۔ انہوں نے کچھ کہے بغیر مجھے ساتھ لیا اور سیڑھیاں اتر کر ایک چھوٹے سے صحن میں داخل ہو گئے۔

چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا لیکن ماحول روشن تھا۔ یہ روشنی دیواروں کی دوسری طرف پھٹنے والے گولوں کی سرخی سے پیدا ہو رہی تھی۔ فضا میں بارود کی بو رچی ہوئی تھی اور قلعے کے باہر کئی عمارتوں سے اٹھنے والے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔

صحن، رانی کے سرخ جیکٹوں والے محافظوں سے بھرا پڑا تھا جبکہ ان سے ذرا فاصلے پر تنگ دروازے کے پاس ایک دبلا پتلا گھڑ سوار موجود تھا۔ میں نے اسے فوراً شناخت کر لیا۔ سفید گھوڑے پر لکشمی بائی تھی۔ اسے محافظوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا جبکہ گھوڑوں پر سوار دو خدمت گار عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ رانی اور دوسری عورتوں کے چہرے بھاری نقابوں میں پوشیدہ تھے۔ ایک اور گھڑ سوار نے اپنے آگے کاٹھی پر رانی کے سوتیلے بیٹے دامودھر کو بٹھا رکھا تھا۔ میں اسے پکارنے ہی والا تھا کہ شیر خان کسی چھلاوے کی مانند میری بائیں سمت آیا اور میری ٹانگ کے ساتھ زنجیر باندھ دی۔ میں زنجیر کی جھنکار پر چونکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں احتجاج کرتا وہ مجھے دھکیلتا ہوا

ایک گھوڑے کی طرف بڑھا۔

''اس پر بیٹھ جایئے حضور!'' اس نے سرگوشی میں کہا اور مجھے سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کر دیا۔

میرے بیٹھتے ہی اس نے زنجیر کو گھوڑے کے پیٹ کے ساتھ دوسری جانب پھینکا اور میرے دائیں ٹانگ کو بھی جکڑ دیا۔ اب میں گھوڑے کے ساتھ بندھ گیا تھا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟'' میں نے بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ دریافت کیا۔

شیر خان اچھل کر دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گیا ''سکون سے حضور!'' وہ گھوڑا میرے برابر لے آیا ''یہ سب ہائی نس کے حکم پر ہوا ہے' چلیے!''

اس نے میرے گھوڑے کو ہاتھ رسید کیا اور ساتھ ہی اپنا گھوڑا بھی آگے بڑھا دیا۔ رانی اور اس کے ساتھی گھڑ سوار پہلے ہی دروازے پار کر کے نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ ذرا دیر بعد ہم ایک قطار میں سفر کر رہے تھے۔ وہ ایک گلی تھی جس کی دونوں سمت بلند دیواریں تھیں۔ میرے آگے شیر خان اور عقب میں ایک دوسرا پٹھان تھا۔

یہ سب میری سوچوں سے ماورا تھا۔ اس نے میرا راز خود تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی آگاہ کر دیا تھا اس لیے مجھے شک سا ہونے لگا کہ شاید وہ خود کو برطانویوں کے حوالے کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ میں ابھی تک ایک قیدی کی حیثیت میں تھا۔ جبکہ میری خواہش تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ سواری کرنے دیتی تاکہ میں شہر سے نکلنے سے قبل اس سے بات کر سکتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم غلطی سے محاصرہ کرنے والوں کی توپوں کے سامنے جا پہنچیں۔

لیکن اب شاید میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ قافلہ گلیوں گلیوں گزرتا رہا اور پھر چند موڑ مڑنے کے بعد ہم ایک چوڑی شاہراہ پر پہنچے۔ وہاں ایک گھر میں آگ لگی ہوئی تھی لیکن کوئی ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہیں رکا۔ اس کے بعد ہمارا سفر تاریکی میں شروع ہو گیا۔ اگلے گھڑ سوار البتہ راستہ دکھانے کے لیے کبھی کبھی ٹارچیں روشن کر لیتے تھے۔ اسی طرح سفر کرتے ہوئے ہم ایک بڑے دروازے پر جا پہنچے جہاں رانی کے مزید پہرے دار موجود تھے۔

میں نے اسے اپنے سفید گھوڑے پر سے جھک کر گارڈ کمانڈر سے کچھ کہتے دیکھا۔ بالآخر کمانڈر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے رانی کو سلیوٹ کیا اور اپنے ماتحتوں کو احکامات دینے لگا۔ چند ثانیوں

بعد اس کے دو آدمیوں نے مرکزی دروازے کی رکاوٹ ہٹالی اور ہم لوگ کھلے دروازے سے باہر نکل آئے میں نے فوراً پہچان لیا' وہ آرکا روڈ تھا۔

باہر مکمل تاریکی تھی لیکن نصف میل کے فاصلے پر ہماری پکٹس کی روشنیاں اور آرٹلری کی گولہ باری سے کی کیمپ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ شیر خان نے میرے گھوڑے کی باگ تھام رکھی تھی۔ پہلے گھوڑے کم رفتار چمک سے آگے بڑھتے رہے' پھر ان کی رفتار تیز ہوگئی۔ اگلے سوار دائیں جانب مڑ گئے۔ تو ہم نے بھی سڑک سے اتر کر ان کی تقلید کی۔ اب ہمارا سفر ایک کھلے میدان میں شروع ہوا اور تب میرے ذہن میں شک کی پہلی کرن نمودار ہوئی۔

ہم دائیں سمت کیوں مڑے تھے؟ وہ راستہ تو بالکل سیدھا تھا جس پر رانی کو سفر کرنا تھا۔ اور جہاں جنرل روز کی پکٹس اس کی منتظر تھیں۔ بے شک رانی کے گھڑ سوار یہ بات نہیں جانتے تھے لیکن خود اسے تو علم تھا۔ کیا اسے احساس نہیں کہ ہم غلط سمت جا رہے ہیں؟ اس طرح ہم ایسے لوگوں میں جا گھستے جو ہمیں دشمن سمجھ کر بھون ڈالتے کیونکہ انہیں ہماری آمد کی توقع ہی نہ ہوتی۔

مگر اب اسے متنبہ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اب خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ ہم کہاں پہنچتے اور اور ہمارا کیا حشر ہوتا؟ اچانک ہی شیر خان میرے برابر آ گیا اور میری سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا چاقو نکالا اور میری پسلیوں میں چبھو دیا۔

''تم ایک لفظ بھی بولے' لانس تو دوسرا لفظ صرف شیطان سے ہی کہہ سکو گے'' اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا جس میں پوشیدہ دھمکی مجھے واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے تو میں سن ہو کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ شیر خان کے اس عمل کا مطلب کیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ گھوڑا اگلا قدم اٹھاتا میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند صاف ہوگئی ..... وہ فرار ہو رہی تھی لیکن اس راستے سے نہیں جو روز اور میں نے اس کے لیے تجویز کیا تھا۔ وہ میری معلومات کو استعمال ضرور کر رہی تھی لیکن اپنے انداز میں۔ میری نظروں کے سامنے وہ تمام مناظر گھوم گئے جو جھانسی میں رونما ہوئے تھے۔ اس کا جذباتی انداز' آنسو بھری آنکھیں میرے چہرے کا طواف کرتے اس کے کپکپاتے ہونٹ ..... کیا وہ سب فریب تھا؟ ..... اگر سب جھوٹ تھا تو پھر وہ میرے ساتھ اسکول کی جذباتی لڑکی کی مانند پیش کیوں آئی تھی؟ ..... لیکن اب وہ سب کچھ بھول کر ایک غلط سمت جا رہی تھی۔ میری پسلیوں میں تیز

دھار خنجر چبھ رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ خطرناک شیر خان کی سرگوشیاں تھیں ''سیدھے چلتے رہو فرنگی! ورنہ تمہاری آنتیں نکال دوں گا''

ہمارے گھوڑے اب زیادہ تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے۔ بائیں جانب سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ گولیاں سر کے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزرنے لگیں۔ پکٹیں محض چند سو گز کے فاصلے پر تھیں۔ وہ اندھا دھند فائر کر رہے تھے اور ہم ان فائروں کے درمیانی راستے کو فرار کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ شیر خان اور ایک دوسرے پٹھان نے مجھے دائیں بائیں سے کور کر رکھا تھا۔ میں گھوڑا بھگا کر کسی بھی صورت فرار نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ انہوں نے مجھے زنجیروں کے ذریعے گھوڑے کی کاٹھی سے جکڑ دیا تھا۔

میں بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟ پکٹ فائر اب ہمارے دائیں بائیں آ رہا تھا۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ چند ثانیوں بعد ہم ایک گرے ہوئے گھوڑے اور اس کے مردہ سوار کے قریب سے گزرے۔ عقب سے بلند آواز میں ہمیں للکارا جا رہا تھا لیکن ہم اندھا دھند گھوڑے بھگا رہے تھے اور ان کا اٹھنے والا ہر قدم ہمیں جھانسی، جنرل روز اور تحفظ سے دور لئے جا رہا تھا۔

◈ ◈ ◈

ہمارا سفر کتنی دیر اور کس سمت جاری رہا، مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ میرا ذہن بہ یک وقت غصے، خوف اور بے یقینی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں صحیح طور پر سوچ بھی نہیں پا رہا تھا۔ بظاہر یہ بات ناقابل یقین سی تھی کہ رانی میرے ساتھ اس قدر بے دردی سے پیش آ رہی تھی لیکن یہی حقیقت تھی۔ اس نے مجھے بیچ کھایا تھا۔ میں نے بڑے خلوص کے ساتھ اس سے جھوٹ بولا تھا لیکن وہ مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی تھی۔

میں بار بار آگے جانے والے گھوڑوں کے ہیولے دیکھتا اور پھر شیر خان کی طرف متوجہ ہو جاتا جو کسی بھوت کی مانند میرے ساتھ ساتھ تھا۔ سو گز کے فاصلے پر رانی کا دبلا پتلا جسم سفید گھوڑے پر ہچکولے کھا رہا تھا۔ اردگرد پٹھان پہرے دار تھے جنہوں نے اسے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

اچانک ایک سمت سے چیخ بلند ہوئی۔ایک پٹھان دائیں جانب اشارہ کر رہا تھا۔گولی چلی اور دائیں جانب سے گھڑ سواروں کا ایک دستہ نالے میں سے برآمد ہوتا دکھائی دیا۔وہ تعداد میں ہم سے نصف تھے لیکن ان کا تعلق کمپنی کیولری سے تھا۔وہ تیز رفتاری سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔میں نے چیخنا چاہا لیکن اسی وقت شیر خان میرے سامنے آ گیا جبکہ پٹھان محافظ تلوار سونت کر آنے والوں کے سامنے ڈٹ گئے۔

میں دور سے محض تلواروں کے ٹکراؤ کی آوازیں سن رہا تھا اور مٹی کے اٹھنے والے بگولے دیکھ رہا تھا۔کچھ ثانیے یہی کیفیت رہی پھر میں نے ایک پٹھان کو کسی کے ساتھ مٹی کے اس طوفان سے نکلتے دیکھا۔وہ رانی کی ایک خدمت گار عورت تھی۔پھر کچھ اور لوگ باہر آئے۔رانی لکشمی بائی بھی ان میں سے ایک تھی۔ایک گھڑ سوار اس کے تعاقب میں تھا۔وہ تلوار لہرا کر اس پر جھپٹنا ہی چاہتا تھا کہ شیر خان تیز آوز میں چیخا۔رانی نے اپنے سفید گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے گھمایا۔اگلے ہی لمحے رانی کی تلوار چمکی۔کمپنی کے آدمی اور رانی کی تلواریں آپس میں ٹکرائیں۔دو تین بار آوازیں آئیں اور پھر میں نے سرکاری گھڑ سوار کو اپنا بازو پکڑے ہوئے اپنے گھوڑے پر جھکے ہوئے دیکھا۔اگر وہ تیزی سے گھوڑا بھگا نہ لے جاتا تو رانی اسے قتل کر چکی ہوتی۔(26)

اس کے بعد بھی بہت کچھ ہوا ہوگا۔لیکن شیر خان مجھے قریبی نالے میں لے گیا۔رفتہ رفتہ باقی لوگ بھی وہاں آنے لگے اور اوپر ہونے والا تصادم بھی دم توڑنے لگا میں دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ رانی کے آدمیوں نے سرکاری فوجیوں کو مار بھگایا ہوگا۔رانی سب سے آخر میں ہمارے پاس آئی تھی۔

جھانسی سے فرار کے بعد پہلی مرتبہ میں نے اسے اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔اس نے اپنے لمبے چغے کے نیچے مردانہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔پگڑی پر مردانہ ٹوپی تھی۔ننگی تلوار اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی جس کی دھار خون آلود تھی۔وہ چند لمحے کے لیے وہ اس گھڑ سوار کے پاس رکی جس نے دامودھر کو اپنے آگے بیٹھا رکھا تھا۔اس نے بچے سے کچھ باتیں کیں۔پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور ایک پٹھان سے کچھ کہا اور اپنی تلوار اسے تھما کر رومال سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔تب اس نے میری طرف دو دیکھا اور باقیوں نے خاموشی سے اس کی تقلید کی۔

میں نے سوچا کہ اس سے کچھ کہوں لیکن فوری طور پر کوئی بات نہ سوجھی۔مجھے ایک بندو

ملکہ نے کچھ دیر پہلے ہی دھوکا دیا تھا۔ میرا ایک ہم وطن اس کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ اور خود میں اس کے رحم و کرم پر تھا اس صورت حال میں بھلا اسے کیا کہا جا سکتا تھا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ کہ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ شیر خان سے مخاطب تھی۔

''تم اسے گوالیار لے جاؤ گے'' اس کی آوز میں بلا کا سکون تھا'' اسے اس وقت تک وہاں رکھنا جب تک ہمارا پیغام نہ ملے۔ بالآخر یہ ہماری سودے بازی کے کام آئے گا۔''

گوالیار ایک خوفزدہ کر دینے والا شہر تھا۔ وہاں ایک بڑا اور پہاڑی قلعہ تھا جو نہ صرف جھانسی کے مقابلے میں زیادہ محفوظ تھا بلکہ اسے ہندوستان کا مضبوط ترین قلعہ بھی کہا جاتا تھا۔ مجھے وہاں واقعی جیل کی طرز کی ایک کوٹھری میں رکھا گیا جہاں میں نے اپنی زندگی کے دو ماہ گزارے۔ مجھ سے ملنے کے لیے صرف شیر خان آتا اور ہفتے میں ایک بار یہ یقین کر کے واپس چلا جاتا کہ میں ہنوز زندہ ہوں۔

وہ اور اس کے ساتھی پٹھان اپنی رانی کے حکم پر مجھے وہاں لے گئے تھے۔ یہ میری زندگی کا بدترین سفر تھا۔ جب ہم اپنی منزل پر پہنچے تو میں تقریباً نیم بے ہوش تھا لیکن اس کے باوجود ان ظالموں نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے زنجیر سے نجات نہیں دلائی تھی۔

ہم نصف شب کو گوالیار پہنچے اور انہوں نے لے جا کر سیدھا مجھے کوٹھری میں ڈال دیا اور میں وہاں تنہا لیٹ کر سسکتا رہا اور ہندوستان میں گزارے ہوئے دن یاد کرتا رہا۔ میرٹھ' کانپور' لکھنؤ، ٹھگ' مگر مچھ اور اب یہ کوٹھری۔ تقدیر نے مجھے کہاں لا پٹخا تھا۔

شروع شروع میں' میں کچھ پریشان رہا لیکن پھر تمام فکروں سے آزاد ہو گیا۔ سوچتا بھی تو کیا سوچتا؟ مجھے اپنے انجام کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا۔ باہر کی دنیا میں بغاوت اپنے آخری سانس لے رہی تھی۔ کیمبل نے شمال میں جمنا کے کنارے تباہی مچا دی تھی جبکہ جنرل روز، جھانسی پر قبضہ کرنے کے بعد تانتیا توپ اور میری غدار اپسرا کے تعاقب میں تھا۔ اس نے انہیں کالپی اور کانچ میں شکست دے کر گوالیار کی طرف دھکیل دیا تھا۔ جہاں میں مقامی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

لطف کی بات یہ تھی کہ میں گوالیار میں قید تھا اور یہاں کا راجا سندھیا ہنوز بغاوت میں خود کو غیر جانبدار قرار دے رہا تھا۔ بقول اس کے وہ اپنی جیل کو کسی برطانوی آفیسر کے لیے استعمال کیے جانے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھا لیکن بعد میں ثابت ہو گیا کہ وہ اور اس کے مشیر بہر حال باغیوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ کالپی میں شکست کھانے بعد تانتیا اور لکشمی بائی نے گوالیار کا رخ کیا تھا اور راجا سندھیا کی فوجیں ان سے جا ملی تھیں۔ چنانچہ اب وہاں ہندوستان کی طاقت ور ترین فوج سب سے بڑے باغی لیڈروں کی سرکردگی میں جمع تھی اور جنرل روز ہنوز ان کے تعاقب میں تھا۔

مجھے اپنی کوٹھری میں کسی بات کی کوئی خبر نہ تھی میرے جسم پر وہی میلی کچیلی مقامی وردی تھی جو میں نے رانی کے کیمپ میں پہنی تھی۔ دن ہفتوں میں گزرتے رہے اور میں اسی لاچاری کے عالم میں اپنی کوٹھری میں مقید رہا۔ یہ بدترین سزا تھی۔ جس کے دوران، میں دن اور رات کی تمیز بھی کھو بیٹھا تھا۔ مجھے تو اب یہ بھی علم نہیں تھا کہ کوٹھری سے باہر کسی دنیا کا وجود ہے یا ختم ہو چکا ہے۔

دن بے آرامی میں گزرتے اور راتوں کو خوف کے مارے نیند نہ آتی۔ کبھی کبھار آنکھ لگ جاتی جس کے دوران مجھے عجیب وغریب خواب آتے۔ اس طرح کے ایک خواب میں، میں بالیوں کالج کی میوزک کلاس میں جا پہنچا جہاں کیپٹن اسپرنگ، لمبا ہیٹ اور ہاتھوں پر سفید دستانے پہنے میوزک کی ہدایات دے رہا تھا۔ وہ تمام وہاں موجود تھیں.....لولا مونٹیز اور جوزی اور جوڈی (میرے گورنر کی رکھیل) اور وہ ریشمی بدن والی سوسی، جس کا تعلق نیو اورلینز سے تھا۔ موٹی بارونس، پچم پین، اور نریمان.....ان میں لکشمی بائی بھی نظر آئی..... لیکن پھر یہ منظر کھو گیا۔ اچانک ہی دھماکے ہونے لگے اور فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میری آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فائرنگ حقیقتاً ہو رہی تھی۔ گولے پھٹنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں، لیکن اس رات اور اگلے پورے دن مجھے یہ پتا نہ چل سکا کہ کون کس پر اور کیوں فائرنگ کر رہا ہے؟

یہ سلسلہ تیسرے دن صبح تک جاری رہا اور پھر میری کوٹھری کا دروازہ کھول کر شیر خان اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ انہوں نے کچھ کہے بغیر مجھے کوٹھری سے باہر نکالا میں ان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن فی الحال آزادی کی خوشی ہی اتنی تھی کہ زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ باہر نکلا تو میدان فوجیوں سے اٹا پڑا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چیخ چلا رہے تھے۔

نقارے گونج رہے تھے اور فائرنگ میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔

میں ابھی مکمل طور پر صورت حال کا جائزہ بھی نہ لے پایا تھا کہ انہوں نے مجھے ایک گھوڑے پر سوار کر دیا۔ ہمارا رخ عظیم قلعے کے بڑے دروازے کی طرف تھا جس کے عقب میں بڑی سی توپ مسلسل باہر کی سمت گولے برسا رہی تھی۔

شیر خان اپنا گھوڑا میرے برابر لے آیا تو میں نے شور کی وجہ سے چیخ کر اس سے دریافت کیا ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہر ہائی نس کو تمہاری ضرورت ہے'' اس نے بھی چیخ کر ہی جواب دیا ''سو ہم تمہیں رانی کے پاس لے جا رہے ہیں''

ہم پھاٹک سے باہر نکل آئے .....اور انسانوں کا ایک انبوہ ہمارے سامنے تھا۔ ہر طرف چھکڑے، مٹی کے بگولے، ہتھیاروں کی جھنکاریں اور بہشتیوں کی دوڑ بھاگ دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک کے ساتھ باغیوں کی انفنٹری نے ڈیرے ڈال رکھے تھے جبکہ متعدد توپیں سامنے کی طرف گولے داغنے میں مصروف تھیں۔

صورت حال جو بھی تھی، یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ برطانوی دستے کہیں قریب ہی موجود ہیں کم از کم فائرنگ اور گولہ باری سے یہی ظاہر ہو رہا تھا اور پھر اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ میرے سامنے میلوں طویل کھلا میدان تھا جس کے آخر میں ایک پہاڑی سلسلہ تھا۔ میدان فوجیوں، ان کے جانوروں اور جنگی ساز و سامان سے اٹا پڑا تھا۔ کوئی ایک میل کے فاصلے پر بہت سے خیمے نصب تھے جن کی قطاریں تا حد نظر پھیلی ہوئی تھیں۔

دو میل ادھر ایک اور عظیم ترین فوج موجود تھی۔ یہ باغیوں کی فوج تھی۔ وہ ہماری طرف بڑھ رہی تھی اور شیر خان ان کی طرف جا رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے ایک بار پھر اس سے دریافت کیا، لیکن وہ خاموشی سے گھوڑا دوڑاتا رہا۔

ہم سڑک سے نیچے اتر آئے۔ اور اس فوج کے قریب سے ہو کر آگے بڑھتے رہے جس کا رخ گوالیار کی طرف تھا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شکست خوردہ فوج نہیں۔ ہم آرٹلری کے قریب سے گزرے جنہوں نے اپنی گنوں کا رخ دور نظر آنے والی پہاڑیوں کی سمت کر رکھا تھا۔ انفنٹری کی

گنوں کا رخ بھی ادھر ہی تھا۔

ہم نے اسی رفتار سے ایک گہرا نالہ عبور کیا اور پام کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھے جس کے نیچے کچھ خیمے نصب تھے۔ گنوں کی ایک قطار خیموں کی بائیں جانب نصب سامنے پہاڑیوں پر گولے برسا رہی تھی جہاں دشمن چھپا ہوا تھا' دوسرے الفاظ میں میری فوج موجود تھی۔

خیموں کے آس پاس بہت سے گھڑ سوار موجود تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا کہ انہوں نے جھانسی کے شاہی محافظوں کی سرخ وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ہم ان کے اور خیموں کے درمیان سے گزر کر سب سے بڑے خیمے کے باہر جا رکے جس کے راستے پر قالین' بچھے ہوئے تھے۔ وہاں محافظوں کی تعداد نہ صرف زیادہ تھی بلکہ کئی دوسرے مقامی فوجی اور غیر فوجی افراد بھی موجود تھے۔

شیر خان نے مجھے گھوڑے سے اتار کر ایک سمت کھڑا کیا اور خود خیمے کے دروازے کی جانب بڑھا۔

پردہ ہٹا اور وہ خیمے کے دروازے پر آ گئی ..... تنہا ..... یا شاید کوئی اور بھی ہو' لیکن مجھے یاد نہیں۔ اس کے ہاتھ میں شربت کا گلاس تھا جس سے چسکیاں لیتے ہوئے وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ سفید جودھپوری لباس میں تھی۔ بلاؤز کے اوپر مردانہ جیکٹ اور سفید جبہ تھا۔ اس کا چہرہ رومن سپاہیوں کی طرح آہنی خود سے ڈھکا ہوا تھا جس کے گرد سفید اسکارف ٹھوڑی تک لپٹا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی' پھر شیر خان پر جیسے برس پڑی ''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

اس نے سرگوشیوں میں رانی کو کچھ بتایا لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے مجھے گھورنا شروع کر دیا۔ چند ثانیے وہ اسی طرح یک ٹک دیکھتی رہی پھر میرے قریب آ گئی۔

''تمہارے دوست اس پار موجود ہیں'' اس نے ہاتھ سے سامنے نظر آنے والی پہاڑیوں کی سمت اشارہ کیا ''اگر تم چاہو تو ان کے پاس جا سکتے ہو''

میں سن ہو گیا۔ وہ اس طرح مجھے زندگی کی نوید دے گی' میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ بہت دیر تک میں خاموش رہا' مجھے کوئی بات سوجھ ہی نہیں رہی تھی۔ بالآخر صرف ایک لفظ میرے حلق سے آزاد ہو سکا ''کیوں؟''

اس کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا جبہ درست کیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے دیکھنے لگی۔

''اس لیے کہ سب کچھ ختم ہو گیا'' اس کا لہجہ دھیما تھا ''اور یہ آخری شے ہے جو ہم تمہارے لیے کر سکتے ہیں کرنل!''

مجھے یاد نہیں کہ اس سے پہلے اس خطاب سے اس نے کب مجھے پکارا تھا ''کیا یہ کافی نہیں؟ تمہاری فوج کل گوالیار میں داخل ہو جائے گی اور سب کچھ ختم ہو جائے گا''

میں نے اپنے عقب میں چیخوں کی آواز سنی لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔ کچھ لوگ بھاگتے ہوئے اور اسے پکارتے ہوئے وہاں پہنچے۔ رانی نے انہیں جواب دیا اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی؟

''مگر تم نے تو کہا تھا کہ میرے عوض کوئی سودا کرو گی؟'' میں نے اس کے الفاظ یاد دلائے تو وہ بری طرح چونکی۔

لحظے بھر کے لیے وہ پریشان سی دکھائی دی لیکن پھر مسکراتے ہوئے شیر خان کی طرف پلٹی ''کرنل صاحب کو ایک گھوڑا دے دو''

شیر خان فوراً روانہ ہو گیا۔

جونہی وہ دور ہوا میں بول اٹھا ''مگر .....مگر تم! لکشمی! میں سمجھ نہیں سکا.....تم کیا کرنے جا رہی ہو؟'' وہ خاموش رہی تو میں نے دوبارہ اسے پکارا ''ابھی بھی وقت ہے! میرا مطلب ہے.....اگر تم.....اگر تم.....سمجھتی ہو کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے.....تو لعنت بھیجو ان پر.....وہ تمہیں پھانسی نہیں دیں گے۔ تم جانتی ہو' میرا مطلب ہے لارڈ کیننگ نے وعدہ کیا تھا.....اور.....اور جنرل روز!'' شیر خان نے مجھے ٹہوکا دیا لیکن میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ''میں تمہارے ساتھ ہوں' سب ٹھیک ہو جائے گا' میں انہیں بتاؤں گا.....''

خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے اسے کیا کہا اور اس نے کیا جواب دیا۔ ظاہر ہے میں نے اسے باعزت طور پر ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کی تھی۔ وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہی لیکن پھر پھٹ پڑی۔

''نہیں.....تم نہیں سمجھ سکتے.....تم اس وقت بھی نہیں سمجھتے تھے جب ہمارے پاس واپس جھانسی آئے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم نے ہماری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا لیکن ہم نے

بھی اس کا بدلہ چکا دیا ہے۔''

''بدلہ؟'' میں تقریباً چیخ اٹھا ''مگر تم نے تو کہا تھا کہ مجھ سے پیار کرتی ہو.....اوہ! میں سمجھ گیا تم مجھے دھوکا دیتی رہی ہو.....جس طرح میں.....''

میرا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ وہاں جیسے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یکا یک فائرنگ شروع ہوگئی۔ گھوڑے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ آدمیوں کی چیخ وپکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ رانی نے چلا کر احکامات جاری کیے۔ ایک محافظ دوڑ کر اس کا گھوڑا لے آیا۔ میں شور کے باوجود چیخ چیخ کر اسے یقین دلا رہا تھا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں اور وہ اب بھی خود کو بچا سکتی ہے۔ اس نے کڑی نگاہوں سے مجھے گھورا اور ہاتھ بڑھا کر گھوڑے کی باگ تھام لی۔

یہ لمحے بھر کی بات تھی لیکن اس ایک لمحے میں میری زندگی کے پچاس سال پوشیدہ تھے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ اس نے چلا کر اپنے آدمیوں کو احکامات دیے اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی جبکہ میں تنہا وہیں قالین پر کھڑا رہ گیا تھا۔

شیر خان غائب ہو چکا تھا۔ میں چلا چلا کر رانی کو واپس بلا رہا تھا۔ اس کے پہرے داروں نے اسے گھیر لیا تھا۔ جبکہ ان سے پرے گنرز ہماری طرف بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔ باغی رائفل بردار بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ پلٹ کر فائرنگ کرتے اور پھر دوڑنا شروع کر دیتے۔

ان کے عقب میں رائفل بردار اور شمشیر بردار گھڑ سوار تھے۔ وہ تلواریں لہرا رہے تھے اور چیخ چیخ کر باغیوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ نیلی وردیاں اور سفید ہیلمٹ پہنے ہوئے لائٹ بریگیڈ آگے بڑھ رہا تھا۔ ان کا تعلق آئرش حصار سے تھا۔ ایک آفیسر سواروں کی کمان کر رہا تھا۔ وہ کسی آندھی کی مانند بڑھے چلے آ رہے تھے جبکہ پٹھان انہیں روکنے میں مصروف تھے۔

لکشمی بائی انہی پٹھانوں کے درمیان تھی۔ تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ان پر چیخ رہی تھی۔ اس نے ایک حصار کو تلوار سے کاٹ کر رکھ دیا۔ دوسرا بچ کر نکلا اور ایک لمحے کے لیے وہ اس بھیڑ میں چھپ سی گئی۔ تلواریں آپس میں ٹکرائیں، پستول گرجے اور پھر اچانک ہی سفید گھوڑا مجھے

دکھائی دیا۔ اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہوا۔ وہ زین پر موجود تھی۔ اس کی گردن کے ساتھ لپٹی ہوئی باگوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ وہ گر جائے گی لیکن وہ گھوڑے پر جمی بیٹھی تھی۔ اس نے گھوڑے کو موڑا اور جنگ کے حلقے سے باہر نکل آئی .....اور میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھے ہوئے تھے جبکہ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ایک ٹرو پر عقب سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کی چمکتی ہوئی تلوار نیم بے ہوش لکشمی کی طرف آئی .....میں زور سے چیخا اور پھر آنکھیں بند کر لیں' جب میں نے دوبارہ دیکھا تو وہ مجھے نیچے مٹی میں پڑی نظر آئی۔ اس کے جودھپوری لباس پر مجھے خون کے پرنالے بہتے دکھائی دے رہے تھے۔(27)

میں اس کی طرف بھاگا .....میرے اردگرد گھوڑے وحشیوں کی طرح بھاگ رہے تھے لیکن مجھے کسی شے کا ہوش نہیں تھا۔ میں نے کسی شے سے ٹھوکر کھائی اور اس کے قریب جا گرا۔ وہ مٹی میں پڑی تڑپ رہی تھی۔ اس کا اسکارف اور ہیلمٹ اتر چکا تھا۔ شدید کرب کے تاثرات اس کے حسین چہرے پر جیسے جم سے گئے تھے۔ بال کھل کر رخساروں پر آ گئے تھے۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ میں بچوں کی طرح دھاڑیں مارنے لگا۔ میرے سامنے وہ رانی زمین پر بے یار و مددگار پڑی تڑپ رہی تھی، جسے میں ہندوستان کی بہادر ترین عورت سمجھتا تھا۔ کہاں اس کا وہ رعب کہ اس کے سامنے پرندہ پر نہ مار سکے اور کہاں یہ بے چارگی کہ کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا۔

میں نے جھپٹ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو اس کے چہرے پر گرے تو اس نے آنکھیں وا کر کے مجھے دیکھا۔ میں نے جھک کر اس کے ہونٹوں پر اپنے پیار کی آخری نشانی ثبت کی تو وہ مسکرا دی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ محض پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اسی وقار اور پیار سے مری تھی جس وقار اور پیار سے زندہ رہی تھی .....بے شک روزانہ سینکڑوں یا شاید ہزاروں لوگ

مرتے تھے لیکن اس طرح نہیں جس طرح جھانسی کی رانی نے موت کو گلے لگایا تھا۔

اس کے جسم نے ایک جھٹکا لیا اور پھر اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں بری طرح بلبلایا لیکن وہ میری چیخ و پکار سننے کی حدود سے بہت دور جا چکی تھی۔ (28)

◈◈◈

میں اس میدان جنگ سے کس طرح بھاگا اور میرے ساتھ کیا کیا واقعات پیش آئے ان کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں۔ رانی کی موت کے بعد تو زندگی جیسے میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

عظیم بغاوت گوالیار کی دیواروں تلے دفن ہو گئی جہاں جنرل روز نے آخری باغی فوج کو شکست دی۔ تانتیا توپ فرار ہو گیا لیکن بعد میں انہوں نے اسے پکڑ کر پھانسی دے دی البتہ نانا صاحب کو وہ کبھی تلاش نہ کر سکے۔ باغیوں کے کچھ گروہ بھی اگلے ایک دو ماہ تک انگریزوں کو پریشان کرتے رہے لیکن بالآخر ان کا خاتمہ بھی ہو گیا۔

رانی کی موت کے بعد میں بھی زخمی ہو گیا تھا کیونکہ میرے ساتھیوں نے مجھے بھی باغیوں میں شامل سمجھ کر گھوڑوں تلے روند دیا تھا۔ میرا بازو ٹوٹ گیا اور سر پر شدید زخم آئے چنانچہ ہفتوں میں بستر پر لیٹا رہا۔ گوالیار میں آرام کے دوران ہی میں نے جنرل روز اور جنرل کیمبل کے لیے اپنی رپورٹس مرتب کیں، جبکہ ایک تیسری رپورٹ میں نے لارڈ پالمرسن کے لیے ترتیب دی جس میں جھانسی کے حوالے سے میری مصروفیات کی تفصیل موجود تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ رانی کے ساتھ کیا بیتی؟ لیکن بڑے احترام کے ساتھ.....اس میں میرے رومانس کا کوئی ذکر نہ تھا۔

موسم خزاں میں جب میں تندرست ہو گیا، مجھے جنرل کیمبل کا ایک پیغام ملا کہ مجھے میری ذمے داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا ہے اور اب میں گھر واپس جا سکتا ہوں۔

میں اس کے لیے تیار تھا لیکن روانگی سے قبل میں کوٹا کی سرائے پہنچا تا کہ اس جگہ کو دیکھ سکوں جہاں لوگوں نے نالے کے قریب لکشمی بائی کی سمادھی بنا دی تھی۔ میں وہاں پہنچا تو میرے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔

اب وہاں جنگ کے کوئی آثار نہ تھے۔کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ عرصہ قبل میری زندگی نے میرے ہاتھوں میں یہاں دم توڑا تھا۔وہ درخت بدستور وہاں موجود تھے جن کے سائے میں اس کے خیمے نصب تھے۔وہ نالہ بھی تھا جسے پار کر کے میں اس کے پاس پہنچا تھا۔سرزمین بھی وہی تھی جہاں اس کے قدم پہنچے اور پھر اس کا لاشہ تڑپا۔میرا دایاں ہاتھ خود بخود سلیوٹ کے لیے اٹھ گیا۔وہ اس قابل تھی کہ اسے صرف میں ہی نہیں پوری دنیا ہاتھ اٹھا کر سلام کرتی۔وہ بہادری کا نشان تھی .....ایسا نشان جو رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

انگریزوں کے لیے وہ ایک باغی رانی اور غدار ملکہ تھی۔میں بھی ایک انگریز تھا۔شاید میں بھی اسے باغی اور غدار ہی سمجھتا لیکن میں بہادروں کی قدر کرنا جانتا تھا۔اس لیے نہیں کہ میں نے اس سے پیار کیا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے پیچھے قابل تقلید اور قابل فخر روایات چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوئی تھی۔

میں جتنی دیر وہاں موجود رہا' میری آنکھیں برستی رہیں حتیٰ کہ جب میں پلٹا' میری آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو تھے۔اچانک ہی میری نظروں میں اس کے آخری لمحے گھوم گئے۔

اس نے مرنے سے قبل سرگوشی میں مجھے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ اب میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے کیا کہا ہوگا۔یقیناً یہی کہ ''ہم اپنے جھانسی سے دستبردار نہیں ہوں گے''

اور تاریخ گواہ ہے کہ وہ مرتے دم تک اپنے جھانسی سے دستبردار نہیں ہوئی تھی۔

حوالہ جات (۱)

[1] لارڈ ایلن بورگ، ہندوستان کا ایک سابق گورنر جنرل تھا جب کہ سر چارلس ووڈ 1835ء سے 1855ء تک بورڈ آف کنٹرول فار انڈیا کا صدر تھا۔ اسے 1859ء سے 1866ء تک دوبارہ انڈیا آفس کی خدمات سونپی گئی تھیں۔

[2] جان (جانی) نکلسن کو برٹش انڈیا میں ایک ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ اس نے ایک ذہین فوجی آفیسر اور ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اپنے ملک کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ کرنل فلیش مین سے جانی کی پہلی ملاقات، افغانستان کی پہلی جنگ کے موقعہ پر ہوئی تھی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ 1852ء کے اواخر میں جس ملاقات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس وقت جانی کو وہاں سے سینکڑوں میل دور سرحد پار ہونا چاہیے تھا۔ وہ ان دنوں پشاور میں تعینات تھا لیکن ممکن ہے کہ اپنی نئی ذمہ داری سنبھالنے سے قبل اس نے آگرہ ٹرنک روڈ پر فلیش مین سے ملاقات کی ہو۔

[3] ٹھگ ایک انتہا پسند مذہبی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور کالی دیوی کے پیروکار تھے۔ وہ قتل کی کارروائیاں ایک مذہبی فریضے کے طور پر انجام دیتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس عمل کے ذریعے وہ سورگ میں جائیں گے۔ وہ عام طور پر مسافروں کو نشانہ بناتے تھے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ دوران سفر دوستی کرتے اور پھر اچانک ہی ہم سفر کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ قتل کے لیے وہ ایک مخصوص رومال استعمال کرتے تھے جسے اپنے شکار کی گردن میں ڈال کر اس کا منکا توڑ دیتے تھے۔ 1835ء میں سر ولیم سلیمان نے ہزاروں کی تعداد میں ٹھگوں کا صفایا کیا لیکن کچھ ٹھگ بعد میں بھی جھانسی کے علاقے میں سرگرم عمل رہے۔ ان کی پہچان پپوٹوں یا کمر پر گودنے کا ایک نشان ہوا کرتا تھا۔

[4] گائیڈز، برٹش انڈیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہونے والا لڑاکا یونٹ تھا۔ 1846ء میں اس کی داغ بیل، ہنری لارنس نے رکھی جب کہ لمسڈن اس کا کمانڈر تھا۔ گائیڈز کو

سرحدی لڑائیوں میں ایک روایتی مقام حاصل رہا ہے۔

[5] متعدد انگریز مصنفین اور رانی جھانسی کے کٹر مخالفوں کے بقول عورتوں کے سلسلے میں فلیش مین کا رویہ نہایت افسوسناک اور شرمناک رہا لیکن ان میں سے چند ایک ایسی تھیں جن سے وہ دلی لگاؤ حتیٰ کہ احترام تک کا جذبہ محسوس کرتا تھا اور لولا مونٹیز اور رانی جھانسی کا شمار انہی خواتین میں تھا۔ بے شک رانی نے اس کا دل موہ لیا تھا لیکن رانی نے اس کے لگاؤ کا جواب کہاں تک دیا یہ بات آج تک مشکوک ہے۔ ممکن ہے کہ اسے حویلی میں آنے کی دعوت ملی ہو لیکن یہ بات قطعی قرین قیاس نہیں کہ رانی جھانسی نے اس حویلی میں فلیش مین کے ساتھ رات گزاری تھی۔ انگریز مورخین نے اس بات کو سنجیدگی سے مدنظر رکھا کہ اس موقع پر فلیش مین قطعی طور پر اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ وہ نقاب میں پوشیدہ تھا۔ فلیش مین نے اس رات کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کی روشنی میں یہ امکان زیادہ ہے کہ رات کو اس سے حویلی میں ملنے والی رانی جھانسی نہیں بلکہ کوئی پیشہ ور رقاصہ یا اس کی کوئی مصاحب عورت تھی۔

بدقسمتی سے یہ درست ہے کہ رانی لکشمی بائی نے 1857ء کی جنگ آزادی یا بغاوت میں ایک مرکزی کردار ادا کیا لیکن اس بات کی کوئی شہادت کسی تاریخ میں موجود نہیں کہ اس کی نجی زندگی یا حسن سلوک قابل احترام نہ تھا۔

اس بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رانی نے سیاسی مفادات کے لیے اپنی نسوانی قوت (یا کوئی دوسرا ہتھیار) استعمال نہیں کیا۔ اس وقت کے حالات کے پیش نظر یہ ممکن ہے کہ رانی نے فلیش مین کو ایک خطرناک برطانوی ایجنٹ کی حیثیت سے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا ہو کیونکہ ان دنوں وہ اکنتیف جیسے بعض شر پسندوں کے ساتھ مل کر بغاوت کی منصوبہ بندی میں معروف تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اسی کے ایماء پر فلیش مین کو حویلی بلایا گیا ہو اور اس کے بعد پیشہ ور قاتلوں کے ذریعے اس پر حملہ کرا دیا گیا ہو۔ یلدرم خان نے حملے کے بعد جس ٹھگ کو پکڑا تھا اس نے اسی قسم کا اعتراف کیا تھا لیکن تمام تواریخ اور مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ رانی ایک باکردار اور باعصمت عورت تھی۔ فلیش مین پر رانی کے حملے کی کوئی شہادت بھی سوائے اس

کی اپنی یادداشتوں کے کہیں اور نہیں ملتی۔

[6] مکرم خان کا وجود فرضی نہیں بلکہ پشاور میں اس نام کا ایک شخص واقعی موجود تھا۔ بعدازاں وہ پہاڑی قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے پٹھانوں کے ایک گروہ کا سردار بن گیا جس نے انگریز گائیڈز کیولری کے خلاف کئی کامیاب کاروائیاں کیں۔

[7] کرنل فلیش مین نے میرٹھ چھاؤنی کے جن مقامی سپاہیوں کے ناموں کا حوالہ دیا ہے۔ تھرڈ نیٹو کیولری کی تاریخ کے مطابق ان میں سے صرف دو افراد کا وجود تھا جن کے نام پیر علی اور قدرت علی تھے۔ دونوں نائیک تھے لیکن فلیش مین نے پیر علی کو ایک عام سپاہی بتایا ہے۔

[8] انیسویں انفنٹری میں، جس نے فروری میں نئے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کے ذریعے بغاوت کی، کو مارچ کے آخر میں غیر مسلح کیا گیا تھا۔ جو کاغذ منگل نے فلیش مین کو دکھایا وہ اشرف الاکبر، لکھنو کا 28 مارچ کا شمارہ تھا جس میں پورے ہندوستان اور مشرق وسطیٰ میں ایک مقدس جنگ کی پیش گوئی کی گئی تھی۔

[9] سپاہی منگل پانڈے (1857ء) جس کا تعلق 43ویں مقامی انفنٹری رجمنٹ سے تھا، بارک پور میں 29 مارچ کو ہونے والی ایک پریڈ کے دوران (انگریزوں کے بقول) بھنگ کے نشے میں تھا۔ اس نے مذہبی تفرقے بازی کی کوشش کی اور دعویٰ کیا کہ برطانوی ٹروپس، مقامی سپاہیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ پانڈے کو ایک مقامی آفیسر کے ساتھ پھانسی دے دی گئی تھی جس پر الزام تھا کہ اس نے حملے کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور باغیوں کا ساتھ دیا ہے۔

[10] لیفٹیننٹ (بعدازاں لیفٹیننٹ جنرل) کاگ کو اس کی کمپنی کے ایک مقامی آفیسر نے 9 مئی کو بتایا تھا کہ اس کے ماتحت فوجی اپنے ساتھیوں کو رہا کرانے کے لیے جیل پر دھاوا بولیں گے لیکن کارمائیکل اسمتھ اور آرگڈائل ولسن نے اس انتباہ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

[11] میرٹھ کے فسادات میں ہلاک ہونے والا سب سے پہلا شخص ایک انگریز فوجی ہی تھا جسے بھرے بازار میں مشروبات کی ایک دکان کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

[12] یہ حقیقت ہے کہ بغاوت کے بعد بل ہیوٹ اور آرگڈائل ولسن نے برطانوی دستوں کو حرکت دینے میں خاصی سستی کا مظاہرہ کیا۔ باغی، دہلی کی طرف سفر کا آغاز کر چکے تھے اور

وہ ابھی ان کی لائنز تک نہیں پہنچے تھے۔

[13] میرٹھ کے قتل عام میں مجموعی طور پر اکتیس یورپین مارے گئے جن میں ڈاؤسن فیملی، مسز کوٹنی اور ان کے تین بچے بھی شامل تھے۔ ان افراد کی مکمل فہرست ریکارڈ آف دی انٹیلی جنس آف دی نارتھ ویسٹرن پراونسز 1857ء والیم 2 کے انڈیکس میں دی گئی ہے۔ سر جن ڈاؤسن کو اس کے برآمدے میں گولی ماری گئی جب کہ مسز ڈاؤسن کو جلتی ہوئی مشعلیں پھینک کر جلایا گیا۔ ایک حاملہ عورت مسز کیپٹن چیمرز بھی ہلاک ہوئی لیکن ان سب سے بڑھ کر میرٹھ کے قتل عام کے بارے میں جو کہانیاں مشہور ہوئیں ان میں جنسی جرائم کا بہ طور خاص ذکر تھا۔ اس حقیقت کا ذکر یہاں از حد ضروری ہے کہ اس وقت این ڈبلیو انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ کے سربراہ سر ولیم مائر نے، لارڈ کیننگ کے نام اپنے خط (آگرہ، 30 دسمبر 1857ء) میں لکھا تھا کہ میرٹھ میں متعدد برطانویوں نے شہادت دی ہے کہ عصمت دری کا کوئی واقعہ نہیں ہوا اور باغیوں نے صرف قتل عام کیا تھا۔

فلیش مین کے مطابق رائیڈنگ ماسٹر لینگ ڈیل کی بیٹی، میری کو تشدد کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارا گیا حالانکہ اسے اس کی چارپائی پر سوتے ہوئے تلوار گھونپ کر قتل کیا گیا۔ یہ بات خود انگریزوں نے تسلیم کی کہ جذباتی کیفیت کے باعث آغاز میں بغاوت کے بارے میں بہت سی رپورٹیں بڑھا چڑھا کر پیش کی گئیں لیکن بعد ازاں برطانوی مبصرین نے غیر جانبداری سے ان کا جائزہ لیا اور تمام باتیں حذف کر دیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

[14] جھانسی کی بغاوت اور قتل عام اسی طرح ہوا جیسے یلدرم نے بیان کیا۔ چھیاسٹھ برطانویوں (تیس مرد، سولہ عورتیں اور بیس بچے) کا اجتماعی قتل 8 جون 1857ء کو جوکن باغ میں ہوا۔ وہاں قاتلوں اور مقتولوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ یہ پوری بغاوت میں دوسرا سب سے بڑا قتل عام تھا اور بعض معاملات میں سب سے ظالمانہ بھی۔ یلدرم کے الزامات کے باوجود برطانوی مصنفین اور ہندوستانی مصنفین کی لکھی ہوئی کتب میں اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ رانی لکشمی بائی اس قتل عام کی ذمہ دار تھی یا کہ اس معاملے میں کسی حد تک ملوث تھی۔

بعد ازاں اس نے اپنی بے گناہی پر اصرار کیا لیکن اس بارے میں شکوک موجود ہیں کہ ٹاؤن

فورٹ میں ہتھیار ڈالے جانے سے قبل رانی سے ملاقات کی غرض سے جانے والے تین ایلچیوں کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا۔ البتہ اس بات کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ میوری نامی ایک ایلچی کو محل میں قتل کر کے دفن کر دیا گیا تھا۔

جیسا کہ یلدرم خان نے اپنے بیان میں فلیش مین کو بتایا۔

بعض مقامات پر رانی سے منسوب یہ جملہ بھی آیا ہے کہ جب ایلچیوں نے اس سے مدد کی درخواست کی تو رانی نے کہا ''میرا انگریز سوروں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔'' لیکن اس جملے کی صحت کی مشکوک ہے اور کسی تاریخ یا جنگ آزادی سے متعلق اہم ریکارڈ میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ بعض مصنفین کے خیال میں، ممکن ہے رانی اس حد تک بے بس ہو کہ وہ بغاوت یا قتل عام نہ روک سکی ہو لیکن دوسری جانب اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ اس نے ایسا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے برعکس یہ حقیقت ہے کہ رانی لکشمی بائی کو جھانسی کے معاملات پر مکمل کنٹرول حاصل تھا اور وہ اپنی ریاست کے خلاف ہونے والی کسی بھی سازش سے نمٹنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔

انگریزی سرکار کے خلاف بغاوت کرنے والے سپاہی کا نام منگل پانڈے تھا جس کا تعلق بارک پور میں متعین 34 ویں مقامی انفنٹری رجمنٹ سے تھا۔ اس نے 29 مارچ 1857ء کو پریڈ کے دوران اپنے انگریز کپتان پر گولی چلا دی تھی۔ پانڈے کو بعد ازاں پھانسی دے دی گئی لیکن انگریز بعد میں ہر باغی کو پانڈے کے نام سے ہی مخاطب کرتے تھے۔

[15] کانپور میں جو کچھ ہوا فلیش مین نے اس کی بالکل صحیح تصویر کھینچی ہے۔ بعد میں فلیش مین کی باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ محاصرہ اور زخمیوں کے بارے میں چھوٹی چھوٹی تفصیلات وہی تھیں جیسا کہ فلیش مین نے بیان کی تھیں۔ مثال کے طور پر بیلا بلیئر کا مرنا، سول سروس کے جان میک کلپ کی موت جو مرنے سے قبل مسلسل ایک ہفتے تک فائرنگ کرتا رہا تھا۔ بتایا یہ گیا کہ گھرے ہوئے لوگوں نے خوراک کے طور پر گھوڑوں کو ہلاک کر کے استعمال کیا تھا۔ تاریخی اعتبار سے یہ حقائق مستند ہیں۔

[16] عظیم اللہ خان کو 1854ء میں مرہٹہ پیشوا کے متبنیٰ بیٹے نانا صاحب نے لندن بھیجا تا کہ اس کے والد کے انتقال کے بعد منقطع ہو جانے والی پنشن کے سلسلے میں بحالی کی کوشش کرے۔

پٹیشن تو ناکام ہوگئی لیکن عظیم اللہ خان نے اپنی خوبصورتی اور وجاہت کے بل بوتے پر لندن کی اعلیٰ سوسائٹی کی عورتوں میں خاصی شہرت پائی۔

دی ٹائمز کے ڈبلیو ایچ رسل سے اس کی دو ملاقاتیں ہوئی تھیں جن میں سے ایک 1856ء میں قسطنطنیہ کے مصری ہوٹل اور دوسری کریمیا میں ہوئی تھی لیکن وہ کبھی اسے عزیز نہیں رہا۔ ایک معزز آدمی ہونے کے باوجود عظیم اللہ خان نے ایک استاد اور ویٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا۔ نانا صاحب نے کانپور کے حوالے سے بغاوت میں خاص شہرت پائی لیکن تانتیا توپ اس سے کہیں زیادہ مشہور ہوا۔ البتہ فلیش مین نے محض رسمی طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے۔

[17] فلیش مین نے جس وار کونسل کا حوالہ دیا ہے وہ نئی بات ضرور ہے لیکن اس کے حوالے سے جو باتیں منسوب ہیں وہ تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ مثلاً وہیلر لڑنا چاہتا تھا اور اس کے نوجوان افسران نے اس کی حمایت کی جب کہ بوڑھے، عورتوں اور بچوں کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پر تیار تھے۔ اس کے باوجود وہ باغیوں کی پیش کش سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے ہتھیار ڈالنے پر رضامندی ظاہر کردی۔ نانا صاحب کی شرائط مسز جیکب نامی ایک بوڑھی خاتون لے کر برطانوی گیریژن آئی تھی جس کا حوالہ فلیش مین نے بھی دیا ہے۔

[18] موتی گھاٹ کے قتل عام کے بارے میں مختلف تفصیلات منظر عام پر آئی ہیں لیکن بہت سے واقعات فلیش مین کی تصدیق کے بعد مصدقہ قرار پائے۔ مثال کے طور پر ایورٹ کو اس وقت گولی ماری گئی جب وہ ایک پالکی میں سوار گھاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ وائی برٹ کی رائفل چھین لی گئی۔ جب کہ اس کی بیوی کو اسی رجمنٹ کے باغی لے گئے۔ پانچ وفادار سپاہی قتل ہوگئے۔ مور (کانپور کا حقیقی محافظ) پانی میں مارا گیا۔ بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق کشتیوں میں پڑے ہوئے گھاس پھونس کو فائرنگ شروع ہونے سے پہلے ہی آگ لگادی گئی تھی۔

وہیلر کے ایک ملازم اور ایک نرس کا کہنا ہے کہ جنرل کو ساحل پر اس وقت گولی ماری گئی جب وہ اپنے اسٹریچر پر تھا۔ باغیوں نے اس کا سر بھی کاٹ لیا تھا لیکن اغلب امکان یہ ہے کہ اسے کشتیوں میں گولی ماری گئی تھی۔

جو کچھ بھی ہوا لیکن یہ طے ہے کہ غداری ہوئی اور صرف (وائی برٹ کی) ایک کشتی فرار ہوسکی۔

[19] دریا کے راستے فرار کا واقعہ حقیقی ہے۔ لیفٹیننٹ تھامسن کی تفصیلات سے بھی اس کی سچائی کا ثبوت ملتا ہے جن میں آتشیں تیروں، کشتی کے فرار، مندر کے محاصرے، ساحل کو فرار اور مگر مچھوں وغیرہ کا تذکرہ بھی ہے۔ فلیش مین کے علاوہ بچ جانے والوں کی تعداد چار تھی جن میں تھامسن، ڈیلافورڈ، بورسلیون اور مرفی شامل تھے۔ دریجا سنگھ نے ان کی مدد کی تھی۔

[20] کانپور میں عورتوں اور بچوں کا قتل عام، بغاوت کا بدترین سانحہ تھا جس کا جنرل نیل کے ہاتھوں انتقام بھی بدترین تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نانا بذات خود اس سانحہ کا ذمہ دار نہیں تھا لیکن یہ باغیوں کی طرف سے الہٰ آباد سے کانپور آتے ہوئے جنرل نیل کی فوجوں کی وحشیانہ کاروائی کا جواب تھا۔ بعض مورخین نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ جنرل نیل کی فوجوں نے اپنے کانپور کے سفر کے دوران بے گناہ دیہاتیوں پر مظالم ڈھائے تھے لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ قتل عام اس سے پہلے میرٹھ، جھانسی اور دہلی میں ہونے والی کاروائیوں سے یکسر مختلف تھا۔ اس سانحے کی بازگشت دوسری جنگ عظیم میں بھی سنائی دی جب ہاگ مارکیٹ، کلکتہ کے رہنے والوں نے برطانوی ریکروٹوں کے بازوؤں پر روایتی ''کانپور کے کنویں'' کا نشان کندہ کیا تھا۔

فلیش مین نے ٹی ہنری کیواناف کے ساتھ انصاف نہیں کیا کیونکہ مورخین نے اسے وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا ہے۔ بغاوت کے ایک مورخ رائس ہوطز نے اسے لکھنو کا ہیرو لکھا ہے اور جنرل کیمبل تک اس کے رات کے سفر کو حوصلوں کا سفر قرار دیا ہے۔ کیواناف کو اس کارنامے کے اعتراف پر ''وکٹوریہ کراس'' دیا گیا جس کی مکمل تفصیل کیواناف نے اپنی کتاب ''ہاؤ آئی ون دی وی سی'' (میں نے وکٹوریہ کراس کیسے جیتا) میں بیان کی ہے۔

[21] بعض فوجی ماہرین نے جنرل کیمبل پر تنقید کی اور اسے برطانوی نقصان کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ فائرٹسکیو کے خیال میں اس کی پالیسی نے بغاوت کی طوالت میں مدد دی لیکن اس بارے میں فلیش مین نے اپنی کتاب میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

[22] جس پینٹنگ کا فلیش مین نے ذکر کیا ہے وہ ہیولاک اور اوٹرام کی تھی جو لکھنو میں جنرل کیمبل کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اسے ایک فوجی مصور ٹی۔ جے پارکر نے بنایا تھا۔

تصویر میں نظر آنے والا گھڑ سوار ممکن ہے فلیش مین ہو کیونکہ اس سوار کے خدوخال فلیش مین کی اس تصویر سے بہت ملتے ہیں جو یو ایس سول وار کے دوران، صدر لنکن کے ہمراہ بعض یونین اسٹاف آفیسرز کی بنائی گئی تھی اور فلیش مین بھی اس میں موجود تھا۔

[23] فلیش مین کے پرانے دوست، دی ٹائمز کے نمائندے، ولیم ہاؤورڈ سل نے ''مائی ڈائری ان انڈیا'' صفحہ 188 جلد اول، میں اس واقعہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

[24] لوٹ مار کے بارے میں فلیش مین کے بیانات کی رسل نے بھی تائید کی ہے جس نے اپنی ڈائری میں ایک آئرش سپاہی سے ہیروں کی زنجیر لیے جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے بیانات حرف بہ حرف یکساں ہیں اور رسل نے فلیش مین کے اس دعوے کو سچ قرار دیا ہے کہ اس نے چین ساڑھے سات ہزار پونڈ میں فروخت کی۔

فلیش مین کے کاغذات ملنے سے پہلے لیسٹر (بعد ازاں جنرل سر ہیری لیسٹر، وکٹوریہ کراس) جھانسی کی رانی کو زندہ گرفتار کرنے کے منصوبے کا واحد گواہ تھا۔ بغاوت کے بارے میں لکھنے والے کسی مورخ نے اس منصوبے کا ذکر نہیں کیا۔ 1913ء تک اس منصوبے کا کسی کو علم نہیں تھا لیکن پہلی مرتبہ یہ کہانی اس وقت منظر عام پر آئی جب اسی سال ایچ ایچ لیسٹر ڈینی نے جنرل لیسٹر کی یادداشتوں پر مشتمل ''میموریز آف انشوئنٹ ہاؤس (قدیم گھر کی یادیں) نامی کتاب شائع کی۔

لیسٹر کے مطابق جنرل روز نے اس منصوبے سے صرف اسی کو آگاہ کیا تھا اور لیسٹر نے اسے جنرل روز کی موت کے کئی سال بعد تک راز رکھا تھا۔ منصوبہ حرف بہ حرف اسی طرح تھا جیسے فلیش مین نے بیان کیا ہے کہ رانی کو جھانسی کے ایک گیٹ سے اس وقت فرار ہونا تھا جب برطانوی فوجیں جان بوجھ کر اپنی پوزیشنوں سے واپس چلی جاتیں۔

[25] جنگ بیتوا (یکم اپریل 1858ء) ایک بھولی بسری یاد ہے لیکن یہ جنرل روز کی ذہانت کی ایک دلیل بہر حال ہے۔ دشمن غیر متوقع طور پر اس کے عقب میں آ پہنچا لیکن وہ جھانسی سے پلٹ کر اس پر حملہ آور ہوا اور نئی باغی فوج کے دانت کھٹے کر دیئے جس کی تعداد اس کے ایک فوجی کے مقابلے میں دس تھی (فورٹس کیو۔ ہسٹری آف دی برٹش آرمی) والیم 13)

[26] یہ واقعہ جھانسی سے بیس میل دور رانی کے فرار کے دوران پیش آیا جب لیفٹیننٹ ڈاؤکر کی

سربراہی میں برطانوی کیولری کی ایک پارٹی نے اس پر حملہ کر دیا۔ بعض مشہور روایتوں (اور اب فلیش مین) کے مطابق جس باغی سوار نے لیفٹیننٹ ڈاؤکر کو زخمی کیا۔ وہ رانی خود تھی۔ یہاں ایک مقام پر فلیش مین سے غلطی ہوئی ہے۔ اس کے مطابق رانی، آرکا گیٹ کے ذریعے جھانسی سے فرار ہوئی جب کہ دیگر ذرائع کا کہنا ہے کہ رانی نے فرار کے لیے بندھاری گیٹ استعمال کیا اور دامودھر خود اسی کے گھوڑے پر سوار تھا۔

[27] آٹھویں حصار کے جس دستے نے 17 جون 1858ء کو ایک حملے کے دوران جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو ہلاک کیا، کیپٹن کلیمنٹ ہینگ بھی اس میں شامل تھا لیکن فلیش مین نے کہیں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ شاید وہ رانی سے اپنی جذباتی وابستگی کی بنا پر اس جانب دھیان نہیں دے سکا۔ (یہاں اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ فلیش مین کے مطابق رانی 17 جون کو ماری گئی لیکن دیگر مستند تواریخ کے مطابق رانی کی موت 18 جون 1858ء کو واقع ہوئی)۔

[28] رانی لکشمی بائی کی ہلاکت کے بارے میں مختلف کہانیاں مشہور ہیں لیکن فلیش مین کا بیان سب سے مصدقہ ہے۔ وہ گوالیار کے قریب کوٹا، کی سرائے میں اس وقت ماری گئی تھی جب آٹھویں حصار کے ایک دستے نے پھول باغ میں باغیوں کے کیمپ پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ آدمیوں کے جھمگٹے سے اس طرح نکلی تھی کہ گھوڑے کی راسیں اس کے دانتوں میں دبی ہوئی تھیں، پیٹ میں زخم آیا تھا جو یقینی طور پر کاربائن کی گولی لگنے سے ہوا تھا۔ وہ اپنی کاٹھی پر جھول رہی تھی کہ ایک فوجی نے تلوار کا وار کر کے اس کاٹ کر رکھ دیا۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت وہ راجہ سندھیا کا دیا ہوا ایک بیش قیمت نیکلس پہنے ہوئے تھی جسے مرنے سے پہلے اس نے اپنے ایک خدمت گار کو دے دیا تھا۔

بعد ازاں میدان جنگ میں نصب اس کے خیمے سے ایک قد آدم آئینہ، کتابیں اور اس کا جھولا برآمد ہوا تھا۔

مانی کارنیک سے لکشمی بائی تک

یہ 1842 کے موسم سرما کا ایک خوش گوار دن تھا۔

اور جھانسی پر جیسے خوشیوں کی برسات ہو رہی تھی کیونکہ آج یہاں ایک ایسا واقعہ رونما ہونے جا رہا تھا جس کا جھانسی کے مکینوں کو سالوں سے انتظار تھا۔ ان کے ہر دل عزیز لیکن بے اولاد راجہ کی سونی زندگی میں ایک بار پھر بہار کے پھول کھلنے والے تھے۔ راجہ کی پہلی بیوی کا دیہانت ہو چکا تھا جس کے بعد سے وہ دہرے غم میں مبتلا تھا۔ ایک لاولد ہونے کا دکھ اور دوسرے جیون ساتھی کے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کا رنج۔ اسی لیے جھانسی کا ہر مکین اپنی استطاعت سے بڑھ کر اپنے راجہ کی خوشیوں میں شریک تھا۔ وہ جانتے تھے کہ راجہ اپنے درباریوں، امراء اور دوستوں کے بے اصرار پر دوسری شادی کرنے کے لیے رضامند ہوا تھا ورنہ وہ اس قسم کے مشوروں کو ہمیشہ ٹال جایا کرتا تھا۔

''میں شادی کر چکا ہوں، دوستو!'' وہ نہایت خوش گوار موڈ اور دوستانہ ماحول میں اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتا۔ ''اب تو جھانسی، میری پتنی اور اس کے مکین میری اولاد ہیں۔''

''یہ تو درست ہے، راجہ جی!'' بولنے میں پہل ہمیشہ ریاست کا دیوان رام چندر راؤ دیش مکھ ہی کرتا۔ ''لیکن ہمیں ایک ننھے راجہ کی ضرورت ہے جسے ہم اس گدی پر بٹھا کر اس کی اسی طرح خدمت کر سکیں جیسے آپ کرتے ہیں۔''

راجہ کی آنکھیں نم ہو جاتیں تو پورے دربار پر افسردگی طاری ہو جاتی۔ رام چندر راؤ کو بھی احساس ہو جاتا کہ اس نے راجہ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا، راجہ جی!'' وہ فوراً ہاتھ باندھ دیتا ''بھگوان آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے..... ہم وہ دن کبھی نہ دیکھیں جب اس راج سنگھاسن پر کوئی دوسرا

آپ کی جگہ بیٹھے.....''

''لیکن اسی کا نام تو زندگی ہے، رام چندر جی!'' راجہ کی آنکھوں کی نمی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی۔'' کوئی سدا اس دنیا میں زندہ تھوڑی رہتا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو ہر کسی کے شریر کو اگنی نے چاٹنا ہے۔''

''بھگوان کی سوگند.....'' موتی بائی نے بولنے کی کوشش کی لیکن راجہ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

''ہم اپنا انجام جانتے ہیں، بالک۔'' راجہ کی آواز تھرتھرا گئی۔'' ہمیں اپنی فکر نہیں بس یہی سوچتے ہیں کہ ہمارے بعد جھانسی کا کیا ہوگا؟''

اور درباریوں کو گویا بات چھیڑنے کا ایک نیا موضوع ہاتھ آ جاتا۔

''اسی لیے تو ہم چاہتے ہیں کہ ایسی گھڑی آنے سے پہلے ہی راج محل کے در و دیوار کسی ننھے منے راجکمار کی قلقاریوں سے گونجنے لگیں.....''

راجہ ایسے موقعوں پر اپنے آنسو چھپانے کے لیے منہ موڑ لیتا یا بہانے سے سر جھکا کر اپنی آنکھیں خشک کرنے میں مصروف ہو جاتا لیکن امراء اس جذباتی مرحلے کے بعد ہمیشہ گفتگو کا رخ بدل دیتے اور ایسے موضوعات پر بات شروع کر دیتے کہ ذرا دیر پہلے کی افسردگی لمحوں میں ہوا ہو جاتی۔

لیکن ان کے لیے یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر کسی بھی وقت بات چیت ہو سکتی تھی۔ یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ جب کئی بار زیر بحث آیا تو بالآخر راجہ نے ایک روز اپنے درباریوں کے مطالبے پر سر خم کر ہی دیا۔

''مگر میری ایک شرط ہے، دوستو!'' راجہ نے اپنے امراء کو مخاطب کیا۔

''ہمیں بغیر سنے ہی آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ راجہ جی۔'' دیوان جواہر سنگھ نے اپنے تئیں بھرپور وفاداری کا اظہار کیا۔

''نہیں دیوان جی!'' راجہ مسکرایا۔'' بڑے بوڑھوں نے کہا ہے کہ بن سنے شرائط تسلیم کرنے والے احمق ہوتے ہیں۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ہمیں احمق درباریوں کا راجہ کہے۔''

دیوان جواہر سنگھ محض کھسیانی ہنسی کے سوا کسی ردعمل کا اظہار نہ کر سکا۔

ہماری شرط یہ ہے کہ دوستو!''راجہ دوبارہ گویا ہوا۔''دلہن تلاش کرنے کی ذمہ داری رام چندر راؤ دیش مکھ کی ہوگی لیکن شادی کی تمام تر تیاریوں اور دلہن کے انتخاب تک ہر معاملہ صیغۂ راز میں رکھا جائے گا۔اگر تم لوگ اس پر تیار ہو تو ہم بھی تمہاری بات مانے لیتے ہیں۔''

درباریوں نے بیک زبان ہامی بھر لی اور اسی روز سے راجہ کی دوسری شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔رام چندر راؤ دیش مکھ، دلہن کی تلاش میں جت گئے جب کہ باقی امراء نے دوسرے کام اپنے ذمہ لے لیے۔

اور بالآخر آج وہ دن آپہنچا تھا جب راجہ اپنے بڑھاپے میں دوسری بار دلہا بننے جا رہا تھا۔ جھانسی کے عوام بھی اپنے لیے راجکمار کی خواہش رکھتے تھے اس لیے وہ راجہ کی خوشی میں خوش تھے۔ اور یوں بھی اس نے انہیں نئے سر سے جینے کا ڈھنگ سکھایا تھا اور آج وہ اس کی دی ہوئی خوشیاں اسی کو لوٹا رہے تھے۔

جھانسی، بنیادی طور پر مرہٹہ بادشاہت کا حصہ تھا۔روایات کے مطابق قدیم زمانوں میں جھانسی (1) شیدی راشٹر، جے جک بھوکیت، جج ہوتی اور بندھیل کھنڈ کا حصہ بھی رہا تھا۔کہا جاتا ہے کہ یہ شہر چاندیلا (بعض مورخین کے مطابق کاندھلہ، یا کنڈیلا) بادشاہوں کا ایک مضبوط گڑھ تھا۔ اسے تب بلونت نگر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔بلونت نگر کئی صدیوں تک علاقے کے ایک اہم معاشی اور تجارتی مرکز کی حیثیت سے عروج کا سفر طے کرتا رہا۔اسی دور میں اسے جھانسی کا نام دیا گیا لیکن شاید یہ نیا نام اسے راس نہ آیا اور گیارہویں صدی عیسوی میں اس کی حیثیت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔

چھ صدیوں تک جھانسی ایک غیر اہم سا شہر رہا لیکن سترہویں صدی عیسوی میں راجہ بیر سنگھ دیو آف اورچھا، جب یہاں کا مالک و مختار ہوا تو جھانسی ایک بار پھر عظمت و شہرت کے سفر پر گامزن ہو گیا۔یہ مغل شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کا زمانہ تھا۔دونوں کے مراسم نہایت قریبی اور تعلقات دوستانہ تھے یہی وجہ تھی کہ پورے ہندوستان میں مغل بادشاہت ہونے کے باوجود مرہٹوں اور جھانسی کو آزاد اور خودمختار حیثیت حاصل رہی۔

1613ء میں راجہ بیر سنگھ دیو نے جھانسی کا قلعہ تعمیر کیا اور شہر کو جدید انداز میں بسایا۔اس کے دور میں ریاست نے بے حد ترقی کی اور اس کے وسائل میں بے پناہ اضافہ ہوا لیکن 1627ء میں

راجہ بیر سنگھ دیو کا دیہانت ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا جوہر سنگھ جھانسی کا نیا راجہ بنا۔

راجہ بیر سنگھ دیو کے بعد مرہٹہ بادشاہت (2) نے بھی عروج حاصل کرنا شروع کیا اور انہوں نے جہانگیر کے بعد برسر اقتدار آنے والے کسی مغل بادشاہ کی بالادستی کو دل سے قبول نہ کیا۔ اس لیے مرہٹوں اور مغلوں کے مابین جنگ وجدل کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مہاراجہ چھترسل بندیلہ آف پونا، مرہٹہ بادشاہت کا تاجدار بنا۔ مرہٹوں کا دارالحکومت اس زمانے میں پونا میں ہی تھا۔ مہاراجہ چھترسل ایک اچھا منتظم اور بہادر جنگ جو تھا۔ پہلے تو مغلوں نے مہاراجہ چھترسل کو گفت وشنید کے ذریعے باج گزار اور اپنا اتحادی بنانے کی کوشش کی لیکن ناکامی پر مغل تاجدار اورنگ زیب عالمگیر کے ایک جانشین بہادر شاہ کے ایک سالار محمد خان بنگش نے 1729ء میں اس پر حملہ کر دیا۔

مہاراجہ نے مرہٹوں کے پیشوا باجی راؤ اول (3) سے مدد طلب کی اور دونوں نے مشترکہ طور پر مغل فوجوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ مہاراجہ چھترسل نے فتح کی خوشی میں نذرانے کے طور پر اپنی سلطنت کا ایک حصہ باجی راؤ اول کے حوالے کر دیا جس میں جھانسی کا علاقہ بھی شامل تھا باجی راؤ گو مرہٹوں کا پیشوا تھا لیکن مہاراجہ چھترسل کی بیٹی مستانی اس کی غیر قانونی بیوی بھی تھی اس لیے باجی راؤ کی حیثیت، مہاراجہ کے داماد کی تھی۔

اس لیے مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ مہاراجہ نے سلطنت کا حصہ باجی راؤ کو پیشوا کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی بیٹی کے ناجائز شوہر کی حیثیت سے تحفے میں دیا تھا۔ بہر طور اصل صورت حال کچھ بھی رہی ہو، تاریخی امر یہ ہے کہ جھانسی، 1929ء میں مرہٹوں کے ہاتھوں مغلوں کی شکست کے بعد مرہٹہ مہاراجہ کی عمل داری سے نکل کر براہ راست مرہٹہ پیشواؤں کی جاگیر قرار پایا۔

باجی راؤ نے 1742ء میں اپنی نیابت کے لیے نارو شنکر کو منتخب کیا اور اسے اپنا صوبے دار بنا کر جھانسی بھیجا۔ اپنے پندرہ سالہ دور حکومت میں اس نے نہ صرف فوجی اہمیت کے حامل جھانسی قلعہ میں توسیع کی بلکہ کئی دوسری عمارات بھی تعمیر کیں۔ اس نے قلعے کے توسیع شدہ حصے کو ''شنکر گڑھ'' کا نیا نام دیا۔

1757ء میں پیشوا نے نارو شنکر کو واپس بلا لیا اور وقفے وقفے سے مہادیو گووند کا کیرے اور بابو لعل کنہائی کو جھانسی کا صوبے دار مقرر کیا۔

1766ء میں وشوار اؤ لکشمن کو جھانسی کا صوبے دار بنایا گیا۔ وہ تین سال اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کے بعد رگھوناتھ راؤ (دوم) نیوالکر، جھانسی کا صوبے دار مقرر ہوا۔ وہ نہایت قابل صوبے دار تھا۔ اس نے ریاست کی آمدنی میں قابل قدر اضافہ کیا اور مہالکشمی مندر اور رگھوناتھ مندر تعمیر کرائے جب کہ اپنی رہائش کے لیے اس نے شہر میں ''رانی محل'' کے نام سے ایک خوبصورت عمارت بھی بنوائی۔ البتہ 1796ء میں رگوناتھ راؤ، نئے صوبے دار شوراؤ ہری (جو اس کا بھائی بھی تھا) کے حق میں دست بردار ہو گیا۔

1803ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی (4) اور مرہٹوں کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت مہاراجہ بڑودہ کو مرہٹہ بادشاہت سے علیحدگی اختیار کر کے برطانوی بالادستی قبول کرنا پڑی۔ یہ معاہدہ مرہٹہ قوت پر ایک کاری ضرب تھا لیکن پے در پے شکستوں نے مرہٹوں کے اتحاد کو پہلے ہی پارہ پارہ کر دیا تھا اس لیے انہیں اس معاہدے کو ماننے کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔

شوراؤ ہری کے انتقال کے بعد پیشوا نے رام چندر راؤ کو جھانسی کا صوبے دار بنایا لیکن وہ ایک اچھا منتظم نہ تھا۔ 1835ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور رگوناتھ سوم اس کا جانشین بنا۔ وہ صرف تین سال زندہ رہا اور 1841ء میں گنگا دھر راؤ جھانسی کا صوبے دار بنا۔

انگریزوں نے رام چندر راؤ کی بدانتظامی اور رگھوناتھ سوم کی موت کا بہانہ بنا کر پیشوا کو مجبور کر دیا کہ وہ جھانسی کی جاگیر سے دستبردار ہو جائے چنانچہ پیشوا کی جانب سے دستبرداری کے اعلان کے بعد انگریزوں نے جھانسی کو انگریز محکوم ریاست کا درجہ دے کر گنگا دھر راؤ کو اس کا راجہ تسلیم کر لیا۔

انہوں نے گنگا دھر راؤ سے بھی ایک معاہدہ (5) کیا اور جھانسی کے نواح میں ایک فوجی چھاؤنی قائم کی جس کے تمام اخراجات راجہ ریاستی خزانے سے پورا کرنے کا پابند تھا۔

رگھوناتھ سوم کی بدانتظامیوں کی وجہ سے جھانسی کی مالی حیثیت بے حد کمزور ہو گئی تھی لیکن راجہ گنگا دھر ایک اچھا منتظم ثابت ہوا۔ وہ نہایت غریب پرور اور نرم مزاج شخص تھا۔ اس نے بہترین انداز میں جھانسی کا انتظام و انصرام سنبھالا جس کی وجہ سے جھانسی کی مقامی آبادی اس سے بے حد مطمئن اور مسرور تھی۔

اپنے اس اطمینان اور مسرت کا اظہار انہوں نے شہر کی گلیوں، بازاروں اور شاہراہوں کو خوبصورتی کے ساتھ دلہن کی طرح سجا کر کیا تھا۔ جا بہ جا ہولی کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ مردوں

اور عورتوں کا شوق اور جوش وخروش دیدنی تھا۔ کہیں لوگوں کی ٹولیاں ڈھول بجا رہی تھیں اور کہیں مراٹھی زبان میں خوشی کے گیت گائے جا رہے تھے۔

دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں تھے۔ روایتی گھاگھرا چولی میں ملبوس نوجوان لڑکیاں رقص کر رہی تھیں تو عورتیں تالیوں، قہقہوں اور گیتوں کی صورت میں ان کی ہمت بڑھا رہی تھیں۔

بڑی بوڑھیوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تھال اور برتن تھے۔ کسی میں مٹھائی تھی تو کسی میں شکر۔ کچھ خواتین نے کچے چاولوں سے بھرے تھیلے اٹھا رکھے تھے۔ چاولوں کا پھینکنا ان کے نزدیک آباد وشاد رہنے کی ایک پرارتھنا تھی۔ اس لیے وہ جس راستے سے گزر رہی تھیں وہاں چاول بکھیرتی جا رہی تھیں۔

ایک دوسرے کو مٹھائی کھلائی جا رہی تھی، شکر بانٹی جا رہی تھی اور مبارک بادیں دی جا رہی تھیں جب کہ نیک شگون کے طور پر جگہ جگہ ناریل توڑے جا رہے تھے۔

قلقاریاں مارتے اور قہقہے بکھیرتے ان تمام قافلوں کا رخ شہر کے وسط میں بنے ہوئے گنیش مہاراج (6) کے استھان یعنی گنیش مندر کی طرف تھا۔

آج اسی گنیش مندر میں جھانسی کے راجہ گنگا دھر راؤ کی شادی ہو رہی تھی۔

جوتشیوں نے شادی کے لیے شبھ گھڑی دوپہر کی مقرر کی تھی لیکن جھانسی صبح سے ہی مندر کی چاروں جانب امڈ آیا تھا۔

جھانسی کی فوج کے چاق وچوبند سپاہی وہاں موجود تھے لیکن ان میں سے کوئی کسی سے تعرض نہ کر رہا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان ہزاروں لوگوں کی موجودگی کے باوجود بھی راجہ یا اس کے مہمانوں کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ راجہ اپنی پرجا سے پیار کرتا تھا اور رعایا اپنے راجہ پر جان چھڑکتی تھی۔

لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ نہ جانتا تھا کہ راجہ کی ہونے والی دلہن کون ہے۔

صرف راجہ کے چند خاص درباریوں اور مشیروں کو اس کی خبر تھی، لیکن انہوں نے بھی وقت سے پہلے اسے عام کرنے سے گریز کیا تھا۔

دوپہر سے ذرا پہلے اہم شخصیات کی آمد شروع ہو گئی۔ ریاست کے امراء، جاگیردار، سیاست

دان، تحائف سے لدے پھندے آرہے تھے۔ مہمانوں کے خیر مقدم اور انہیں ان کی مخصوص نشستوں تک پہنچانے کی ذمہ داری رام چندر راؤ دیش مکھ کی تھی اور وہ اپنا کام نہایت خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے انجام دے رہا تھا۔

مہمانوں کے لیے مندر کے سامنے ایک بہت بڑا اور نفیس شامیانہ نصب کیا گیا تھا۔ ہمسایہ ریاستوں کے راجاؤں کے علاوہ مرہٹوں کے پیشوا باجی صاحب راؤ دوم (7) ان کے صاحبزادے نانا صاحب (8) اور مہاراجہ ستارا بھی تقریب میں مدعو تھے۔ ان کا قیام دوسرے راجاؤں کے ہمراہ قلعے کے شاہی مہمان خانے میں تھا لیکن تمام راجہ علیحدہ علیحدہ جلوسوں کی صورت میں مندر پہنچ رہے تھے۔ ان کے ہمراہ جھانسی کے راجہ اور اس کی ہونے والی رانی کے لیے لونڈی غلاموں سے لے کر زر و جواہر تک کے نہایت قیمتی اور بے پناہ تحائف بھی تھے جو علیحدہ گھوڑوں اور چھکڑوں پر رکھے ہوئے تھے۔

تقریب کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ مختلف رنگ کے باسیوں کے باوجود سب مہمانوں کی پگڑیوں کا رنگ گلابی تھا۔

گیارہ بجے تک تمام اہم مہمان آچکے تھے۔ پھر باجی راؤ دوم، نانا صاحب اور مہاراجہ ستارا تحائف کے انبار کے ہمراہ علیحدہ علیحدہ بگھیوں میں مندر پہنچے۔ رام چندر راؤ دیش مکھ نے بڑھ کر تینوں کے چرن چھوئے اور انہیں شامیانے میں بٹھانے کے بجائے براہ راست مندر کے اندر لے گیا جہاں شادی کا خوبصورت منڈپ پہلے سے ہی سجایا جا چکا تھا اور درجنوں پجاری مسلسل منتر پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے آگ کا الاؤ روشن تھا جس میں وقفے وقفے سے عود اور لوبان کا چھڑکاؤ کیا جا رہا تھا۔

دلہن کی پالکی سویرے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ اپنے والد کے ہمراہ ایک روز پہلے بیتور سے جھانسی پہنچ گئی تھی۔ اس کی آمد کو خفیہ رکھا گیا تھا جب کہ قیام کے لیے بھی رانی محل کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس وقت مندر سے ملحقہ ایک کمرے میں اس کا بناؤ سنگھار کیا جا رہا تھا۔ دلہن کے لیے عروسی جوڑے کے ہمراہ ڈھیروں طلائی گہنے، کنگن، پنجا نگلہ، کئی انگوٹھیاں، ٹیکہ، جھومر، پازیب، بندیا، ٹیکا، کمر بند، جھمکے، گلوبند، الغرض ہر قسم کا زیور مختلف مخملیں ڈبوں میں بند وہاں پہنچایا جا چکا تھا۔

جھانسی کی شاہی مشاطائیں دلہن کو آنے والی گھڑی کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ عرق گلاب سے

ملے پانی سے دلہن کو غسل دیا گیا، ابٹن ملا گیا، ہاتھوں اور پیروں میں مہندی رچائی گئی اور پھر اس کے بدن کو ہندوستان کے مختلف حصوں سے منگوائی ہوئی خوشبویات اور عطر سے مہکایا گیا۔

پھر جب خوشبوؤں سے نہائی اور عطریات سے مہکی دلہن کو عروسی جوڑا اور بھاری زیورات پہنائے گئے تو اس کا ننھا منا اور نازک وجود ان کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔

اچانک ہی ''باادب، باملاحظہ'' کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

جھانسی کا راجہ گنگادھر راؤ، سنہرے لباس پر گلابی پگڑی باندھے ہوئے مندر کے اندر داخل ہوا۔ پڑوسی ریاستوں کے راجہ اور اس کے قابل اعتماد ساتھی اس کے ہمراہ تھے۔ باجی راؤ، نانا صاحب اور مہاراجہ ستارا نے اپنی نشستوں سے اٹھ کر راجہ کا استقبال کیا۔ انہوں نے اسے گلے لگا کر مبارک باد دی جب کہ رام چندر دیش مکھ راؤ نے راجہ کو اس مخصوص چوکی پر لے جا کر بٹھایا جس کے دائیں جانب دلہن کی چوکی ابھی خالی تھی۔

پجاریوں کے منتروں میں تیزی آ گئی۔ دلہا اور دلہن کی کنڈلیاں پہلے ہی نکالی جا چکی تھیں اور اب صرف اس شبھ گھڑی کا انتظار ہو رہا تھا جب جھانسی کے راجہ اور اس کی رانی کو اگنی کے پھیرے لے کر شادی کی رسم پوری کرنی تھی۔

منتروں کا جاپ کچھ دیر اور جاری رہا اور پھر مہا پجاری نے دلہن کو بلانے کا آدیش دے دیا یعنی بالآخر وہ شبھ گھڑی آن پہنچی تھی جس کا انتظار تھا۔

راج محل کی خاص خادماؤں کے جھرمٹ میں دلہن اس کمرے سے برآمد ہوئی جہاں اسے تیار کیا جا رہا تھا۔ دلہن نے سرخ رنگ کا عروسی جوڑا پہن رکھا تھا۔ سر پر بھاری آنچل تھا جس پر طلائی کام کیا گیا تھا۔ آنچل کو گھونگھٹ کے انداز میں اس قدر جھکایا گیا تھا کہ دلہن کا چہرہ اور سینہ تک چھپ گیا تھا۔

یہ کاشی (بیتور) کی رہنے والی مانی کارنیک تھی جس کا باپ مور پنتھ نامی ایک کٹر برہمن اور مرہٹہ پیشوا کی کونسل کا رکن تھا۔

دلہن آہستہ روی سے چلتی ہوئی اس چوکی تک پہنچی جو پہلے سے ہی اس کے لیے خالی رکھی گئی تھی۔ یہاں بھی خادماؤں نے ہی اسے بیٹھنے میں مدد دی۔

پجاری نے کچھ منتر اور پڑھے جب کہ آگ کے الاؤ میں تھوڑا سا عود و لوبان ڈالا۔

''دلہن کی مانگ میں سیندور بھرا جائے اور منگل سوتر پہنایا جائے۔'' پجاری کی آواز ابھری خادماؤں نے تعمیل حکم میں گھونگھٹ فوراً الٹ دیا۔

یہ کیا.....؟ تقریب میں موجود ہر شخص دنگ رہ گیا۔ وہ تھی تو بہت خوبصورت، عام مرہٹہ عورتوں کی نسبت کہیں زیادہ گوری چٹی، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، جس پر بڑا سا ٹیکا جھول رہا تھا، ہرنی کی طرح موٹی اور بادامی آنکھیں، صراحی دار گردن.....لیکن وہ کوئی عورت یا لڑکی نہیں بلکہ بچی تھی جو اس وقت سات سال کی بھی نہیں ہوئی تھی۔

مانی کارنیک 19 نومبر 1835ء کو کاشی (موجودہ ورناسی یا بنارس) میں پیدا ہوئی تھی اور شادی کے وقت اس کی عمر صرف چھ سال دس ماہ تھی۔

راجہ گنگا دھر نے پجاری کے کہنے کے مطابق مانی کی مانگ میں سیندور بھرا اور منگل سوتر پہنا دیا۔

''اب دلہا، دلہن، پھیروں کے لیے کھڑے ہو جائیں۔'' پجاری نے دوبارہ حکم صادر کیا۔

مانی تو اتنی کم سن تھی کہ اسے شادی کی رسموں تک کا پتا نہ تھا۔ خادماؤں نے ہی اسے چوکی سے کھڑا کیا جب کہ خود مانی، شرمانے کے بجائے کسی وحشی ہرنی کی طرح آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ اپنے والد کو دیکھتی جو اس کے دلہا کے عین عقب میں بیٹھا ہوا تھا اور کبھی وہ اپنے دلہا کو گھورنے لگتی جو عمر میں اس کے باپ سے بھی بڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

بہر طور مور پنتھ نے دلہا کے کندھے پر رکھی چادر اور دلہن کے آنچل کا پلو آپس میں باندھا اور پھیرے شروع ہو گئے جب کہ مہا پجاری نے منتروں کا جاپ زیادہ تیزی کے ساتھ کرنا شروع کر دیا۔

پہلے چار پھیروں میں دلہن آگے تھی جب کہ باقی تین پھیروں میں دلہا آگے تھا۔

پھیرے ختم ہونے کے ساتھ ہی پچپن سالہ راجہ گنگا دھر راؤ اور سات سالہ مانی کارنیک، میاں بیوی کے بندھن میں بندھ گئے۔

راجہ نے اپنی پتنی کو اشارہ کیا اور دونوں نے آگے بڑھ کر مور پنتھ کے چرن چھوئے اور آشیر واد لی۔ اس کے ساتھ ہی شادی کی رسم اپنے اختتام کو پہنچی اور مندر میں موجود مہمانوں نے بڑھ

بڑھ کر راجہ کو مبارک بادیں دینی شروع کر دیں۔

''رانی کی سواری کا انتظام کریں، رام چندر جی!'' راجہ گنگا دھر نے اپنے دیوان خاص کو حکم دیا۔ ''ہم کچھ دیر مہمانوں کے ساتھ یہیں قیام کریں گے۔''

''جو حکم راجہ جی!'' رام چندر راؤ دیش مکھ نے سر خم کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اور ہاں!'' راجہ کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ ''ہم اپنی دلہن کو رانی لکشمی بائی کا نیا نام اور خطاب دیتے ہیں۔''

مندر میں مبارک، سلامت کا شور برپا ہو گیا۔ رام چندر سواری کا انتظام کرنے کے لیے مندر سے باہر چلا گیا جب کہ راجہ اور رانی کو مہمانوں نے گھیر لیا۔

راجہ تو ہنس ہنس کر اپنے دوستوں سے باتیں کرنے لگا لیکن کم سن رانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس سے کیا کہے اور کیا پوچھے۔ خادماؤں نے اس کی مشکل آسان کر دی اور اسے اپنے جھرمٹ میں لے کر مندر کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

سامنے ہی ایک ہاتھی بیٹھا تھا جس کے سنہرے ہودج کو چاروں طرف سے سبز کپڑے کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا جب کہ اسے نہایت خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ لکڑی کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی سیڑھی ساتھ رکھی گئی تھی تا کہ رانی اس کے ذریعے ہودج تک پہنچ سکے۔

ایک خادمہ، رانی کے ساتھ ہودج میں بیٹھی جب کہ دوسری منتشر ہو گئیں۔

''راجہ صاحب نے اپنی رانی کی سواری کے لیے پورے سو ہاتھیوں کا انتظام کیا ہے۔'' رانی کے ساتھ بیٹھی سندھیا نامی خادمہ نے اسے بتایا۔

''سو ہاتھی؟'' لکشمی بائی کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''مگر ہم تو صرف ایک ہاتھی پر بیٹھے ہیں۔ باقی، کس لیے.....؟

سندھیا کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''آپ بھی بڑی بھولی ہیں، رانی جی!'' اس کا انداز قدرے معنی خیز تھا۔ ''ابھی آپ چھوٹی ہیں ناں..... آہستہ آہستہ سب سمجھ جائیں گی۔''

''یہ ہمارے سوال کا جواب تو نہیں؟'' رانی نے اسے گھورا تو سندھیا سنجیدہ ہو گئی۔

''یہ جلوس قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے پورے جھانسی شہر کا گشت کرے گا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اپنی رانی کے استقبال کے لیے سڑک پر جمع ہیں۔ وہ اپنی نئی

مالکہ کو دیکھنا چاہتے ہیں.....''

''لیکن ہم تو پردے میں ہیں۔'' رانی نے معصوم سے لہجے میں کہا۔

''ان کے لیے آپ کے ہاتھی کو دیکھ لینا ہی آپ کا دیدار ہے۔'' سندھیا نے جواب دیا۔

''اوہ!'' کم سن رانی نے ہونٹ سکیڑے۔ ''لیکن وہ سو ہاتھی.....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''باقی ننانوے ہاتھیوں پر آپ کا جہیز، ذاتی ضرورت کا ساز و سامان اور خاص کنیزیں اور خادم سوار ہیں۔'' سندھیا نے جواب دیا۔

رانی نے ایک طویل سانس لی اور خاموش ہو گئی۔ وہ دور خلاؤں میں گھورنے لگی۔ بھگوان نے اسے ایک ہی دن میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

بے اختیار اسے اپنا بچپن یاد آ گیا اور ساتھ ہی اس کی غزالی آنکھیں نم ہو گئیں۔

◈◈◈

مانی کارنیک کا باپ مور پنتھ، پیشوا کونسل کا رکن ضرور تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ایک غریب شخص تھا۔ یہ اس کٹر برہمن کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بھاگ رتی بائی جیسی خوبصورت، سلجھی ہوئی ذہین اور سمجھ دار بیوی ملی تھی۔ ورنہ وہ جانے کی کا بکھر گیا ہوتا۔

مور پنتھ اکثر بھاگ رتی کے سامنے اپنی غربت کا رونا روتا لیکن وہ اسے سمجھاتی کہ اگر بھگوان سب کو امیر پیدا کر دیتا تو پھر اسے یاد کون کرتا کیونکہ اسے یقین تھا کہ بھگوان صرف غریبوں کے دل میں بستا ہے اور وہی اسے یاد کرتے ہیں۔ وہ مور پنتھ سے یہ بھی کہا کرتی تھی کہ بھگوان کی دیا ہے کہ ان کا تعلق برہمن خانوادے سے ہے۔ اگر وہ انہیں کسی کم ذات گھرانے میں پیدا کر دیتا تو وہ بھلا کیا کر سکتے تھے۔ یوں بھاگ رتی کے لیے سب سے بڑی دولت ان کا برہمن ہونا ہی تھا۔

بھاگ رتی نے لگ بھگ بیس سال مور پنتھ کا ساتھ دیا۔ 2 کارتک (بہ مطابق 19 نومبر 1835ء) کو ان کے ہاں ایک بیٹی نے جنم لیا جس کا نام مانی کارنیک رکھا گیا۔ خوبصورتی میں وہ اپنی ماں سے کئی گنا آگے تھی۔ اس کی پیشانی بے حد چوڑی اور بادامی آنکھیں ہرنیوں کی طرح بڑی بڑی تھیں۔ وہ ایک غریب گھرانے کی معمولی سی بچی تھی لیکن اس کے چہرے پر ایک عجیب سا شاہانہ

انداز تھا۔

مور پنتھ اکثر اپنی بیٹی کے چہرے کو تادیر غور سے دیکھتا رہتا۔ اسے یوں محسوس ہوتا کہ اس کی بیٹی کسی ریاست کی مہارانی بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔

ایک آدھ بار اس نے اپنے دل کی بات بھاگ رتی سے بھی کی۔

''ارے چھوڑو، مانو کے پتا!'' بھاگ رتی ہر مرتبہ اسے ٹوک دیتی۔ ''بھلا جھونپڑیوں میں بھی کبھی محل بنے ہیں؟'' اس کے سینے میں ہوک سی اٹھتی۔ ''میری تو اتنی سی پرارتھنا ہے کہ بس میری بیٹی کے بھاگ اچھے ہوں۔''

لیکن افسوس کہ بھاگ رتی خود اپنی بیٹی کے بھاگ دیکھنے کے لیے کچھ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکی اور چار سالہ مانی کارنیک روتا بلکتا چھوڑ کر اگلے جہان سدھار گئی۔

یوں مانی کارنیک جسے پیار سے سب مانو کہتے تھے، کی پرورش اور نگہداشت کی تمام تر ذمہ داری باپ کے کندھے پر آپڑی۔ مور پنتھ کے دوست احباب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مانو کی دیکھ بھال کے لیے کوئی آیا وغیرہ ہی رکھ لے لیکن اس کا جواب یہ ہوتا تھا کہ میں آیا سے زیادہ بہتر انداز میں اپنی بیٹی کو پال سکتا ہوں اور پھر جو پیسے میں نے آیا کو دینے ہیں وہ اس کی تربیت پر کیوں نہ خرچ کروں۔

باجی راؤ دوم اس وقت مرہٹوں کا پیشوا تھا لیکن نام نہاد کیونکہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اسے سالانہ آٹھ لاکھ روپے کا وظیفہ دیتی تھی جب کہ بیتور کی جاگیر اس کے علاوہ تھی۔ اس نے بھی کئی بار مانو کے باپ کو پیش کش کی وہ اس کی پرورش کے مالی اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہے لیکن مور پنتھ نے ہمیشہ اس کی پیش کش کو خوبصورتی سے ٹال دیا۔

اس کے لیے یہی بہت تھا کہ مانو کی تربیت اور پرورش باجی راؤ کے لے پالک (متبنیٰ) بیٹے نانا صاحب اور اس کے چھوٹے بھائی راؤ صاحب کے ساتھ ہو رہی تھی۔

مانو نے ان کے ساتھ ہی عام مروجہ رسمی تعلیمات کے علاوہ تلوار بازی، گھڑ سواری اور رائفل سے نشانہ بازی کی تربیت حاصل کی۔

وہ دونوں مانو سے عمر میں بڑے تھے لیکن مانو ہر معاملے میں ان سے زیادہ سمجھدار تھی۔ عقل و دانش اور ہنرمندی میں وہ ان دونوں سے کہیں آگے تھی۔ باجی راؤ دوم ان تینوں کا یکساں طور پر

خیال رکھتا لیکن نانا صاحب اور راؤ صاحب، مانو کو خود سے کمتر سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان دونوں سے مانو کو ایک عجیب سے نفرت تھی جسے وہ آج تک سمجھ نہ پائی تھی۔

بھگوان نے اسے یادداشت بھی بے حد کمال کی دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنی ماں کے مرنے سے لے کر اپنے دلہن بننے تک کا ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ اسے نانا صاحب اور راؤ صاحب کا ہتک آمیز رویہ بھولا تھا نہ بات بات پر ٹوکنا اور جھڑکنا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ان دونوں کو بیک وقت گولی سے اڑا دے۔ بچپن میں بھی وہ دونوں مانو کو اور مانو ان دونوں کو نیچا دکھانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی کیونکہ ان کے رویوں کے باعث انتقام اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔

اور انتقام کا یہ جذبہ اس کے دل و دماغ میں پیدا کرنے والے یہی نانا صاحب اور راؤ صاحب تھے۔

آج بھی شاہی ہاتھی کے سنہرے ہودج میں جھانسی کی رانی کے روپ میں بیٹھی مانی کارنیک کو اپنے بچپن کا ایک ایک پل یاد تھا۔

وہ موسم برسات کی ایک شام تھی۔ بیتور سے باہر دریائے گنگا کے کنارے ایک شاہراہ پر تین گھوڑے آہستہ روی سے چل رہے تھے۔ ان میں سے دو گھوڑوں پر دو نوجوان اور ایک پر کمسن لڑکی سوار تھی جس نے نہایت مہارت سے اپنے گھوڑے کی باگیں تھام رکھیں تھیں۔

اچانک ایک نوجوان نے اپنے گھوڑے کی پسلیوں پر دباؤ ڈالا اور اسے سرپٹ دوڑاتا ہوا لڑکی سے آگے نکل گیا۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔'' لڑکی زیر لب بدبدائی اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی کیونکہ یہ تو اسے برداشت ہی نہ تھا کہ کوئی اسے اس طرح پیچھے چھوڑ دے۔

لڑکی کا گھوڑا کمان سے نکلے تیر کی طرح آگے بڑھا اور چند ہی ثانیوں میں اس نے نوجوان کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لڑکی اس چھوٹی سی عمر میں بہترین شہ سوار تھی اور خوب جانتی تھی کہ اس وحشی مگر وفادار جانور پر کس طرح قابو پانا ہے۔

اب نوجوان کی باری تھی۔ وہ بھلا کیسے برداشت کرتا کہ عمر میں اس سے دو حصے چھوٹی ایک معمولی سی لڑکی اس سے آگے نکل جائے۔ اس نے اپنے گھوڑے کو تیز رفتاری سے بھگانے کی

کوشش کی لیکن وہ کھلاڑی ہونے کے باوجود اناڑی تھا۔ نتیجتاً اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ اپنے سوار سمیت زمین پر آ رہا۔

گھوڑے کے اگلے پیروں گرنے کے باعث نوجوان اچھل کر سامنے گرا اور دور تک زمین پر گھسٹتا ہوا چلا گیا جس کی وجہ سے اس کے سر، بازوؤں، چہرے اور ٹانگوں پر شدید زخم آئے۔

''اوہ مانو!'' وہ بری طرح چیخا۔ ''میں مر گیا۔''

لڑکی اس اثناء میں دور نکل چکی تھی لیکن اسے گھوڑے کے گرنے اور بعد ازاں سوار کے چیخنے کی آوازیں سنائی دے گئیں۔ اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور واپس پلٹی۔ لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے وہ اس جگہ آ پہنچی جہاں نوجوان اب تک زمین پر پڑا پچھاڑیں کھا رہا تھا۔

وہ واقعی بری طرح زخمی تھا کیونکہ اس کے جسم کے کئی حصوں سے خون بہ رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو دیکھ کر خود اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر زمین پر ڈھے گیا۔ شاید زخم کاری تھا۔ اس کا گھوڑا البتہ اتنی دیر میں زمین سے نہ صرف اٹھ کھڑا ہوا بلکہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

لڑکی نے اپنے ننھے منے وجود کی پوری طاقت صرف کر کے نوجوان کو کھینچ کر اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا۔

''کیا بہت زیادہ چوٹ آئی ہے؟'' لڑکی، جو مانی کارنیک کے سوا کوئی اور نہ تھی، نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، مانو! لگتا ہے میری بہت سے ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔'' نوجوان کو بولنے میں بھی دقت پیش آ رہی تھی۔

''جب پتا ہے کہ مجھ سے ہار جاؤ گے تو پھر مقابلہ ہی کیوں کرتے ہو؟'' مانی کارنیک عرف مانو نے اگلا سوال کیا۔

لیکن نوجوان نے اس مرتبہ کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

اسی اثناء میں تیسرا گھڑ سوار بھی ان تک آ پہنچا۔ تمام واقعہ اس کے سامنے رونما ہوا تھا اس لیے کوئی سوال کرنے کی تک نہ بنتی تھی۔ البتہ اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار بخوبی دیکھے جا سکتے تھے۔

اب لڑکی نے گھوڑے کی رفتار آہستہ رکھی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جھٹکوں سے اس کی گود میں

پڑے زخمی کو زیادہ تکلیف ہوگی۔

دوسرا نوجوان بدستور خاموش تھا لیکن وقفے وقفے سے وہ مانو اور اس کی گود میں لیٹے زخمی کو دیکھتا جا رہا تھا۔

اب ان کا رخ مرہٹوں کے پیشوا باجی راؤ دوم کے محل کی طرف تھا۔

اسی اثناء میں خالی لیکن زخمی گھوڑا ان سے پہلے محل پہنچ گیا۔ اتفاق سے باجی راؤ دوم اور مور پنتھ اس وقت پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔

باجی راؤ نے گھوڑے کو خالی اور زخمی دیکھا تو اچھل پڑا۔ وہ اپنے گھوڑے کو پہچانتا تھا۔ اسے علم تھا کہ تین گھوڑے کچھ دیر پہلے ہی محل سے روانہ ہوئے تھے اور ان میں سے ایک گھوڑے کا یوں خالی لوٹ آنا اس امر کی دلیل تھا کہ اس کے سوار کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔

باجی راؤ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ''نانا صاحب کا گھوڑا خالی واپس آیا ہے، مور پنتھ!'' اس نے اپنے معتمد خاص کو مخاطب کیا۔ ''نانا صاحب کو یقیناً کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔''

''راؤ صاحب اور مانو بھی ان کے ساتھ تھے، باجی راؤ صاحب!'' مور پنتھ نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے کہ صرف گھوڑا ہی زخمی ہوا ہو..... وہ لوگ بھی بس آتے ہی ہوں گے..... آپ فکر نہ کریں۔'' مور پنتھ نے اپنے پیشوا کو دلاسہ دینے کی کوشش کی لیکن وہ خود بھی اندر سے ہل گیا تھا کہ کوئی بڑا حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ زیادہ تشویش اسے مانو کی جانب سے تھی۔ وہ مانو کی عادت سے واقف تھا اس لیے اسے یہی فکر تھی کہ کہیں اس میں اس کی کوئی شرارت نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو باجی راؤ دوم، کسی بھی قسم کے تعلق کی پروا کیے بغیر اسے سزا دے کر ہی رہے گا۔

وہ دل ہی دل میں مانو اور اس سے بڑھ کر نانا صاحب کی خیریت کی پرارتھنا کرنے لگا۔

ساتھ ہی وہ باجی راؤ دوم کا واویلا بھی سن رہا تھا جو مسلسل بضد تھا کہ گھوڑوں پر زینیں کسوائی جائیں تاکہ وہ خود ان کی تلاش میں جا سکیں۔

مور پنتھ ہر ممکن طریقے سے اسے روکنے اور بچوں کے خیریت سے ہونے کی یقین دہانیاں کرا رہا تھا لیکن باجی راؤ صاحب رفتہ رفتہ آپے سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔

بالآخر بھگوان نے مور پنتھ کی خاموش پرارتھنائیں سن لیں اور دو گھوڑے محل کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اگلے گھوڑے پر مانو سوار تھی جس کی گود میں نانا صاحب بے ہوش

پڑا ہوا تھا جب کہ اس کے عقب میں راؤ صاحب اپنے گھوڑے پر خاموش اور پریشان بیٹھا ہوا تھا۔

باجی راؤ بھاگتا ہوا ان تک پہنچا۔

''یہ.....یہ.....کیا ہو گیا ہے؟'' وہ نانا صاحب کے جسم سے بہتا خون دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا۔ ''اسے کسی نے مارا ہے کیا؟''

''نہیں بابا!'' راؤ صاحب نے جواب دیا۔ ''یہ گھوڑے سے گر گیا ہے۔''

''مگر کیسے؟'' باجی راؤ اب نانا صاحب کے جسم کو ٹٹول رہا تھا۔ نانا صاحب کے سینے کا زیرو بم اس کے زندہ ہونے کی گواہی دے رہا تھا ''یہ کس طرح.....؟''

''یہ اس تفتیش کا وقت نہیں بابا!'' اس دفعہ بھی راؤ ہی بولا۔ ''فی الحال اس کے علاج کا انتظام کیجیے!''

باجی راؤ کو جیسے ہوش آ گیا۔ ''جلدی سے طبیب کو بلاؤ۔'' وہ چیخا۔

مور پنتھ آگے بڑھا اور نانا صاحب کو مانو کی گود سے اتارنے میں باجی راؤ کی مدد کرنے لگا۔

''ہائے بھگوان.....میرا بچہ.....'' باجی راؤ باقاعدہ عورتوں کی طرح بین کرنے لگا۔

مور پنتھ نے نانا صاحب کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن باجی راؤ نے بڑھ کر خود اسے گود میں بھر لیا۔ وہ اس کا خون آلود ماتھا چوم رہا تھا اور ساتھ ساتھ طبیب بلانے کی دہائی بھی دے رہا تھا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں، مہاراج۔'' مانو نے تسلی دینے والے انداز میں براہ راست باجی راؤ کو مخاطب کیا۔ ''نانا صاحب معمولی زخمی ہیں، کچھ ہی دیر میں ہوش میں آ جائیں گے۔''

''تم چپ رہو۔'' مور پنتھ نے بیٹی کو ڈانٹا۔ ''تم جہاں ہوتی ہو وہاں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوتی ہے۔''

مانو نے منہ بسورا لیکن باپ کے جملے پر کوئی تبصرہ کیا نہ جواب دیا۔

اتنے میں خادموں کی فوج ظفر موج محل سے برآمد ہوئی اور نانا صاحب کو اٹھا کر اندر لے گئی۔ طبیب بھی حاضر ہو گیا اور اس نے جلدی جلدی نانا صاحب کے زخم صاف کرنے اور اسے ہوش میں لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

مور پنتھ اور مانو اس وقت تک محل میں موجود رہے جب تک نانا صاحب نے آنکھیں نہ کھول دیں۔ باجی راؤ نے بڑھ کر اس کے ماتھے کو بوسہ دیا۔ مور پنتھ نے بھی مسکرا کر نانا صاحب کا

ہاتھ دبایا۔

''آپ بہت اجلد اچھے ہو جائیں گے، نانا صاحب!'' مور پنتھ نے اپنے تئیں اس کی مزاج پرسی کی۔

جواب میں نانا صاحب نے نظریں گھما کر پہلے اسے دیکھا اور پھر چند ثانیے مانو کو گھورتے رہنے کے بعد رخ پھیر لیا۔ یہ گویا مانو کے لیے ناراضی اور نفرت کا اظہار تھا۔

مور پنتھ نے نانا صاحب کے اس رویے کو بہ طور خاص محسوس کیا اور باجی راؤ سے اجازت لے کر مانو کے ہمراہ کمرے سے باہر آ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر نانا صاحب نے مانو کو کچھ کہہ دیا تو ماحول بگڑ جائے گا۔ مانو کبھی چپ نہ رہتی اور اس کے جواب سے تلخیاں ہی بڑھتیں۔ مور پنتھ میں اتنی طاقت و قوت نہ تھی کہ مرہٹہ پیشواؤں کے ساتھ رنجش، یا اختلافات کے باوجود اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھ سکتا۔ اس لیے عافیت یہی تھی کہ وہاں سے ہٹ جائے۔

مانو کے چہرے پر بھی کبیدگی کے آثار تھے۔ وہ بچی ضرور تھی لیکن محبت اور نفرت میں فرق واضح طور پر محسوس کر سکتی تھی اور اسے نانا صاحب کی نگاہوں میں اپنے لیے صرف نفرت ہی نفرت نظر آئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گھر پہنچ کر بھی اس نے باپ سے کوئی بات نہ کی۔

''کیا میری بیٹی، مجھ سے بھی ناراض ہے؟'' مور پنتھ نے کھینچ کر اسے گود میں بٹھا لیا۔ وہ جانتا تھا کہ نانا صاحب کی نظروں سے مانو نے بہت سے اندازے قائم کر لیے ہوں گے۔

''آپ کو اس سے کیا لینا؟'' وہ ٹھنک کر بولی۔ ''آپ بس اپنے نام نہاد پیشواؤں کا دل ٹھنڈا رکھیں۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

مور پنتھ نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''وہ ہم سے کہیں زیادہ طاقت ور ہیں، بیٹی۔'' اس کے انداز میں بے بسی تھی۔ ''ان کی مخالفت مول لے کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔''

''میں ان سے زیادہ طاقت ور بن کر دکھاؤں گی باپو!'' ننھی منی مانو بھڑک اٹھی ''اور دنیا دیکھے گی کہ یہی پیشوا ایک دن میرے تلوے چاٹیں گے۔'' اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

''بری بات!'' مور پنتھ نے اسے ٹوکا۔ ''بزرگوں کے بارے میں اس طرح بات نہیں کرتے۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم ان کی رعایا ہیں۔''

''ہوں'' مانو نے نفی میں سر ہلایا اور باپ کی گود سے اٹھ گئی۔ ''بزرگ یا راجہ ہوں گے وہ آپ

کے۔'' اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ ''میں انہیں اپنا پیشوا مانتی ہوں نہ بزرگ..... میں نے کہا نا کہ اگر انہیں ایک دن اپنے قدموں پر جھکنے کے لیے مجبور نہ کر دوں تو میرا نام بھی مانی کار نیک نہیں۔''

مور پنتھ جانتا تھا کہ وہ ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ وہ جوں جوں پیشواؤں کی تعریف کرے گا وہ اول فول بکتی رہے گی چنانچہ اس نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

''لیکن مانو، یہ تو افسوس کی بات ہے نا کہ نانا شدید زخمی ہو گیا ہے.....''

''اس میں اس کا اپنا قصور ہے باپو!'' مانو نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ ''نہ وہ میرے ساتھ یہ سلوک کرتا اور نہ وہ زخمی ہوتا۔''

''کیسا سلوک؟'' مور پنتھ نے بھویں اچکائیں۔

جواب میں مانو نے اسے پورا واقعہ سنایا۔

''لیکن وہ زخمی تو ہوا نا.....؟''

''یہ کیا آپ نے زخمی، زخمی کی رٹ لگا رکھی ہے'' مانو پھر ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ''آپ کو اتنا ہی رحم آ رہا ہے اس پر تو اس کے ساتھ لیٹ جایئے جا کر.....'' اس نے اپنے تراشے ہوئے بالوں کو جھٹکا دیا۔ ''اور وہ اتنا بھی زخمی نہیں ہوا، جتنا کراہ رہا ہے۔'' مانو نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''معمولی سے تو زخم آئے ہیں اسے۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ اھیمنو نے شدید زخمی ہونے کے باوجود بھی جنگ جاری رکھی تھی۔''

مانو کا اشارہ مہابھارت کی جانب تھا۔

''وہ زمانے اور تھے، مانو'' مور پنتھ نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے جیسے گزرے دنوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔

''کیا فرق ہے، باپو؟'' مانو بحث پر آمادہ تھی۔ ''وہی آسمان ..... وہی زمین ہے ..... سورج اور چاند بھی ویسے ہی ہیں.....''

''تم نہیں سمجھو گی بیٹی۔'' مور پنتھ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''اب گوروں کا راج ہے اور ہم ان کے سامنے بے بس ہیں۔''

''ہماری یہ بے بسی بھی انہی نام نہاد پیشواؤں کی وجہ سے ہے۔'' ننھی منی مانو کسی مدبر کی طرح جواب دے رہی تھی۔ ''باجی راؤ سے کہیں کہ انگریزوں سے ملنے والی آٹھ لاکھ روپے سالانہ

کی پنشن اور جاگیر پر لعنت بھیج کر اپنی قوم کی باگ ڈور سنبھالے پھر دیکھتی ہوں کہ انگریز کتنا عرصہ ہندوستان پر راج کرتے ہیں۔''

''اپنی عمر سے بہت بڑی بڑی باتیں کرتی ہو، مانو!'' مور پنتھ اپنی بیٹی کی باغیانہ سوچ پر کانپ گیا۔'' تمہاری ان باتوں کی بھنک بھی اگر پیشواؤں کو ہوگئی تو ہمارا جینا محال ہو جائے گا۔''

''پیشوا ہماری زندگیوں کے مالک نہیں ہیں باپو!'' مانو ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی ''یہ سب بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔''

''لیکن بیٹی، ان کا احترام ہم پر فرض ہے۔''

''آپ پر ہوگا، مجھ پر نہیں۔'' باپ کی نصیحت اور دلائل سے وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوئی اور جھٹکے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ خود مور پنتھ نے ہی اسے مقدس سیتا، بہادر جیجا بائی اور دلیر تارا بائی کی کہانیاں سنائی تھیں جو اس کے ذہن پر نقش ہو چکی تھیں۔ پھر بھلا ایسے میں محض پیشواؤں کے ساتھ اپنی تقدیر وابستہ کر لینے کی نصیحتیں اس پر کیا اثر کرتیں۔

مانو کا غصہ ابھی عروج پر ہی تھا کہ ایک اور حادثہ ہو گیا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مانو کا جی چاہنے لگا کہ وہ خود ہی موقعہ پا کر پیشواؤں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دے۔

ہوا یوں کہ نانا صاحب اور راؤ صاحب کو کسی مشن پر بیتور شہر سے باہر جانا تھا۔ سواری کے لیے ہاتھی کا انتخاب کیا گیا۔ باجی راؤ، مانو کے ہاتھوں نانا صاحب کے زخمی ہونے کے باوجود اس سے پیار کرتے تھے اور بیٹیوں کی طرح ہی اس کا خیال رکھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مانو اس سفر میں نانا اور راؤ کے ساتھ جائے۔ مور پنتھ بھی یہی چاہتا تھا۔

باجی راؤ نے مور پنتھ کو پیغام بھیجا کہ وہ مانو کو لے کر وقت مقررہ پر محل آ جائے تا کہ تینوں ایک ساتھ روانہ ہو سکیں۔ مور پنتھ نے ایسا ہی کیا لیکن جیسے ہی مانو محل میں داخل ہوئی اور نانا کی نگاہ اس پر پڑی، اس نے مہاوت کو فوری طور پر ہاتھی آگے بڑھانے کا حکم دے دیا۔

باجی راؤ نے نانا کو آوازیں دیں اور پکار کر مانو کو ساتھ لے جانے کے لیے بھی کہا لیکن نانا نے کوئی دھیان نہ دیا۔

مانو اس واقعہ سے بے حد مایوس اور افسردہ ہوئی۔ پیشواؤں کے لیے دل میں نفرت تو پہلے ہی تھی اب وہ دو چند ہو گئی۔ اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ وقت آنے پر وہ ان پیشواؤں کو ایسا

سبق سکھائے گی کہ تا عمر یاد رکھیں گے۔ البتہ اس نے بھگوان سے یہ پرارتھنا بھی کی کہ اس کے ارادوں کی تکمیل کا کوئی سبب بھی پیدا کر دے۔

مور پنتھ اور مانو بجھے دلوں اور اداس چہروں کے ساتھ گھر واپس آئے تو باپ پھر بیٹی کو سمجھانے بیٹھ گیا۔ ''ہمیں وقت کے ساتھ چلنا چاہیے مانو۔'' اس نے جگر کے ننھے سے ٹکڑے کو اپنے سینے میں چھپا لیا۔ ''ہم کوئی بادشاہ یا سردار تو نہیں کہ ہاتھیوں پر سواری کریں۔ ہمیں ایسی چیزوں کی خواہش نہیں کرنی چاہیے جس کے ہم حق دار نہیں۔''

مانو کا معصوم سا دل آج چکنا چور ہو گیا تھا۔ نانا کا ہتک آمیز رویہ اسے ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔

''نہیں.....ایسا نہیں ہے، باپو!'' مانو نے کندھے اچکائے۔ ''میں صرف ایک نہیں بلکہ کئی ہاتھیوں کی مالکن بننا چاہتی ہوں۔''

اس کا جملہ مور پنتھ کے سر سے گزر گیا۔ ''تو بن جاؤ۔'' وہ صرف اسی قدر کہہ سکا کیونکہ اسے علم نہ تھا کہ محض ایک سال کے اندر اندر ایک غریب برہمن کی بیٹی مانی کارنیک نہ صرف جھانسی کی رانی لکشمی بائی بن جائے گی بلکہ ایک نہیں، ایک ہزار ہاتھیوں کی بلا شرکت غیرے مالک ہو گی۔

آج ایک سو ہاتھیوں کے جلوس میں رانی جھانسی کی حیثیت سے گنیش مندر سے راج محل کی جانب محو سفر مانی کارنیک کو اپنے بچپن کی تمام محرومیاں ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں اور وہ بھگوان کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اس نے اس کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ اور ہر جملے کی یوں لاج رکھی جیسے وہ اس کے دل یا دماغ میں بیٹھا انہیں سن رہا تھا۔

لیکن آج مانی کارنیک سے رانی لکشمی بائی بننے کے باوجود بھی وہ پیشواؤں کے سلوک اور ان سے نفرت کو اپنے دل سے مٹا نہیں پائی تھی بلکہ اس نے ایک بار پھر دل ہی دل میں اپنا یہ وچن دہرایا کہ اسے جب بھی موقع ملا وہ انہیں اپنے سامنے جھکنے پر مجبور ضرور کرے گی۔

———◈◈◈———

یہ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی کا آغاز تھا۔ انگریز جو صرف تجارت کے لیے ہندوستان آئے تھے اب ایسٹ انڈیا کمپنی کی آڑ میں آہستہ آہستہ نہ صرف اپنے سیاسی مفادات مسلسل مضبوط کر رہے تھے بلکہ ہندوستانی سرزمین پر اپنی ملکیت میں بھی اضافہ کرتے جا رہے تھے۔

ہندوستان میں مرکزی طور پر تو مغل بادشاہوں کی حکومت تھی لیکن مرکزی قوت کمزور ہونے کے باعث ملک سینکڑوں ریاستوں اور رجواڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ خود مختار ریاستیں اور ان کے راجے مہاراجے اپنی رعایا کی بھلائی یا ان کی ترقی اور معیار زندگی بلند کرنے کی کوششیں کرتے لیکن اس کے برعکس وہ اپنی ریاستوں کی حدود میں اضافے کے لیے ایک دوسرے سے باہم دست وگریباں تھے۔ ان لڑائیوں کا فائدہ براہ راست انگریزوں کو پہنچتا۔

جو راجہ اپنے مخالف کے ساتھ لڑائی میں کمزور پڑتا وہ فوراً انگریزوں سے رابطہ کر کے ان کی مدد طلب کر لیتا۔ انگریز تو جیسے اسی کے منتظر تھے۔ وہ فوراً اس سے معاہدہ کرتے لیکن ایسی شرائط تسلیم کرواتے کہ کامیابی کی صورت میں وہ ریاست انگریزی فوجوں کی چھاؤنی میں تبدیل ہو جاتی۔

دوسری جانب جب مخالف راجہ کو شکست ہوتی تو فاتح کے اتحادی کی حیثیت سے انگریزوں کو قدرتی طور پر مفتوحہ علاقے میں تمام تر حقوق اور اختیارات حاصل ہو جاتے۔

یوں انگریز ایک تیر سے دو شکار کرتے اور ان کی اس حکمت عملی سے ہندوستان پر ان کی گرفت ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے علاوہ ایسے ہندو راجے، مہاراجے جنہیں اپنے مخالفین سے ذرا سا بھی خطرہ ہوتا وہ تیر کی طرح انگریزوں کے پاس پہنچتے اور ان سے ان کی من مانی شرائط پر اپنی ریاست کے تحفظ کا معاہدہ کر لیتے۔ چنانچہ حالت جنگ میں نہ ہونے کے باوجود بھی ریاستیں اور رجواڑے انگریز کے ہاتھ مضبوط کرنے کی کوششوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مصروف تھے۔

یوں ہندوستان کی سرزمین پر ہونے والا کوئی بھی غیر معمولی واقعہ برطانوی تسلط اور اقتدار میں اضافے کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ جب انگریزوں کو کسی کے خلاف کامیابی یا فتح ہوتی تو وہ کسی اور طرح کا معاہدہ کرتے لیکن اگر انہیں کہیں شکست ہو جاتی تو وہ بالکل مختلف نوعیت کا معاہدہ کرتے۔ البتہ یہ بات علیحدہ تھی کہ دونوں ہی صورتوں میں ہندوستان کا کچھ اور حصہ ان کی غلامی میں چلا جاتا۔

پہلے انگریزوں نے مرہٹوں پر ہاتھ ڈالا کیونکہ ان دنوں وہ واحد قوت تھے جو مغل بادشاہت کے خلاف کامیابی کی جنگ لڑ رہے تھے اور انہوں نے کئی مقامات پر مغلوں کو بڑی عبرت ناک

شکست سے دو چار کیا تھا۔ انگریزوں نے فرداً فرداً مرہٹہ ریاستوں پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے ان کے آخری پیشوا کو اختیارات سے محروم کر کے اس کا سالانہ وظیفہ باندھا اور اسے اپنا مطیع و فرمانبردار بنالیا۔ پیشوا چونکہ مرہٹہ قوت کا سرچشمہ تھا اس لیے جب اس نے انگریزوں کی بالا دستی قبول کر لی تو باقی مرہٹہ ریاستیں بھی سر جھکانے پر مجبور ہو گئیں۔

اس کامیابی سے انگریزوں کے حوصلوں اور غرور و تکبر میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ انہوں نے مغل بادشاہ کی پروا کرنا بھی چھوڑ دی۔ اب انہیں کہیں کارروائی یا پیش قدمی کرنے کے لیے تاج مغلیہ سے اجازت لینے کی ضرورت نہ رہ گئی تھی۔ ایک جانب وہ آزادی سلب کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے تو دوسری جانب وہ ہندوستانیوں کو غلامی پر مجبور کر رہے تھے۔

لیکن یہ بھی ایک فطری امر ہے کہ آزادی سے محبت کو کبھی کچلا نہیں جا سکتا۔

تاریخ عالم گواہ ہے کہ آزادی سے محبت کو جوں جوں دبایا جاتا ہے۔ یہ اتنی ہی شدت سے ابھرتی اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ ایک جانب مقامی ریاستوں اور رجواڑوں کے تاج و تخت کانپ رہے تھے اور وہ ان کی حفاظت کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ کی جانب سے شرمناک شرائط قبول کر رہے تھے جن کے نتیجے میں ان کی ریاستوں کو "محفوظ حکومتوں" کا درجہ مل رہا تھا۔

لیکن دوسری جانب انگریزوں کی بڑھتی ہوئی اور پنپتی ہوئی کونپلوں کو کچلنے اور ملک کی عزت و آبرو اور آزادی کے تحفظ کی خواہش میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ماحول بہ ظاہر پرسکون اور ہر جانب امن تھا۔

لیکن خفیہ طور پر ایسی سرگرمیاں جاری تھیں جن سے ملک ایک ایسے آتش فشاں میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا جو کسی بھی وقت پھٹ کر سب کچھ تہ و بالا کر سکتا تھا۔

◈ ◈ ◈

انگریزوں نے جھانسی کے راجہ کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا تھا جو انہوں نے اپنے دست نگر دوسرے رجواڑوں اور ریاستوں کے مہاراجاؤں کے ساتھ کیا تھا۔ 1838ء میں انہوں نے راجہ گنگا دھر راؤ کو جھانسی کے راجہ کی حیثیت سے قبول اور تسلیم تو کر لیا لیکن اس پر دو کڑے معاہدوں کا

بوجھ لاد دیا گیا۔ وسائل کے اعتبار سے اور حجم کے لحاظ سے چونکہ جھانسی ایک چھوٹی سی ریاست تھی اس لیے راجہ گنگا دھر راؤ کے لیے ان معاہدوں پر دستخط کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

پہلے معاہدے کے تحت مہاراجہ جھانسی کو اس امر کا پابند کیا گیا تھا کہ جب بھی انگریزوں کو اس کی مدد کی ضرورت پڑے گی وہ اس سے انکار نہیں کرے گا۔ دوسرے الفاظ میں انگریز اسے پہلے ہی اپنے ہم وطنوں کے خلاف لڑنے کے لیے میں تیار کر چکے تھے۔

انگریز اس بات سے آگاہ تھے کہ راجہ جھانسی ابھی تک لاولد ہے لہٰذا ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ بغیر وارث کے ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ اس صورت میں انگریزی قانون کے مطابق جھانسی کی ریاست از خود ان کی عمل داری میں شامل ہو جاتی۔ انگریزوں نے راجہ گنگا دھر راؤ سے دوسرا معاہدہ اسی لالچ کے تحت کیا تھا جس کی رو سے وہ جھانسی کے آئندہ حکمران کا فیصلہ کرتے وقت انگریزوں سے مشاورت کا پابند تھا۔

اب یہ انگریزوں پر منحصر تھا کہ وہ راجہ گنگا دھر کی جانب سے نامزد کیے جانے والے شخص کو جھانسی کا آئندہ حکمران تسلیم کرتے یا جھانسی کو براہ راست اپنی حکومت کا حصہ بنا لیتے۔

یعنی انگریزوں نے جھانسی کو مکمل تباہ کرنے کا بیج پہلے ہی بو دیا تھا۔

لیکن راجہ اور اس کے مشیر بھی انگریزوں کی اس چال سے باخبر تھے۔ اسی لیے انہوں نے راجہ کو تقریباً مجبور کر کے مانی کارنیک سے شادی پر رضامند کیا تھا جو اب لکشمی بائی کے نئے نام سے جھانسی کی رانی تھی۔ مشیروں کے ساتھ ساتھ راجہ کی بھی خواہش تھی کہ لکشمی اس کے وارث کو جنم دے تاکہ جھانسی کو انگریزوں کے دستبرد سے محفوظ رکھا جا سکے۔

دوسری جانب جھانسی کی صورت حال بدترین تھی جو اب رفتہ رفتہ معمول پر آ رہی تھی۔ سابق راجہ رگھوناتھ نے ریاست کا خزانہ خالی چھوڑا تھا۔ انتظامیہ بے بس اور عوام بدحال تھے لیکن گنگا دھر نے نہایت سرعت کے ساتھ حالات پر قابو پایا اور تمام معاملات درست کر لیے۔

اس نے مزید مویشی، ہاتھی اور گھوڑے خریدے۔ فوج کو اسلحہ اور گولہ بارود سے لیس کیا گیا اور اس وقت جھانسی کی فوج میں پانچ ہزار انفنٹری (پیدل) اور پانچ ہزار کیولری (گھڑ سوار) شامل تھی جب کہ آرٹلری (توپ خانہ) ان کی مدد کے لیے علیحدہ سے موجود تھی۔

انگریزوں نے جھانسی کی اس فوج کو جھانسی کے دفاع کے لیے ناکافی قرار دے کر اپنی فوج

بھی وہاں تعینات کر رکھی تھی جس پر ریاستی خزانے سے سالانہ دو لاکھ ستائیس ہزار روپے خرچ ہو رہے تھے۔ جھانسی کے راجہ سے لے کر ایک عام آدمی تک کو خبر تھی کہ شہر کے بالمقابل انگریز چھاؤنی میں تعینات برطانوی فوجی جھانسی کے دفاع کے لیے نہیں بلکہ بہ وقت ضرورت جھانسی کی اپنی فوج اور مزاحمت کو کچلنے کے لیے استعمال ہوں گے۔

لیکن وہ حالات کے ہاتھوں مجبور تھے۔

اس کے ساتھ ہی انہیں جھانسی کے لاوارث ہونے کا غم بھی گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ راجہ گنگا دھر راؤ ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی موت سے قریب ہوتا جا رہا تھا لیکن جھانسی کے مستقبل کے راجہ کی کوئی امید ابھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

انہیں راجہ کی شادی کے بعد یہ پتا بھی چلا تھا کہ ان کی رانی کی عمر صرف سات سال ہے جو ظاہر ہے کہ اس کم عمری میں راجہ کو وارث دینے کے قابل ہی نہیں تھی۔ اب جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا ان کی تشویش کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

لیکن پھر امید کے دیئے اچانک ہی جل اٹھے۔

راجہ گنگا دھر راؤ اور رانی لکشمی بائی کی شادی کے نو سال بعد جھانسی کے گھر گھر میں چراغاں ہوا اور اس انداز میں خوشیاں منائی گئیں کہ ان کی شادی کی یاد تازہ ہو گئی۔ جھانسی کے در و دیوار پر ایک بار پھر بہاریں اتر آئی تھیں۔

لکشمی بائی نے سولہ سال کی عمر میں 1851ء کے اوائل میں راجہ گنگا دھر راؤ کے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ یہ خوشیاں جھانسی کو وارث ملنے پر منائی جا رہی تھیں۔ راجہ گنگا دھر کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ ساتھ ہی جھانسی کے عوام نے بھی سکھ کا سانس لیا کیونکہ اب انہیں امید پیدا ہو گئی تھی کہ وہ انگریزوں کی مکمل غلامی سے بچے رہیں گے۔

راجہ نے پوری ریاست میں سات روزہ جشن کا اعلان کیا۔ نہ صرف ریاست کے کونے کونے سے راجہ کے چاہنے والے بلکہ قرب و جوار کی تمام ریاستوں سے شاہی وفود بے پناہ تحائف اور نومولود کے لیے نذرانے لے کر جھانسی پہنچے۔

رانی کی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے بالآخر لاوارث جھانسی کو وارث کا تحفہ دے ہی دیا تھا۔ طبیبوں نے اسے کئی روز آرام کا مشورہ دیا تھا کیونکہ یہ اس کی پہلی اولاد تھی لیکن لکشمی دن بھر اپنے

بیٹے کو سینے سے چمٹائے پورے محل میں اٹھکیلیاں کرتی پھرتی۔ راج کمار کی خدمت کے لیے درجنوں باندیاں تھیں لیکن لکشمی اپنے بیٹے کے سارے کام خود اپنے ہاتھوں انجام دیتی۔

سینکڑوں ہاتھ راج کمار کی بلائیں لینے کے لیے اٹھتے رہے اور وہ ان کے سائے سائے میں تین ماہ کا ہو گیا۔ رانی کی خواہش تھی کہ وہ جلدی سے بڑا ہو کر اپنے باپ کے کندھوں کے بوجھ کو ہلکا کر دے۔ وہ اسے جھانسی کی تخت پر راجہ کی حیثیت سے بیٹھا دیکھنا چاہتی تھی۔

لیکن وہ خواہش ہی کیا جو پوری ہو جائے۔

ادھر راجکمار نے چوتھے ماہ میں قدم رکھا اور ادھر ملک الموت نے اس شیر خوار کو اپنے ساتھ لے جانے کا اعلان کر دیا۔

اور یوں تین ماہ چند دن کی عمر میں لکشمی کے بطن سے پیدا ہونے والا راجہ جھانسی کا جانشین اپنی ریاست کو ایک بار پھر لاوارث چھوڑ کر اگلے جہان سدھار گیا۔

جس جھانسی میں چند ماہ قبل گھی کے چراغ روشن ہوئے تھے۔ وہاں صف ماتم بچھ گئی اور لوگ یوں دھاڑیں مار مار کر رونے لگے جیسے ان کی اپنی اولاد انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی ہو۔

راجہ اور رانی کا غم دیکھا نہیں جاتا تھا۔

لکشمی تو پچھاڑیں کھا کھا کر رو رہی تھی۔ اس وقت وہ کسی ریاست کی رانی نہیں بلکہ ایک ماں تھی جس کی گود نو سال کے انتظار کے بعد ہری ہوئی لیکن تین ماہ میں ہی اجڑ گئی۔

راجہ گنگا دھر چونکہ مرد تھا اس لیے اسے خود پر بہ امر مجبوری قابو رکھنا تھا۔ چند روز پہلے وہ لوگوں کی مبارک بادیں وصول کر رہا تھا اور اب غم ناک آنکھوں سے پرسے کے لیے آنے والوں سے ملنے میں مصروف تھا۔

ننھے راج کمار کی چتا جلی تو اس کے ساتھ ہی جیسے گنگا دھر راؤ کی تمام امیدیں بھی اگنی کی نذر ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں میں اب تک امید کے جو دیئے روشن تھے اب بالکل بجھ گئے۔ وہ اپنے اور جھانسی کے مستقبل سے قطعی طور پر ناامید ہو گیا۔ اس نے دربار میں شرکت سے انکار کر دیا اور مکمل طور پر گوشہ نشینی اختیار کر لی جو بعد میں اس کی ذہنی بیماری کا سبب بن گئی۔

کبھی کبھار اس کا خیال لکشمی کی طرف جاتا کہ وہ اسے قانونی طور پر اپنی جانشین مقرر کر دے لیکن اس سے پہلے ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی کہ راجہ کے مرنے پر اس کی رانی تخت نشین ہوئی ہو۔

کئی ماہ اسی شش و پنج میں گزر گئے لیکن راجہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اسی اثناء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کے تازہ ترین احکامات جھانسی پہنچ گئے جس سے حقیقی معنوں میں راجہ کی کمر ٹوٹ گئی۔

ان نئے قوانین کے تحت ہندوستان کی مقامی ریاستوں کو نئے سرے سے انگریزی امداد کی پیش کش کی گئی تھی البتہ لارڈ ڈلہوزی (9) نے یہ شرط عائد کی تھی کہ اگر کوئی حکمران، وارث کے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو انگریز اس ریاست پر قبضہ کر لیں گے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی حکمران لاولد ہونے کے باعث کسی کو لے پالک یا متبنیٰ بناتا ہے تب بھی وہ مرنے والے کی جگہ ریاست کا حکمران نہیں بن سکے گا۔ لارڈ ڈلہوزی کے اس قانون کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مرنے والے حکمران کے اہل خانہ کے لیے ایک سالانہ پنشن مقرر کر دی جائے گی جب کہ ریاست کی حدود کا تحفظ مکمل طور پر انگریز حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔

راجہ گنگا دھر کو پہلے ہی علم تھا کہ اس قانون کی آڑ میں انگریز کئی مقامی ریاستوں کو ہڑپ کر چکے ہیں اور اب جھانسی کی باری تھی۔

وہ ان قوانین کو پڑھنے کے بعد بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

اور ایسے میں سوائے لکشمی کے، اسے دلاسہ دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اسے جھانسی ٹوٹتا، ڈوبتا اور بکھرتا دکھائی دے رہا تھا لیکن لکشمی بدستور اس کی ہمت بڑھا رہی تھی۔

''آپ ناامید نہ ہوں، مہاراج۔'' لکشمی نے اپنے سن رسیدہ شوہر کے آنسو اوڑھنی کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''بھگوان کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا۔ ہمیں یقین ہے.....''۔

''اب کیا امید رکھیں لکشمی؟'' راجہ کی لرزتی کانپتی آواز ابھری۔ ''میرے آخری دن آ چکے ہیں اور بھگوان نے مجھے ابھی تک اولاد سے محروم رکھا ہے۔''

''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔'' لکشمی نے پیار سے راجہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اگر آپ اجازت دیں اور برا نہ مانیں تو کہیں.....؟'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر امید بھری نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

''کہو، لکشمی'' راجہ نے اجازت دے دی۔ ''تمہارے علاوہ میرا غم گسار اور ہمدرد اور ہے ہی کون؟''

لکشمی سوچ میں پڑ گئی۔ راجہ کی حالت اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ ایک بچی کی حیثیت سے راج محل میں آئی تھی اور اب سترہ سال کی نوجوان اور دلکش دوشیزہ تھی۔ اس کا شوہر عمر میں اس سے تین گنا بڑا تھا لیکن اس نے راجہ کو عمروں کے اس تفاوت کا کبھی احساس بھی نہ ہونے دیا تھا۔ یہ درست تھا کہ خود اس کی کئی خواہشیں تشنہ کام رہ گئی تھیں لیکن راجہ کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی تھی کہ اس نے اپنی جوانی بوڑھے شوہر پر قربان کر دی ہے۔

وہ واقعی اپنے پتی کی وفادار پتنی تھی۔

''بولو لکشمی!'' رانی کی خاموشی طویل ہوئی تو راجہ نے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔ ''مجھے تمہاری خاموشی سے وحشت ہوتی ہے۔''

''اگر .....اگر .....مہاراج چاہیں'' لکشمی کے لہجے میں لکنت تھی۔ ''.....تو اپنا جانشین حاصل کرنے کے لیے ایک شادی اور کر لیں۔''

بالآخر لکشمی نے جملہ مکمل کر دیا۔

''خبردار!'' راجہ یوں اچھلا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ''آئندہ ایسے وچار کبھی زبان پر بھی نہ لانا۔'' اس نے لکشمی کا وجود اپنے بوڑھے بازوؤں میں قید کر لیا۔ ''مجھے لاولد مر جانا منظور ہے لیکن میں تمہاری جگہ کسی اور کو جھانسی کی رانی نہیں دیکھ سکتا۔''

لکشمی کی آنکھیں بھی بہ نکلیں۔ ''لیکن مہاراج، میں بھی تو آپ کے راجہ ہونے کی وجہ سے رانی ہوں ناں۔'' اس نے خود کو اپنے شوہر میں سموتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر آپ اداس اور نا اُمید ہیں تو مجھے چین اور سکون کیسے مل سکتا ہے۔''

''میں نے پچھلے گیارہ سالوں میں تمہیں بہت سی تکلیفیں اور دکھ دیئے ہیں۔'' راجہ کی آواز بدستور کپکپا رہی تھی۔ ''مجھے ان پر شما کر دو.....''۔

''کیوں گنہگار کرتے ہیں۔'' لکشمی نے فوراً راجہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''وہ کون سی نعمت ہے جس کی میں نے خواہش کی اور نہ مل سکی اور کون سی خواہش ہے جو دل میں آئی ہو اور پوری نہ ہوئی ہو۔ افسوس آپ کو نہیں مجھے ہونا چاہیے.....''۔

''کس بات کا میری رانی؟''

''یہی کہ میں آپ کو، آپ کا وارث نہیں دے سکی۔''

''اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں، لکشمی۔'' گنگا دھر نے اسے دلاسہ دیا۔ ''شاید بھگوان کو یہی منظور تھا۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ آپ میری بات مان کر ایک اور شادی کر لیں تا کہ جھانسی کو اس کا وارث مل سکے۔'' لکشمی نے پھر اصرار کیا۔

''نہیں..... میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جھانسی کی رانی صرف تم.....''

''میں اس کے چرنوں میں زندگی گزار دوں گی۔''

''لکشمی!'' راجہ اتنے زور سے چیخا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ لکشمی نے بڑھ کر پانی سے بھرا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے چند گھونٹ لیے اور پیالہ ہٹا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''میں نے جو کچھ کہنا تھا، کہہ دیا ہے۔'' راجہ نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔ ''تم میری آخری بیوی ہو اور میں تمہاری ہی گود میں سر رکھ کر اس دنیا سے جانا چاہتا ہوں۔''

''بھگوان نہ کرے۔''

''یہ تو ہر پرش کا انجام ہے لکشمی۔'' راجہ نے اس کے گال تھپتھپائے۔ ''میں نے بھی بالآخر ایک دن آگ میں جل کر راکھ میں تبدیل ہو جانا ہے۔ یہ بھگوان کے کام ہیں جن میں تم دخل دے سکتی ہو نہ میں.....'' راجہ چند ثانیوں کے لیے رکا اور پھر گویا ہوا۔ ''ہاں! میرے ذہن میں اس مسئلے کا ایک حل موجود ہے.....''۔

''کس مسئلے کا؟'' رانی نے بے تابی سے پوچھا

''یہی کہ میرے بعد جھانسی کا وارث کون ہوگا'' راجہ نے جواب دیا۔

''آپ نے ڈلہوزی کا وہ خط پڑھا ہے.....''

''اسے گولی مارو'' ! راجہ نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میرے بعد جھانسی کے تخت پر تم بیٹھو گی لکشمی، تم..... لکشمی..... صرف تم.....'' راجہ جذباتی ہو گیا۔

''ہمارے دیش میں ایسی کوئی روایت موجود نہیں۔'' رانی نے اسے یاد دلایا۔ ''یوں بھی آپ کے بغیر جھانسی کا تخت میرے لیے کانٹوں بھری سیج ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ آپ کی جگہ رانی بن کر جھانسی پر حکومت کروں۔''

''تمہیں ایسا کرنا ہوگا، لکشمی۔'' راجہ نے زور زور سے سر ہلایا۔ ''جھانسی کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لیے تمہیں جھانسی کا تاج وتخت سنبھالنا ہوگا۔ جھانسی کے عوام، غیرت مند اور آزادی پسند ہیں۔ تمہاری صورت میں انہیں اپنا رہنما ملا تو وہ کبھی انگریز کو قلعے کی دیواروں کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے.....''

''لیکن ڈلہوزی اسے کبھی تسلیم نہیں کریگا۔'' رانی کا اشارہ ہندوستان کے گورنر جنرل کی جانب تھا۔ ''ابھی چند دن پہلے اس نے جو حکم نامہ بھیجا ہے.....''

''اسے بھاڑ میں جھونکو اور جو میں کہہ رہا ہوں اس کے بارے میں سوچو۔''

''آپ کی ہر آشا پوری کرنا میری زندگی کا مقصد ہے مہاراج۔'' لکشمی نے جواب دیا۔ ''لیکن انگریز، ہندوستان میں چاروں طرف چھائے ہوئے ہیں وہ ہمیں جھانسی میں کبھی من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ بلکہ جس دن انہیں پتہ چلے گا..... میرے منہ میں خاک ..... کہ آپ نہیں رہے وہ بھوکے شیروں اور خونخوار بھیڑیوں کی طرح جھانسی پر چڑھ دوڑیں گے۔''

''تو پھر اس کا اپائے کیا ہے؟'' راجہ نے گویا رانی کے دلائل تسلیم کر لیے۔

''ایک حل ہے مہاراج۔'' رانی نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔ ''لیکن وہ بھی اگر آپ اجازت دیں تو.....''

''وہ کیا؟'' راجہ گنگا دھر راؤ کی آنکھوں کے بجھتے چراغ پھر سے جل اٹھے۔ اسے امید تھی کہ اس کی ذہین بیوی نے ضرور کوئی حل ڈھونڈ نکالا ہوگا۔

''ہم کسی کو گود لے لیتے ہیں۔'' لکشمی نے تجویز پیش کی۔ ''اس سلسلے میں تمام مذہبی اور قانونی تقاضے پورے کیے جائیں گے۔ بچے کا نہ صرف نام تبدیل کر دیا جائے گا بلکہ اس کے والدین سے یہ اجازت بھی لے لی جائے گی کہ اس کی ولدیت کے خانے میں آپ کا نام لکھا جائے اس کے بعد اسے جھانسی کے تخت کا قانونی وارث بنا دیا جائے گا۔''

''لیکن ڈلہوزی اسے بھی نہیں مانے گا۔'' راجہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس خبیث نے اپنے حکم نامے کے ذریعے یہ راستہ بھی بند کر دیا ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' رانی نے اس کی تائید کی ''لیکن کوشش کرنے میں ہرج ہی کیا ہے؟

ممکن ہے کہ بھگوان ان بے رحموں کے دلوں میں تھوڑی سی ہمدردی پیدا کر ہی دے''۔

''مجھے تو امید نہیں، پھر بھی تم کوشش کر کے دیکھ لو۔'' راجہ نے اپنے تئیں رانی کو اس تجویز پر عمل کرنے کی اجازت دے دی۔

رانی لکشمی بائی ایک بچی کی حیثیت سے اس محل میں آئی تھی لہٰذا وہ اگر کسی سے پردہ نہ بھی کرتی تو کچھ معیوب نہ ہوتا لیکن اس نے روز اول سے ہی پردے کو اپنا شعار اور پہچان بنا لیا تھا۔ وہ راجہ گنگا دھر کے ہمراہ تمام محفلوں میں شرکت کرتی اور دربار میں بھی حاضر رہتی لیکن راجہ گنگا دھر راؤ چلمن سے باہر مردانہ اور رانی لکشمی، چلمن کے اندر زنانہ حصے میں بیٹھتی۔

اس نے اپنے جانثار ساتھیوں اور راجہ کے وفاداروں میں سے غلام غوث خان، دوست خان، دیوان رگھوناتھ سنگھ، دیوان جواہر سنگھ اور رام چندر راؤ دیش مکھ کو بلا بھیجا تا کہ ان سے اس معاملے پر بات کر سکے۔

بحث مباحثہ گھنٹوں جاری رہا جس میں لارڈ ڈلہوزی کے تازہ ترین احکامات سے لے کر راجہ کی موجودہ صحت کی صورتحال سمیت تمام معاملات پر غور کیا گیا۔ رانی حسب معمول چلمن کے عقب سے وقتاً فوقتاً اپنی رائے دے رہی تھی۔

ایک طویل بحث کے بعد بالآخر یہ طے پایا کہ راجہ گنگا دھر راؤ کے ایک دور کے رشتے دار کے بیٹے آنند راؤ کو جس کی عمر اس وقت چار سال تھی، راجہ اور رانی کے لے پالک بیٹے کی حیثیت سے گود لیا جائے اور بعد ازاں اس کے جھانسی کے تخت کا وارث ہونے کا اعلان کیا جائے۔

تاہم اہل مجلس کا یہ خدشہ آخر وقت تک برقرار رہا کہ انگریز سرکار، راجہ گنگا دھر راؤ کے متبنیٰ کو جھانسی کا راجہ بننے کی اجازت کبھی نہیں دے گی اور راجہ کے مرنے کے بعد پہلی فرصت میں جھانسی پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گی۔

رانی کو بھی اس بات کا اندیشہ تھا تاہم ایک موہوم سی امید کے سہارے اس نے اہل دربار کو تسلی دی کہ راجہ صاحب کی جانب سے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ لارڈ ڈلہوزی کو آنند راؤ کو جھانسی کے مستقبل کا راجہ تسلیم کرنے پر رضامند کر لیا جائے۔

راجہ کے رفقاء نے پیش کش کی کہ وہ آنند راؤ کے والد سے اس سلسلے میں بات کریں گے لیکن رانی نے انہیں یہ جواب دیا کہ میں آنند راؤ کو اپنا بیٹا بنانے جا رہی ہوں لہٰذا ایک ماں بن کر اور جھولی پھیلا کر خود ہی آنند راؤ کے والدین کے پاس جاؤں گی۔

چنانچہ تیسرے روز ہی رانی لکشمی بائی ایک سائلہ بن کر آنند کے والدین سے ملنے ان کے گھر پہنچ گئی۔ انہوں نے کسی قدر تردد کا مظاہرہ کیا لیکن رانی لکشمی بائی میں اب بھی بچپن کی مانی کا رنیک زندہ تھی جس نے کبھی شکست تسلیم کرنا سیکھا ہی نہیں تھا چنانچہ جب وہ وہاں سے واپس آئی تو آنند راؤ اس کے ہمراہ تھا۔

اٹھارہ سالہ لکشمی بائی نے اسے اسی طرح سینے چمٹا رکھا تھا جیسے کہ وہ اس کی حقیقی اولاد ہو جب کہ آنند نے بھی جانے اس میں کیا دیکھا تھا کہ فوراً ہی اسے ''ماتا جی'' کہنے لگا تھا۔

رانی نے کامیابی کی سب سے پہلی اطلاع راجہ گنگا دھر راؤ کو دی۔ اس نے بھی آنند راؤ کو بے حد و حساب پیار کیا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے بھگوان نے اسے حقیقتاً بیٹے کے تحفے سے نواز دیا ہو۔ راجہ نے فوراً احکامات صادر کیے کہ آنند راؤ کی شاہی انداز میں تعلیم و تربیت کے انتظامات کیے جائیں چنانچہ اگلے ہی روز سے ان پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔

محل کا ایک حصہ آنند راؤ کی پڑھائی لکھائی اور دیگر فنون و علوم کی تربیت کے لیے وقف کر دیا گیا۔ رانی نہ صرف خود ذاتی طور پر ان تمام معاملات کی نگرانی کر رہی تھی بلکہ اس نے آنند راؤ کے لیے بہترین اساتذہ کی خدمات بھی حاصل کی تھیں۔

تین ماہ کی تربیت مکمل ہونے کے بعد راجہ گنگا دھر راؤ نے جھانسی کے مہا پجاری کو طلب کیا اور آنند راؤ کو مذہبی روایات کے تحت متبنیٰ بنانے کی رسم ادا کرنے کی غرض سے شبھ گھڑی نکالنے کا حکم دیا۔

چوتھے روز مہا پجاری نے راجہ کو بتایا کہ آنند راؤ کو متبنیٰ بنانے کی رسومات کے لیے اکتوبر 1853ء کے پہلے منگل کو تقریبات شروع کی جائیں گی جو پورے سات دن جاری رہیں گی

چنانچہ ایک بار پھر جھانسی کو دلہن کی طرح سجانے کا عمل شروع ہو گیا۔ شہر میں میلے کا سا سماں تھا۔ جھانسی کے راجہ اور رانی کو اولاد، جب کہ جھانسی کے عوام کو اپنا راجہ ملنے والا تھا۔ پورا شہر ان یادگار تقریبات میں شرکت کے لیے گنیش مندر کے گرد جمع ہو گیا تھا۔

تقریبات اکتوبر کے پہلے منگل کو صبح گیارہ بجے شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے آنند راؤ کے سر کے بال مونڈھے گئے۔ پھر اسے گنگا جل سے اشنان کرایا گیا۔ گیروے رنگ کے کپڑے پہنائے گئے اور پھر آنے والے دنوں میں اسے چاروں ویدوں، مہابھارت، رامائن اور اتر رامائن کے بھجنوں کے علاوہ اپنیشد اور پران پڑھائے گئے اور بالآخر ساتویں دن اس کا نام تبدیل کرنے کی رسم ادا کی گئی۔ مہا پجاری نے جھانسی کے عوام کے سامنے اعلان کیا کہ آج سے آنند راؤ کا نام دامودھر راؤ ولد راجہ گنگا دھر راؤ ہوگا۔ راجہ کو اس کے قانونی باپ اور رانی لکشمی بائی کو اس کی قانونی ماں کا درجہ حاصل ہوگا۔

راجہ نے اپنی بیماری کے باوجود ساتوں دن ان تقریبات میں شرکت کی جب کہ رانی لکشمی بائی ان لمحات میں مستقل اپنے شوہر کے پہلو میں موجود رہی۔

تقریبات مکمل ہونے کے بعد رانی، مندر کے سامنے اس مقصد کے لیے بنائے گئے بلند چبوترے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے بھی گیروے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جسم کے گرد چادر لپیٹی ہوئی تھی جب کہ آنکھوں کے سوا اس کا سارا چہرہ نقاب میں پوشیدہ تھا۔

''جھانسی کے غیرت مند شہریو! آپ کی رانی آپ سے مخاطب ہے۔'' لکشمی بائی کی سریلی لیکن کھنک دار آواز بلند ہوئی تو مجمع پر مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔ ''آپ جانتے ہیں کہ ہم پچھلے گیارہ سال سے اس ریاست کے دکھ درد میں آپ کے شریک ہیں۔ گیارہ سال پہلے ہم نے آپ کے ساتھ جینے اور مرنے کے سفر کا آغاز اسی مندر سے کیا تھا اور آج یہیں سے ہم آپ کو راجہ صاحب کی جانب سے ایک اور خوش خبری دینے جا رہے ہیں۔'' رانی نے چند ثانیے توقف کیا لیکن پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ''راجہ صاحب کی خواہش تھی کہ بذات خود آپ سے مخاطب ہوتے لیکن افسوس کہ ان کی صحت اب اس قابل نہیں رہی لہٰذا یہ ذمہ داری انہوں نے ہمیں سونپی ہے کہ ہم آج جھانسی کے قانونی وارث اور ان کے جانشین کے طور پر راج کمار دامودھر راؤ کے نام کا اعلان کریں اور ساتھ ہی آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ اگر راجکمار کے بالغ ہونے سے پہلے راجہ صاحب ہمارے درمیان موجود نہ رہے تو ہم راج کمار کے بالغ ہونے تک ان کی نمائندہ اور جھانسی کی قائم مقام حکمران کے فرائض انجام دیں گے..... کیا آپ راج کمار کو راجہ گنگا دھر راؤ کا قانونی و جائز وارث اور ہمیں اپنی قائم مقام حکمران تسلیم کرنے کو تیار ہیں..... ہم وعدہ

کرتے ہیں کہ.....''

لیکن رانی کے باقی الفاظ ہجوم کی جانب سے ''منظور ہے.....'' ''قبول ہے'' .....

''مبارک ہو'' کے نعروں اور صداؤں میں دب کر رہ گئے۔ یوں راجہ گنگا دھر راؤ اور رانی لکشمی بائی نے اپنے جانشین کے لیے عوامی حمایت حاصل کر لی لیکن اصل مرحلہ ابھی باقی تھا جو سب سے زیادہ کٹھن، دشوار اور بہ ظاہر ناممکن تھا۔

یہ مرحلہ تھا، لارڈ ڈلہوزی، گورنر جنرل ہندوستان سے اپنے لے پالک اور متبنیٰ بیٹے کو بطور ولی عہد اور جھانسی کے قانونی وارث ہونے کی اجازت طلب کرنا۔

راجہ گنگا دھر راؤ نے اپنی جانب سے اس میں کوئی تاخیر نہیں کی اور مذہبی تقریبات ختم ہونے کے ایک ہفتہ بعد ہی اس نے شاہی وثیقہ نویس کو طلب کر لیا تا کہ وہ خط لکھوا سکے جو لارڈ ڈلہوزی کو اس سلسلے میں بھیجا جانا تھا۔ رانی کے مشورے پر خط میں ملکہ وکٹوریہ کو مخاطب کیا گیا تھا حالانکہ اس بات کا اسے بھی علم تھا کہ اجازت لارڈ ڈلہوزی نے دینی ہے اور یہ خط اسی تک محدود رہے گا لیکن جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ اگر خط ملکہ وکٹوریہ تک پہنچ گیا تو شاید عورت ہونے کے ناتے وہ اس پر ہمدردانہ غور کرے۔

راجہ نے رانی کے کہنے پر خط ملکہ وکٹوریہ کے نام ہی لکھوایا تھا۔

خط کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

''عزت مآب الیگزنیڈرینا وکٹوریہ آف انگلینڈ

ملکہ عالیہ عظیم ترین برطانیہ و ملکہ معظمہ ہندوستان و دیگر مقبوضہ جات۔

بھگوان آپ کے اقتدار کا سورج ہمیشہ سربلند رکھے اور عظیم تر سلطنت برطانیہ کا پرچم پرتھوی کے چاروں اور اسی آب و تاب سے ہمیشہ لہراتا رہے۔ ہماری پرارتھنا ہے کہ بھگوان آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے۔

ہم آپ کی وسیع و عریض سلطنت کی دست نگر ایک چھوٹی سی ریاست جھانسی (ہندوستان) کے حکمران ہیں۔ ہم اپنی پرجا کے راجہ لیکن آپ کے داس ہیں۔ ہم نے 1838ء میں جھانسی کا اقتدار سنبھالا تو ملکہ عالیہ کی مہربانیوں کے طفیل ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ نے ہمیں جھانسی کا راجہ تسلیم کر لیا اور تب سے ہم کمپنی کے وفادار ہیں۔ ہمارے کمپنی کے ساتھ دو معاہدے بھی موجود ہیں

جن کی رو سے ہم ہر وقت کمپنی کی مالی، مادی اور فوجی مدد کرنے اور وارث و جانشین نامزد کرنے کے لیے اس کی اعلیٰ انتظامیہ سے مشاورت اور منظوری لینے کے پابند ہیں۔

جھانسی میں باقاعدہ برطانوی فوج کی ایک چھاؤنی قائم ہے جس پر اٹھنے والے تمام تر اخراجات جھانسی اپنے وسائل سے پورا کرتا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہاں مقیم اپنے انگریز آقاؤں کی خدمت وسیوا میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

ہم نے 1842ء میں کاشی کی رہنے والی مانی کارنیک سے دوسری شادی کی جو اس وقت لکشمی بائی کے نام سے ہماری رانی ہیں۔ اس نے نو سال بعد 1851ء میں ایک بیٹے کو جنم دیا۔ ہمیں خوشی تھی کہ ہمیں وارث اور جھانسی کو اس کا نیا حکمران مل گیا ہے جو کمپنی انتظامیہ کی منظوری کے بعد ہمارے مرنے پر جھانسی کا تخت سنبھال لے گا۔

لیکن تقدیر نے ہمارے ساتھ عجب کھیل کھیلا کہ ہم سن رسیدہ ہونے کے باوجود زندہ رہ گئے اور وہ جس نے ابھی دنیا کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہ تھا، پھر اپنے مالک کے واپس چلا گیا۔

اور اب ہم اس قدر عمر رسیدہ ہیں کہ جھانسی کا نیا وارث پیدا کرنے کے قابل نہیں رہ گئے

کچھ عرصہ پہلے ہمیں گورنر جنرل ہندوستان لارڈ ڈلہوزی کے یہ احکامات موصول ہوئے تھے جس میں انہوں نے واضح کیا تھا کہ اگر کوئی مقامی حکمران نرینہ اولاد چھوڑے بغیر مر جاتا ہے تو اس کے اہل خانہ میں سے کوئی اور ریاست کی گدی نہ سنبھال سکے گا حتیٰ کہ راجہ کے لے پالک یا متبنیٰ کو بھی یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ آئندہ حکمران بن سکے بلکہ آنجہانی راجہ کے تمام خاندان کو پنشن دے کر راج نیتی سے مکمل طور پر علیحدہ کر دیا جائے گا۔

ہمیں ان احکامات پر کوئی اعتراض ہے نہ ان سے انکار لیکن آپ کی رعایا ہونے کے ناتے ہم آپ سے درخواست گزار ہیں کہ ہمیں ان سے مستثنیٰ قرار دیا جائے کیونکہ ہم روز اول سے آپ کے وفادار اور کمپنی کے احکامات کے پابند ہیں۔

ہماری جواں سال رانی دوسری بار ماں نہیں بن سکیں چنانچہ ہم نے اپنی برادری کے ایک چار سالہ بچے آنند راؤ کو گود لیا ہے اور باقاعدہ ہندووانہ رسومات اور مذہبی تقاضہ جات کی ادائیگی کے بعد اسے دامودھر کا نیا نام اور اپنی پہچان دی ہے۔ آپ سے ہماری بنتی ہے کہ ہمارے اس متبنیٰ بیٹے کو ہمارے بعد ہمارا قانونی وارث، جانشین اور جھانسی کا آئندہ راجہ بننے کی اجازت مرحمت فرمائی

جائے۔

ہم عمر کے آخری حصے میں ہیں اور جانتے ہیں کہ زیادہ عرصہ جئیں گے نہیں لیکن ہماری رانی لکشمی بائی ابھی صرف اٹھارہ برس کی ہیں اس لیے ہم یہ درخواست بھی کرتے ہیں کہ راج کمار دامو دھر کو جھانسی کا آئندہ راجہ تسلیم کیے جانے کی صورت میں رانی لکشمی بائی کو نابالغ راجہ کی نمائندہ کے طور پر حکومت کرنے کی اجازت دی جائے۔ جیسے ہی راج کمار دامودھر بالغ ہوں گے، رانی لکشمی بائی اقتدار سے خود بخود کنارہ کش ہو جائیں گی۔

ہم جانتے ہیں کہ عظیم تر سلطنت برطانیہ میں جھانسی کی حیثیت ایک معمولی سے ذرے سے زیادہ نہ ہوگی اور اگر ہمیں یہ خصوصی اجازت مرحمت دی جائے گی تو اس سے آپ کی دریا دلی اور فیاضی میں تو اضافہ ہوگا ہی لیکن برطانوی راج کے اقتدار بالا کو کوئی خطرہ لاحق ہوگا نہ پریشانی۔

جھانسی ہمیں بخش دینے سے عظیم تر برطانیہ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئے گی لیکن ہمارا نام جھانسی کی تاریخ میں زندہ رہ جائے گا۔

ہمیں امید ہے کہ آپ ایسٹ انڈیا کمپنی اور جھانسی کے ماضی کے مثالی اور دوستانہ تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری اس درخواست کو مرنے والے شخص کی آخری آرزو سمجھ کر ضرور پورا کریں گی۔

ہم ایک بار پھر اپنی رانی اور راجکمار کی جانب سے ہمیشہ آپ کا اور سلطنت برطانیہ کا وفادار رہنے کی یقین دہانی کراتے ہیں۔

آپ کا وفادار غلام
گنگا دھر راؤ
راجہ جھانسی

خط لکھواتے ہوئے راجہ گنگا دھر کی آنکھوں میں کئی بار آنسو آئے اور درجنوں مرتبہ اس کا لہجہ بھرایا کیونکہ آج زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے مقام سے گر کر کسی سے کوئی درخواست کی تھی۔ شاہی وثیقہ نویس کی حالت بھی راجہ سے مختلف نہ تھی۔ وہ تو کئی مقامات پر قلم کاغذ چھوڑ کر رونے بیٹھ گیا تھا۔ متعدد بار اس کے آنسو اس کاغذ پر گرے جس پر خط تحریر کیا جا رہا تھا چنانچہ اسے نئے سرے سے عبارت لکھنی پڑی۔

راجہ نے خط مکمل ہونے کے بعد رانی کو بلا بھیجا تا کہ وہ بھی اس تحریر کو پڑھ سکے۔ اس نے ضد کی تھی کہ وہ خط لکھواتے ہوئے راجہ کے قریب رہے گی لیکن راجہ نے اس سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائے گی اور یہ ذلت آمیز تحریر اس سے برداشت نہ ہو سکے گی۔

رانی نے خط پڑھنا شروع کیا تو پہلے ہی مرحلے پر اس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ اس نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ اس کے شوہر کو اس طرح التجائیں اور منتیں کرنا ہوں گی۔ اس نے اپنے آنسو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن تحریر کا ہر لفظ اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں جیسے تیروں کی طرح اترتا جا رہا تھا۔ جب خط ختم ہوا تو رانی باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''ہم نے ایسا تو نہیں چاہا تھا مہاراج۔'' وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ پائی۔ ''ہمیں ایسی سلطنت اور حکومت قطعاً نہیں چاہئے جس کے عوض آپ کی عزت گروی رکھی جائے۔''

جواب میں راجہ اسے گلے لگا کر اس کے بال سہلاتا رہا اور اسے تسلیاں دیتا رہا کہ یہ سب عارضی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ اپنی رانی سے جھوٹ بول رہا ہے لیکن وہ اس کے سوا کر بھی کیا کر سکتا تھا۔

''ہم اس خط کو انگریزوں کے حوالے نہیں کریں گے۔'' رانی پرعزم لہجے میں بولی۔

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، جان من!'' راجہ نے اس کے گال تھپتھپائے۔

''مگر اس قدر ذلت آمیز انداز ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔'' رانی نے آنکھوں سے آنسو خشک کرتے ہوئے احتجاج کیا۔

''بھگوان نے ہمارے بھوشر میں یہی لکھا تھا رانی۔'' اس نے لکشمی کو چلمن کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا اور خادم کو حکم دیا کہ دیوان خاص کو بلایا جائے۔ ذرا ہی دیر میں رام چندر راؤ دیش مکھ اس کی خدمت میں حاضر تھا۔

''ہم میجر ایلس سے ملنا چاہتے ہیں، رام چندر جی!'' راجہ نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ''انہیں پیغام بھجواؤ کہ ہم کل صبح دس بجے راج محل کے مہمان خانے میں ان کا انتظار کریں گے۔'' راجہ کا اشارہ جھانسی میں موجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے اور برطانوی افواج کے کمپنی کمانڈر کی جانب تھا۔

''جو حکم میرے آقا!'' رام چندر راؤ نے سر جھکا کر راجہ کو تعظیم دی اور حسب معمول کوئی سوال کیے بغیر الٹے قدموں واپس ہو گیا۔

میجر ایلس اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ مقررہ وقت پر راج محل پہنچ گیا۔ محافظ محل کی ڈیوڑھی میں رک گئے اور میجر ایلس تنہا مہمان خانے میں داخل ہوا جہاں جھانسی کا راجہ گنگا دھر راؤ اکیلا اس کا منتظر تھا۔ اس نے ایک دیوان پر رکھے نرم و گداز تکیے کا سہارا لے رکھا تھا جب کہ چہرہ یوں سرخ ہو رہا تھا جیسے سارے جسم کا خون اس میں امڈ آیا ہو۔ اس کی آنکھیں ویران اور ہونٹ خشک تھے۔ اور وہ شکل سے ہی برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ پردے کے عقب میں موجود رانی اس کی ایک ایک حرکت کی نگراں تھی۔

''ہم معذرت خواہ ہیں، میجر صاحب کہ اٹھ کر آپ کا استقبال کرنے سے قاصر ہیں۔'' راجہ نے نقاہت بھرے انداز میں بمشکل اس سے ہاتھ ملایا۔

''اٹس ناٹ اے میٹر آف آنر سر!'' میجر نے ایڑیاں بجا کر جھانسی کے فرمانروا کو سیلوٹ کیا۔ ''وی نو ایچ اینڈ ایوری رپورٹ اباؤٹ یور ہیلتھ سر..... یو آر سیریسلی ال اینڈ وی ڈونٹ وانٹ ٹو ڈسٹرب یو۔''

(یہ میرے لیے انا کا کوئی مسئلہ نہیں سر! ہم آپ کی صحت کے بارے میں ہر ایک بات سے آگاہ ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ آپ شدید بیمار ہیں، اس لیے آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے)۔

''میں نے آپ کو ایک خاص مطلب کے لیے زحمت دی ہے، میجر صاحب۔'' راجہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''آئی ایم آل ویز ایٹ یور سروس، سر!''

(میں ہمیشہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں)

اسی لمحے اندرونی دروازے سے چند خدام اندر داخل ہوئے جن کے ہاتھوں میں کھانے پینے کے مختلف لوازمات اور مشروبات کے گلاس تھے۔ انہوں نے یہ چیزیں میز پر سجائیں اور واپسی کے لیے پلٹ پڑے۔ راجہ اور میجر ایلس نے ان کی موجودگی میں کسی گفتگو سے گریز کیا تھا۔

جب وہ دونوں تنہا رہ گئے تو راجہ نے اپنے پہلو میں رکھا ہوا سربمہر لفافہ اٹھا کر میجر ایلس کے حوالے کیا۔ لفافے پر جھانسی کا شاہی نشان واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

''واٹ از دس سر؟'' میجر ایلس نے سوال کیا۔

(یہ کیا ہے سر؟)

''یہ..... یہ..... ملکہ عالیہ..... کے نام ایک خط ہے میجر صاحب!'' الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی راجہ گنگا دھر بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔'' آپ..... سے درخواست ہے..... کہ اس لفافے کو گورنر جنرل تک پہنچا دیا جائے۔''

''یووش از مائی کمانڈ سر!'' میجر ایلس نے جواب دیا

(آپ کا حکم سر آنکھوں پر جناب عالی!)

اچانک ہی پردے کے عقب سے رانی لکشمی بائی کی سسکیاں اور ہچکیاں بلند ہوئیں تو میجر ایلس چونک اٹھا۔'' ہواز دیئر سر!'' اس نے سوال کیا۔

(وہاں کون ہے، جناب عالی!)

''ہماری رانی ہے، میجر صاحب!'' شدت جذبات سے راجہ نیم بے ہوش ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ دیوان سے نیچے گرتا، عقبی پردہ اٹھا اور چادر میں لپٹی ایک نوجوان دوشیزہ، جس کی صرف آنکھیں ہی نقاب سے دکھائی دے رہی تھیں، بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نکلی اور راجہ کو اپنی بانہوں میں سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔

میجر ایلس بھی اس غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ بھی ہڑبڑاہٹ میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ نقاب پوش حسینہ کی جانب ڈالی اور لمحے بھر میں ہی اسے اندازہ ہو گیا وہ جو کوئی بھی ہے، بلا کی خوبصورت ہے۔

''یہ ہماری رانی ہے، میجر صاحب!'' راجہ گنگا دھر نے آنسوؤں کی جھڑی کے دوران اسے بتایا۔ نقاب پوش رانی کی آنکھوں سے بھی آنسو بہ رہے تھے لیکن وہ اپنے شوہر کو سنبھالنے میں مصروف تھی۔

''ویل!'' میجر ایلس صرف اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ اس کی نگاہیں اب فرش پر گڑی ہوئی تھیں کیونکہ انگریز ہونے کے باوجود وہ مشرقی اور خصوصاً شاہی رسم و رواج سے بخوبی واقف تھا۔

''ہماری رانی ایک عورت ہے، میجر صاحب لیکن اس میں ایسی صلاحیتیں موجود ہیں جنہیں عمر رسیدہ لوگ بھی سراہے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔'' راجہ کے آنسو کسی طرح تھمنے میں نہیں آ رہے تھے

۔''ہمارا یہ خط جلد از جلد گورنر جنرل کو پہنچا دیجئے گا۔''

''آئی ول ٹرائی مائی لیول بیسٹ می لارڈ!''

(میں اپنی پوری کوشش کروں گا، سر!)

''اور آپ سے مودبانہ درخواست ہے کہ کسی بھی حالت میں ہمارے جھانسی کو یتیم نہ ہونے دیجئے گا۔'' راجہ نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ رانی نے بڑھ کر نقاب میں پوشیدہ ہونٹ اپنے شوہر کے ہاتھوں پر رکھ دیئے اور زار و قطار رونے لگی۔

میجر ایلس اس جذباتی صورت حال سے پریشان ہو گیا۔ اس نے آج پہلی مرتبہ کسی ریاست کے حکمران کو اس طرح گڑگڑاتے اور روتے دیکھا تھا۔ اسے یہ احساس تو ہو گیا تھا کہ ریاستوں کے حکمران انگریزوں کے سامنے کس قدر مجبور اور لاچار ہیں لیکن راجہ گنگا دھر پر اسے واقعی ترس آ رہا تھا۔

''اور یہ کوشش بھی کیجئے گا، میجر صاحب کہ اس خط کا جواب جلد از جلد آ جائے''۔ راجہ نے آخری درخواست کی۔

میجر نے محض سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ شاید اسے اپنے اظہار مدعا کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل پائے تھے لیکن جب راجہ نے دوبارہ اپنی درخواست دہرائی تو اس نے کہا ''آئی ول ڈو سر!'' اور ساتھ ہی رخصتی کی اجازت چاہی۔

میجر ایلس خط لے کر چلا گیا۔

راجہ کو امید تھی کہ خط کا جواب جلد آ جائے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا.....۔

اور خط کا جواب آنے سے پہلے ملک الموت آ گیا۔

یوں میجر ایلس سے ملاقات کے چند روز بعد ہی 21 نومبر 1853ء کو گنگا دھر راؤ کا دیہانت ہو گیا اور اٹھارہ سالہ ناتجربہ کار لکشمی بائی بیوہ ہو گئی۔

ایک ہندو عورت ..... وہ بھی اس قدر نوجوان اور بیوہ ..... رسم و رواج کے کئی بندھنوں میں جکڑی ہوئی بے بس اور لاچار لکشمی بائی ..... جس کے کندھوں پر ایک ایسی

ریاست کا بوجھ بھی تھا جو ہر طرف سے غیر محفوظ تھی۔ ایک طرف ہندوستان کا گورنر جنرل ڈلہوزی تھا جو ریاست پر دانت جمائے بیٹھا تھا اور دوسری طرف ننھا دامودھر تھا جسے ابھی اس کی گود اور بانہوں کی ضرورت تھی۔

ایسے میں لکشمی بائی کی بے بسی کا محض اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا کیونکہ اس کے سامنے لامحدود مسائل، لامتناہی معاملات اور غم واندوہ کے بلند و بالا پہاڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

آنسوؤں اور ہچکیوں میں ڈوبی لکشمی بائی نے اپنے شوہر کی موت پر ریاست میں چالیس روزہ سوگ کا اعلان کیا۔ راجہ کی آخری رسومات اس کی موت کے تیسرے دن ادا کی گئیں جس میں ہمسایہ اور دور دراز ریاستوں ور جواڑوں کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کے علاوہ کلکتہ سے آنے والے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خصوصی نمائندے نے بھی شرکت کی۔

راج کمار دامودھر نے، راجہ گنگا دھر راؤ کے جانشین اور بیٹے کے حیثیت سے چتا کو آگ لگائی تو پورا جھانسی بلک اٹھا۔ رانی لکشمی کی جوان آرزوئیں اور بہت سی تشنہ کام خواہشیں بھی راجہ کی چتا کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئیں۔

آخری رسومات میں شرکت کے لیے آنے والے کم وبیش تمام افراد نے راج محل میں رانی سے تعزیت کا اظہار کیا۔ رانی اس کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ اس کے آنسو اور ہچکیاں کسی طور پر تھمتی ہی نہ تھیں اور وہ اس قابل نہ تھی کہ کسی سے کوئی گفتگو کر سکتی۔

رام چندر راؤ دیش مکھ۔ دیوان رگھوناتھ سنگھ۔ غلام غوث خان اور راجہ کے دوسرے وفادار امراء نے بہ وقت تمام رانی کو ان ملاقاتوں کے لیے رضامند کیا۔

دربار خاص کے وسیع وعریض اور عالی شان ہال کو ہنگامی بنیادوں پر نئے سرے سے آراستہ کیا گیا اور اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے درمیان میں ہاتھی دانت سے تراشا ہوا ایک مہین اور نفیس پردہ لٹکا دیا گا تا کہ رانی پردے کے عقب میں بیٹھ کر آنے والے وفود سے ملاقات کر سکے۔ انہوں نے یہ کوشش بھی کی کہ راجہ کا تخت بھی پردے کے پیچھے پہنچا دیا جائے جسے رانی اپنی نشست کے لیے استعمال کرے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اپنے آنجہانی شوہر کے تخت پر بیٹھنے کا حق نہیں رکھتی۔ تخت وہیں رہے گا جہاں پہلے تھا اور اس پر راجہ دامودھر بیٹھے گا۔ خود رانی کے لیے پردے کے عقب میں ایک جھولا نصب کر دیا گیا تھا جسے اس کی خادمائیں آہستہ آہستہ ہلکورے دیتی رہتیں۔

تعزیت کے لیے آنے والوں کی نشستوں کا انتظام پردے کے ساتھ کیا گیا۔ وفود کے ساتھ عام طور پر رام چندراؤ دیش مکھ یا غلام غوث خان موجود رہتے اور وہی ان کے اور رانی کے درمیان بالواسطہ گفتگو کا فریضہ انجام دیتے کیونکہ پردے کے عقب سے سوائے آہوں اور سسکیوں کے، کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

انگریزی سرکار کا نمائندہ بھی رانی سے رسمی تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو پہلی بار اہل دربار نے رانی کی کپکپاتی، لرزتی آواز سنی۔

''ہمارے آنجہانی شوہر نے گورنر جنرل ہندوستان کو اپنے جانشین کے حوالے سے ایک خط تحریر کیا تھا۔'' رانی نے نہایت مدہم اور ٹھہرے ہوئے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ''ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس خط کی بابت کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟''

''وہ خط گورنر جنرل کو موصول ہو گیا ہے، ہر ہرائی نیس۔'' انگریز نمائندے نے جواب دیا۔ ''لیکن شاید ابھی تک اس پر کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔''

''کیا ہم جان سکتے ہیں کہ گورنر جنرل کب تک ہمیں اس بارے میں آگاہ کریں گے؟'' رانی نے دوسرا سوال کیا۔

''مجھے افسوس ہے، ہر ہائی نیس'' نمائندے نے جواب دیا۔ ''میں اس بارے میں قطعی لاعلم ہوں کہ محترم گورنر جنرل کا فیصلہ کب تک متوقع ہے۔''

''تو کیا ہمیں گورنر جنرل کو یاد دہانی کے لیے ایک اور خط تحریر کرنا ہوگا؟'' رانی نے پوچھا۔ ''وہ خط ہمارے آنجہانی شوہر نے لکھا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔'' ساتھ ہی رانی کی سسکیاں دربار میں گونجنے لگیں۔

''اس معاملے میں ہر ہائی نیس با اختیار ہیں۔'' انگریز نمائندے نے جواب دیا۔ ''لیکن میرے خیال میں ایسا کرنا کچھ غیر مناسب بھی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' رانی کی آواز سنائی دی۔ ''آپ جا سکتے ہیں۔''

اس کے بعد بھی رانی سے کئی وفود نے ملاقات کی جن میں امراء اور رؤسا سے لے کر جھانسی کے عام لیکن وفادار باشندے بھی شامل تھے لیکن اس کی ہر ملاقات آہوں اور سسکیوں پر ہی انجام پذیر ہوتی۔

رام چندر اور دیگر امراء رانی کو بہتیرے دلاسے دیتے لیکن وہاں قرار کسے تھا کہ ان کی نصیحتوں اور مشوروں پر دھیان دیا جاسکتا۔

راجہ کے دیہانت کے اکتالیسویں روز رانی نے باقاعدہ دربار کے انعقاد کا اعلان کیا اور پہلی کارروائی کے طور پر لارڈ ڈلہوزی کے نام، دامودھر کے لیے مہاراجہ کی نمائندگی کی توثیق کے لیے خط تحریر کرایا جیسے حسب سابق جھانسی میں موجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے میجر ایلس کے حوالے کیا گیا۔

لیکن اس خط کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔

وقت کے مرہم نے رانی کے زخموں کو مندمل کرنا شروع کیا تو اس نے ریاستی امور کی جانب توجہ کا آغاز کیا جو قریباً ڈیڑھ ماہ سے زیر التوا تھے۔ جھانسی کے عوام چونکہ دل و جان سے اسے اپنی حکمران تسلیم کرتے تھے اس لیے اسے ریاستی امور اور درباری معاملات نمٹانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ رانی اپنے اصل مقصد کو نہیں بھولی۔ وہ گاہے بگاہے مہاراجہ کی نمائندگی کی توثیق کے لیے لارڈ ڈلہوزی کے نام مکتوب روانہ کرتی رہی مگر تین ماہ گزرنے کے باوجود بھی ان کا کوئی جواب نہ آیا۔

اور بالآخر مارچ 1854ء کے ایک بدقسمت دن ڈلہوزی کے احکامات موصول ہو گئے۔

احکامات ایک خط کی صورت میں تھے جو سربمہر لفافے میں تھا۔ ڈلہوزی کا خصوصی نمائندہ اس لفافے کو لے کر ذاتی طور پر رانی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ پہلے رانی نے چاہا کہ اس سے دربار عام میں ملاقات کی جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا اور نمائندے کو علیحدگی میں طلب کیا۔

''میں گورنر جنرل کے احکامات لے کر حاضر ہوا ہوں، ہر ہائی نیس۔'' نمائندے نے پردے کے عقب میں بیٹھی انجانی ہستی کو مخاطب کیا جس کا صرف اس نے نام اور حسن کی شہرت سن رکھی تھی۔

''ہمیں علم ہے۔'' رانی کی نقرئی آواز بلند ہوئی۔ ''ہم ان احکامات کے طویل عرصے سے منتظر ہیں..... لہٰذا اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ہم یہ حکم نامہ آپ کی زبانی ہی سننا چاہیں گے۔''

''جو حکم، ہر ہائی نیس۔'' نمائندے نے کہا اور ہاتھ میں پکڑا لفافہ چاک کر کے سفید رنگ کا ایک کاغذ نکال لیا جس پر ہاتھ سے انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

''اجازت ہو تو میں یہ مختصر سی تحریر پڑھ دوں، ہر ہائی نیس'' اس نے پوچھا

''اجازت ہے۔''

''خط، گورنر جنرل ہندوستان لارڈ ڈلہوزی کی جانب سے جھانسی کی رانی لکشمی بائی کے نام تحریر کیا گیا ہے۔'' انگریز نمائندے نے اسے بتایا۔ ''اس میں تحریر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی، آنجہانی مہاراجہ گنگا دھر راؤ کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی کہ وہ اپنے حقیقی بیٹے کے علاوہ کسی اور لڑکے کو اپنا وارث بنا سکے۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ جھانسی کو برطانوی صوبوں کے ساتھ ضم کر دیا جائے۔'' نمائندے نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس لیے ہر ہائی نیس کو حکم دیا جاتا ہے کہ جھانسی کا قلعہ (ٹاؤن فورٹ) خالی کر دیں اور شہر میں واقع رانی محل منتقل ہو جائیں انہیں انگریز سرکار کی جانب سے ماہانہ پانچ ہزار روپے بطور پنشن ادا کیے جائیں گے''۔

رانی گنگ رہ گئی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے خوابوں اور خواہشوں کا محل یوں چکنا چور ہو جائے گا۔ کئی لمحے تو اسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا لیکن حقیقت وہی تھی جو خط میں بیان کی جا چکی تھی۔

''اگر ہم ان احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں تو.....؟'' رانی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تو اسے بغاوت تصور کیا جائیگا۔'' انگریزی نمائندے نے جواب دیا۔ ''جھانسی کے ساتھ اب تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام معاہدے منسوخ کر دیئے جائیں گے اور جھانسی کو دشمن ریاست قرار دے کر اس پر حملہ کر دیا جائے گا۔''

''جھانسی کے پاس اپنی فوج ہے۔'' رانی پر عزم لہجے میں بولی۔ ''اور ہم انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی پوری استطاعت رکھتے ہیں۔''

انگریز نمائندہ زیر لب مسکرایا۔ ''میری یہ مجال نہیں کہ میں ہر ہائی نیس کے دعوے کی تردید کر

سکوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جھانسی کی فوجیں، انگریزوں کا مقابلہ ضرور کر سکتی ہیں لیکن ان کے خلاف فتح یاب نہیں ہو سکتیں۔''

رانی کو یہ سمجھنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی کہ جھانسی جیسی ایک چھوٹی ریاست کے لیے برطانوی عفریتوں اور ان کی مکاریوں و چالاکیوں کا مقابلہ کرنا کس قدر مشکل کام ہوگا کیونکہ اسے علم تھا کہ مرہٹوں کا پیشوا ان کے سامنے سر جھکاتا ہے اور دہلی کے بادشاہ بھی گھٹنوں کے بل جھک کر ان کی تعظیم بجالاتے ہیں۔

رانی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''ہمیں قلعہ سے رانی محل منتقل ہونے کے لیے کتنی مہلت دی گئی ہے؟'' اس نے نمائندے سے سوال کیا۔

''خط میں مدت کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، ہر ہائی نیس۔'' انگریز نمائندے نے جواب دیا۔'' اس سلسلے میں میجر ایلس کو علیحدہ سے احکامات موصول ہوئے ہیں کیونکہ وہی جھانسی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے ہیں، لہٰذا جھانسی کا انتظام وانصرام بدستور انہی کے پاس رہے گا۔''

''اور.....ہم.....'' رانی نے جملہ شروع کیا لیکن انگریز نمائندے کی مداخلت سے ادھورا رہ گیا۔

''آپ کے انتظامی اختیارات آج سے سلب کیے جا رہے ہیں، ہر ہائی نیس۔'' انگریز نمائندے نے گویا جھانسی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ ''کسی بھی قسم کی مزاحمت کے خطرے کے پیش نظر جھانسی چھاؤنی میں موجود سپاہیوں کے علاوہ گرانڈ ٹرنگ روڈ سے دس ہزار برطانوی سپاہ کی پیش قدمی شروع ہو چکی تھی لہٰذا آپ کی جانب سے کسی بھی منفی ردعمل کی صورت میں جھانسی پر حملے میں دیر نہیں کی جائے گی۔''

''نہیں.....ناممکن.....'' رانی چلا اٹھی۔ ''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے'' وہ جذباتی انداز میں بول رہی تھی ''.....لیکن ڈلہوزی کو بتا دینا کہ ہم اپنے جھانسی سے دست بردار نہیں ہوں گے۔''

جھانسی کی رانی لکشمی بائی کا یہ جملہ تاریخ میں نقش ہو گیا لیکن وہ اپنے تمام تر عزم و حوصلے کے

باوجود جھانسی کو انگریزوں کے قبضے میں جانے سے نہ بچا سکی۔

◈ ◈ ◈

برطانویوں کی جانب سے ریاست کے انتظامی امور سلب کیے جانے کے بعد رانی کے معمولات بھی تبدیل ہو گئے۔ وہ انگریز نمائندے سے ملاقات کے اگلے روز میجر ایلس سے ملی اور قلعہ کی چابیاں اس کے حوالے کر کے شہر میں موجود رانی محل منتقل ہو گئی۔

اب رانی کی مصروفیات تبدیل ہو گئیں۔ وہ صبح چار بجے بیدار ہوتی اور آٹھ بجے تک اشنان ،عبادت اور استغراق میں مصروف رہتی۔ آٹھ بجے وہ گھڑ سواری کے لیے نکل جاتی۔ اس دوران وہ رائفل سے نشانہ بازی کے علاوہ تلوار بازی اور گھوڑے کی باگیں دانتوں مین تھام کر تیر اندازی کی مشق کرتی اور گیارہ بجے محل لوٹ آتی۔

اس کے بعد وہ دوبارہ غسل کرتی۔ پہلے بھوکوں اور محتاجوں کو کھانا دیتی اور پھر خود دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتی۔ شام کو وہ ہلکی پھلکی ورزش کرتی اور بعد ازاں مذہبی کتابوں کا خود مطالعہ کرتی یا مذہبی اشلوک پڑھتی۔ اس کے بعد وہ اپنے پسندیدہ دیوی یا دیوتا کی پوجا کرتی اور آخر میں رات کا کھانا کھاتی۔

رانی کے یہ تمام کام ایک خودکار نظام کی طرح اوقات کی سختی سے پابندی کے ساتھ بلاناغہ انجام پاتے۔

دوسری جانب انگریزوں کو جھانسی کے انتظامی اختیارات ملنے سے ریاست کے لوگ مسلسل ظلم وستم اور ناانصافی کا نشانہ بن رہے تھے۔ وہ چلتی پھرتی لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے جب کہ اصولی طور پر وہ انصاف کے متلاشی لیکن ناانصافی کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھے۔ ہر جانب لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ شہر اور اس کے قرب وجوار میں ہر وقت توپوں کے چلنے کے دھماکے سنائی دیتے رہتے۔

رانی ان دھماکوں کو خود بھی سنتی اور اس کے وفادار ساتھی اسے پل پل کی خبروں سے آگاہ بھی

رکھتے لیکن وہ سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔

اسے علم تھا کہ ایسے کئی اور راجے مہاراجے بھی تھے جو نرینہ اولادیں نہ ہونے کے باعث اپنی ریاستوں سے محروم ہو چکے تھے۔ ان کے اہل خانہ، ورثاء اور بے روزگار سپاہی ہر کوئی پریشان تھا۔ ایسے لاوارث لوگوں کے ہمدرد بھی دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔

اس دوران تانتیا توپ، رگھوناتھ سمہا، جواہر سمہا اور آزادی کے دیگر متوالوں نے رانی سے خفیہ ملاقاتیں بھی کیں۔ وہ جھانسی اور اہل جھانسی کے حالات پر کڑھتے اور عدم اطمینان کا اظہار کرتے۔ لیکن فی الحال رانی سمیت کسی کے پاس مزاحمت کا کوئی قابل عمل یا موثر طریقہ کار نہ تھا۔

یوں دن ہفتوں، ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلنے لگے۔

اس عرصے میں رانی نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی ریاست کا جغرافیائی محل وقوع، دفاعی مقامات اور برطانویوں کے خلاف اپنی سکھ فوجوں کے استعمال کے علاوہ ملک بھر کے عمومی سیاسی حالات اور بدلتے ہوئے ماحول کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔

وہ اس سلسلے میں کتابوں سے مدد لیتی، دور دور سے آئے ہوئے لوگوں سے غیر محسوس انداز میں سوالات کر کے اپنے علم میں اضافہ کرتی۔ شہر بھر میں اس کے جاسوس پھیلے ہوئے تھے جو ہر اجنبی سے اپنے مطلب کی بات اگلوا لیتے اور پھر وہ معلومات رانی تک پہنچنے میں دیر نہ لگتی۔

رانی کے مشاغل بدستور جاری تھے۔ جب وہ گھڑ سواری کے لیے باہر نکلتی تو مردانہ لباس اور بھیس میں ہوتی۔ سر پر ایک آہنی خود پہنتی، گھیر دار پگڑی باندھتی اور سینے پر حفاظتی دھاتی پلیٹ باندھتی۔ پردہ اس نے کسی حد تک ترک کر دیا تھا لیکن محل سے باہر اور بہ طور خاص گھڑ سواری کے لیے جاتے ہوئے وہ لازمی چادر اوڑھتی۔ وہ اپنے ذاتی دفاع سے کبھی غافل نہ ہوتی تھی۔ گھڑ سواری کے وقت اس کے دونوں پہلوؤں میں پستول ہوتے جب کہ ایک خنجر اور تلوار ہمیشہ اس کے پاس ہوتی۔ وہ بھیس بدلنے میں بھی ماہر تھی لہٰذا اسے روزانہ دیکھنے والا بھی، رانی لکشمی بائی کی حیثیت سے شناخت نہ کر سکتا تھا۔ سواری کے لیے وہ مختلف گھوڑے استعمال کرتی لیکن کشتواڑ کے بے داغ سفید گھوڑے اس کی کمزوری تھے اس لیے اکثر و بیشتر سواری کے لیے سفید گھوڑا ہی استعمال کرتی۔

رانی قلعہ چھوڑ آئی تھی۔ راجہ گنگا دھر کے ذاتی خزانے سمیت ریاست کے تمام تر وسائل بحق

سرکار ضبط کیے جا چکے تھے۔ انگریزوں نے اس سلسلے میں رانی سے کوئی رعایت نہ برتی تھی بلکہ اس کے ذاتی زیورات کو بھی جھانسی کی ملکیت قرار دے کر اپنے قبضے میں لے لیے گئے تھے۔

لیکن اس کے باوجود وہ اپنی ریاست کی رانی تھی کیونکہ جھانسی کا بچہ بچہ اسے دل و جان سے اپنی حکمران ملکہ تسلیم کرتا تھا۔

اب اس کا دربار قلعہ کے بجائے محل میں منعقد ہوتا۔ دور دور سے لوگ اپنے مسائل اور درخواستیں لے کر دربار میں حاضر ہوتے اور رانی اپنی صوابدید کے مطابق ان درخواستوں پر احکامات صادر کرتی اور انگریز انتظامیہ کو مجبور کرتی کہ وہ ان پر عمل کرے۔

ایک روز جب دربار برخواست ہونے کا گانگ بجا تو اس نے دیوان جواہر سنگھ کو رکنے کے لیے کہا۔ رام چندر راؤ دیش مکھ بھی موجود تھا۔

''مجھے آپ لوگوں سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' رانی بدستور جھولے پر بیٹھی ہلکورے لے رہی تھی لیکن اب اس کے اور دربار کے درمیان حائل پردہ اٹھایا جا چکا تھا۔

''ارشاد فرمایئے، مہارانی''۔ دونوں بیک زبان بول اٹھے۔ ''ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں''۔

''ہمارے بال بہت لمبے ہیں''۔ رانی نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ دیوان جواہر سنگھ اور رام چندر راؤ کے ذہن میں سنسناہٹ سی ہونے لگی لیکن دونوں مہر بہ لب تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رانی کی اس بات کا کیا جواب دیں۔

''کیوں، ہیں ناں؟'' رانی نے دوبارہ کہا۔ اب اس کا انداز سوالیہ تھا۔

''اگر مہارانی برا محسوس نہ کریں تو ہمیں کچھ کہنے کی اجازت ہے؟'' دیوان نے دونوں کی نمائندگی کی۔

''ہاں ہاں ..... کیوں نہیں''۔ رانی زیر لب مسکرائی۔ وہ بغور دونوں کے ہونق چہروں کا جائزہ لے رہی تھی اور ان کی متغیر حالت پر محظوظ ہو رہی تھی۔

''یہ لمبے اور گھنیرے بال ..... آپ کے حسن کا ایک حصہ ہیں''۔ دیوان نے اٹک کر جملہ مکمل کر دیا تو رانی نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

''آپ بھی کچھ بولیے، رام چندر جی!'' اس نے اپنے دوسرے مشیر کو مخاطب کیا۔

''مم.....میں کیا کہہ سکتا ہوں.....مہارانی''۔رام چندر راؤ دیش مکھ کے لہجے میں بھی لکنت تھی۔''دیوان صاحب'' درست کہتے ہیں''۔

رانی پھر ہنسی۔''میرا یہ مقصد نہیں تھا''۔اس نے نفی میں سر ہلایا۔''دراصل ان لمبے بالوں کی وجہ سے ہمیں گھڑ سواری کے وقت آہنی خود پہننے اور پگڑی باندھنے میں کافی زیادہ دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے''۔

''اوہ!'' رام چند کے حلق سے بے اختیار اطمینان کی ایک سانس خارج ہوئی۔انداز ایسا تھا جیسے سینے پر سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔

''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے بال ترشوالیں''۔رانی نے کہا تو دونوں آنکھیں پٹ پٹا کر رہ گئے۔''یوں بھی یہ ہم پر ایک قرض ہے جسے اب تک ادا نہیں کر سکے۔''

''کیسا قرض، مہارانی؟''۔رام چندر نے پوچھا۔

''ہم راجپوت ہیں'' رانی نے فخریہ انداز میں کہا۔''اور تم نہیں جانتے کہ مہاراشٹر میں بیوہ عورتیں اپنے سر منڈوا دیتی ہیں یا بال ترشوالیتی ہیں''۔

رام چندر راؤ اور دیوان جواہر سنگھ خاموش رہے۔ظاہر ہے کہ ان کے پاس رانی کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

''اصولی طور پر مہاراجہ کے دیہانت کے وقت ہی ہمیں ایسا کر لینا چاہیے تھا''۔رانی کی آنکھوں میں غم کے سائے اتر آئے۔''لیکن اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کاشی جا کر مہاراجہ کی آتما کی شانتی کے لیے سر کے بال ترشوالیں گے''۔

''کاشی جا کر.....؟'' رام چندر راؤ نے حیرت سے پوچھا۔''مگر اس کے لیے تو آپ کو انگریزوں سے اجازت لینا ہوگی''۔

''ہم جانتے ہیں''۔رانی نے گہرا سانس لیا۔''جھانسی کی حدود سے باہر قدم رکھنے کے لیے ہم گوروں کی اجازت کے محتاج ہیں''۔وہ دیوان جواہر سنگھ کی جانب متوجہ ہوئی۔''آپ کل ہی چھاؤنی جا کر میجر اسمتھ سے بات کریں تاکہ ہم جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہو سکیں''۔

''جی مہارانی'' دیوان نے سر جھکا دیا۔

لیکن اگلے روز رانی کو جو خبر ملی وہ اس کی توقعات کے برعکس تھی۔چھاؤنی کے مقامی افسروں

نے حفاظتی نقطہ نظر کے تحت ذاتی طور پر رانی کو جھانسی سے باہر جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا البتہ انہوں نے دیوان سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے طور پر گورنر جنرل کے دفتر پیغام بھجوا رہے ہیں۔ اگر وہاں سے اجازت مل گئی تو رانی، جھانسی کی حدود سے باہر نکلنے میں آزاد ہوں۔

مگر رانی کو علم تھا کہ یہ محض بہلاوا ہے۔

انگریز، رانی کی توقعات سے کہیں بڑھ کر چالاک تھے۔ ملکی حالات سے وہ بے خبر نہیں تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رانی، اپنے محل میں مقید ہونے کے باوجود بے انتہا اثر و رسوخ رکھتی ہے۔ وہ درحقیقت جھانسی سے نکل کر نہ صرف ملکی حالات سے باخبر ہونا چاہتی ہے بلکہ ممکن ہے کہ اس بہانے وہ ملک میں مزید ابتری پھیلانے کا سبب بھی بن جاتی۔

یہی سوچ کر انہوں نے رانی کو جھانسی تک ہی محدود رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

چند دن بعد ایک انگریز افسر نے رانی کے دربار میں حاضر ہو کر اسے باضابطہ طور پر اطلاع دی کہ گورنر جنرل نے بھی رانی کو سفر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔

''یہ کیسا ظلم ہے اور کیسی ناانصافی ہے کہ ہم اپنے ملک میں اجنبی ہیں''۔ وہ بری طرح طیش میں آ گئی۔ ''اور جو حقیقتاً اجنبی ہیں وہ اس ملک کے مالک بن بیٹھے ہیں''۔

انگریز افسر محض سر جھکا کر رہ گیا۔

''جاؤ اور اپنے آقاؤں سے کہہ دو کہ بہت جلد یہ سرزمین ان کے لیے تنگ ہو جائے گی''۔ رانی کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ ''ہم غلام ضرور ہیں لیکن غلامی کی زنجیروں کو توڑنا بھی جانتے ہیں۔ ہم اس ملک کے باسی ہیں، یہاں کے رہنے والے ہیں اور ہمیں آزاد زندگی گزارنے کا مکمل طور پر حق حاصل ہے''۔ رانی نے اپنی پشت پر لہراتے لمبے بال ہاتھ میں پکڑ لیے۔ ''ہم سوگند کھاتے ہیں کہ اب ہم اپنے بال صرف اس وقت ترشوائیں گے جب اپنا ملک آزاد کرا لیں گے بہ صورت دیگر یہ شمشان گھاٹ تک ہمارے ساتھ جائیں گے''۔

انگریز افسر کچھ کہے بغیر رانی کے دربار سے واپس آ گیا لیکن اس نے گورنر جنرل کو ملاقات کی جو رپورٹ بھجوائی اس میں واضح طور پر درج تھا کہ ہندوستان، بغاوت کی دہلیز پر کھڑا ہے اور اگر اس ملک میں بغاوت ہوئی تو جھانسی کی رانی اس میں مرکزی کردار ادا کرے گی۔

———◈◈◈———

گورنر جنرل کے دفتر میں اس رپورٹ کو نہایت سنجیدگی سے لیا گیا اور برطانوی وزیراعظم لارڈ پالمرسن کو بھی رانی کے بارے میں مکمل بریفنگ دی گئی چنانچہ اگلے ہی مہینے کلکتہ سے ایک کرنل، گورنر جنرل کے خصوصی نمائندے کے حیثیت سے رانی کے دربار میں آموجود ہوا۔

''کیوں آئے ہو؟'' رانی نے اپنے جھولے میں ہلکورے لیتے ہوئے بغیر کسی ادب، آداب یا خطاب کے کرنل کو نہایت کرختگی سے مخاطب کیا۔

''میں سرکار برطانیہ کی جانب سے آپ کے لیے نیک تمناؤں کا پیغام لایا ہوں''۔ کرنل نے تھوک نگلا۔ اسے توقع بھی نہیں تھی کہ اس قدر خوبصورت لڑکی اس کے ساتھ اتنی سختی کے ساتھ پیش آئے گی۔ یہ بات اس کے لیے یوں بھی حیرت انگیز تھی کہ اس وقت انگریز اس کے آقا اور وہ ان کی غلام تھی لیکن اس کا لہجہ اور طمطراق ان دونوں حقیقتوں کی صریحاً نفی کر رہے تھے۔

رانی نے کوئی جواب نہیں دیا تو کرنل نے اس کی خاموشی کو اذن اظہار سمجھ کر اپنی جھانسی آمد کے مقاصد بیان کرنا شروع کر دیئے۔ کرنل نے اسے تفصیل کے ساتھ ان عوامل کے بارے میں بتایا جو جھانسی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرکار کے درمیان وجہ تنازع بن گئے تھے۔ کرنل نے اسے آگاہ کیا کہ گزشتہ چار سالوں سے جھانسی کے مسائل ملکہ معظمہ کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ انہیں فوری طور پر حل کر دیا جائے۔

کرنل نے رانی کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر جھانسی اور تاج برطانیہ کے مابین مفاہمت ہو جائے تو انگریز اور وہ عرصہ دراز تک دوستوں کی مانند ہندوستان میں رہ سکیں گے۔

رانی اس تمام عرصے میں خاموشی کے ساتھ کرنل کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ کرنل کو خود بھی یہ احساس تھا کہ رانی نے اپنے چہرے سے کسی ردعمل کا اظہار نہ ہونے دیا تھا۔

کرنل خاموش ہوا تو رانی نے ایک طویل سانس لی۔ ''جھانسی میں اب تک جو کچھ ہو چکا ہے، کیا تم اس میں کوئی تبدیلی کرنے کا اختیار رکھتے ہو؟''

کرنل گڑبڑا گیا۔ شاید اسے توقع نہ تھی کہ رانی یوں براہ راست اس پر حملہ کرے گی ''مم ..... میں .....'' کرنل حقیقتاً بری طرح ہکلانے لگا۔ ''اپنی رپورٹ سے گورنر جنرل اور وزیراعظم برطانیہ دونوں کو آگاہ کروں گا''۔ اس کے بعد میں آپ کو..... ''

''تم گوری چمڑی والے خود کو کیا سمجھتے ہو کرنل؟'' وہ بھڑک اٹھی۔ ''کیا جھانسی کی رانی کے

پاس ان لغویات کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ ہمارے پاس بات چیت کے لیے اب کچھ نہیں۔ اگر تم لوگ جھانسی کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے میں سنجیدہ ہو تو جھانسی کا خزانہ بحال کیا جائے۔ ہمیں جھانسی کی رانی اور ہمارے بیٹے دامودھر کو ریاست کا جائز اور قانونی وارث تسلیم کیا جائے''۔

''مم.....میں آپ کے مطالبات حرف بہ حرف گورنر جنرل تک پہنچاؤں گا''۔ کرنل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اور کوشش کروں گا.....''

''اور تم اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہو''۔ رانی نے اس کا جملہ کاٹا اور جھولے سے اٹھ گئی۔ یہ ایک طرح سے ملاقات کے اختتام کا اعلان تھا لیکن انداز بے حد ذلت آمیز تھا۔

یوں رانی نے باضابطہ طور پر بغاوت کے آغاز سے قبل ہی انگریز سرکار کو اپنے باغی ہونے کا ثبوت دے دیا۔ انگریزوں نے رانی کے رویے کا جواب اس طرح دیا کہ میجر اسمتھ کو واپس بلا کر میجر اسکین کو جھانسی کا انچارج بنا دیا کیونکہ وہ اپنے پیشرو کی نسبت زیادہ سخت افسر سمجھا جاتا تھا۔

لیکن رانی کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

اس کے ذہن میں جو منصوبے تھے وہ ہر حال میں انہیں عملی جامہ پہنانے پر تلی بیٹھی تھی۔

اسے خبر ملی کہ نانا صاحب، راؤ صاحب، مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور نواب آف اودھ کے خیر خواہ اس سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ رانی خود بھی ان رہنماؤں سے رابطے کی خواہش مند تھی چنانچہ اس نے فوراً ہی انہیں جھانسی مدعو کرنے کا سبب پیدا کر لیا۔

انگریزوں نے اس کے جھانسی سے باہر جانے پر پابندی عائد کر رکھی تھی لیکن ابھی تک کسی کو اس کے پاس آنے سے نہیں روکا گیا تھا تاہم پھر بھی اس کے لیے اسے کسی ٹھوس جواز کی تلاش تھی۔

دامودھر عمر کے ساتویں سال میں قدم رکھ چکا تھا اور اب اسے ہندوانہ رسم کے مطابق مقدس دھاگہ باندھا جانا تھا۔ رانی اس رسم کو بڑے پیمانے پر منعقد کرنے کا سوچ رہی تھی تاکہ قرب و جوار اور دور دراز کے مہمانوں کو بلا روک ٹوک اس میں شرکت کے لیے مدعو کیا جا سکے۔

اسے توقع تھی کہ تقریب کی آڑ میں انہیں کھل کر تبادلہ خیال کا موقع مل جائے گا۔

دامودھر کے نام پر خزانے میں چھ لاکھ روپے جمع تھے لیکن خزانے پر انگریزوں کا قبضہ تھا چنانچہ رانی نے ریاست کے انگریز آفیسر انچارج میجر اسکین کو ایک تحریری درخواست بھیجی جس میں

اس تقریب کی اہمیت اور غرض و غایت کے ساتھ ساتھ خزانے سے ایک لاکھ روپے نکلوانے کی اجازت بھی طلب کی گئی تھی۔

دیوان جواہر سنگھ یہ درخواست لے کر چھاؤنی گیا لیکن خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

''میجر اسکین نے اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ مہارانی۔'' مارے ندامت کے اس کا سر نہیں اٹھ پا رہا تھا۔

''مگر کیوں؟'' رانی کسی شیرنی کی مانند دھاڑی۔ ''وہ خزانہ ہمارا ہے اور اس پر ہمارا پورا ادھیکار ہے''۔

''یہ آپ کی سوچ ہے مہارانی، انگریز کی نہیں''۔

''تو اب وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟'' رانی پر دیوانگی طاری تھی۔

''میجر اسکین کا کہنا ہے کہ دامودھر ابھی بچہ ہے، اگر چار افراد ضمانت دے دیں تو رقم ادا کر دی جائے گی''۔ دیوان نے آہستگی سے کہا۔

''تو کیا اس کے لیے ہماری درخواست کافی نہیں تھی''۔ مارے بے بسی کے، رانی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''اب ہمیں اپنا خزانہ استعمال کرنے کے لیے چار ضامنوں کا بندوبست بھی کرنا ہوگا''۔

خود دیوان جواہر سنگھ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس بوڑھے نے سات برس کی عمر سے اب تک لکشمی بائی کو خود مختار دیکھا تھا لیکن اب اسے کسی پالتو جانور کی طرح زنجیروں سے باندھ دیا گیا تھا۔

رانی کافی دیر بے بسی اور غیظ و غضب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کمرے میں ٹہلتی رہی۔ دیوان خاموشی سے اپنی باجبروت لیکن بے اختیار ملکہ کو دیکھتا رہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی جا کر میجر اسکین کو گولی مار دیتا اور خزانہ کا دروازہ توڑ کر ساری رقم لا کر رانی کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا۔

''ٹھیک ہے، دیوان جی!'' بالآخر رانی نے سکوت توڑا۔ ''چار ضامنوں کا بندوبست کیجیے ــــ ہمیں ہر حال میں رقم چاہیے''۔

''ٹھیک ہے، مہارانی''۔ دیوان جھکے سر کے ساتھ الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔

اس طرح رانی نے کسی نہ کسی طور اس توہین اور ذلت کا یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لیا اور رقم حاصل

کرلی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ صرف اسی مذہبی تقریب کو بہانہ بنا کر نہ صرف آنے والے رہنماؤں سے ملاقات کی جاسکتی ہے بلکہ ہندوستان کی آزادی کے لیے تحریک شروع کرنے کے حوالے سے بھی کوئی ٹھوس حکمت عملی اختیار کی جاسکتی ہے۔

اور رانی نے ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی اسے اپنی عزت و آبرو اور انا سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

تقریب واقعی ایک بہانہ تھی۔

اصل مقصد رہنماؤں کی آپس میں ملاقات اور کوئی مشترکہ لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ رانی کے وزیروں اور مشیروں نے ملاقات کے لیے سخت حفاظتی انتظامات کیے تھے اور ہر ممکن طریقے سے کوشش کی تھی کہ کوئی انگریز نواز یا انگریزوں کا کوئی جاسوس ملاقات کے کمرے یا محل کے اس حصے کے قریب بھی نہ پھٹک سکے جہاں یہ رہنما گفت وشنید میں مصروف تھے۔

ملاقاتی کمرے کے علاوہ پورے محل کی نگہداشت رانی کی خواتین محافظوں کے سپرد تھی جو رائفلوں، تلواروں اور خنجروں سے مسلح کسی بھی ناگہانی صورتحال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھیں۔ رانی کے چند ایک نہایت خاص مشیروں اور وزیروں کے سوا کسی بھی شخص کو اس طرف جانے کی اجازت نہ تھی جہاں ہندوستان کے ممتاز رہنما اس ملک کے آنے والوں دنوں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے میں مصروف تھے۔

تمام رہنماؤں کے پاس کچھ نہ کچھ معلومات تھیں۔

''انگریزی فوج میں موجود ہندو سپاہی تلک لگانے کی اجازت نہ دیئے جانے پر بے حد مشتعل ہیں''۔ نانا صاحب کے نمائندے نے بتایا۔

''مسلمان ایسے کارتوس استعمال کرنے پر مجبور کیے جانے کی وجہ سے اشتعال میں ہیں، جن پر غالباً سؤر کی چربی لگی ہوئی ہے''۔ نواب آف اودھ کا نمائندہ بولا۔

''یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ فوج میں اچھے خاصے اختلافات موجود ہیں''۔ دہلی کے بادشاہ کا نمائندہ گویا ہوا۔

رانی اس اجلاس کی صدارت کر رہی تھی اس لیے خاموشی سے تمام باتیں سن رہی تھی بالآخر جب سب اپنی اپنی بات کہہ چکے تو اس نے سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔

''ہم یہ تمام باتیں تسلیم کرتے ہیں''۔ رانی کی گفتگو کا انداز بھی شاہانہ تھا۔ ''لیکن ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ فوج بے اطمینانی کے باوجود ابھی کسی کارروائی کے لیے تیار نہیں اور اگر عجلت میں کوئی کارروائی کی گئی تو ہماری یہ لڑائی، آزادی کی جنگ کے بجائے لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی وارداتوں میں تبدیل ہو جائے گی جو ہمارے لیے فائدے کے بجائے نقصان اور ذلت و رسوائی کا باعث ہوگی کیونکہ اس طرح ہم عوامی ہمدردیاں اور حمایت کھو بیٹھنے کے باعث تنہا رہ جائیں گے''۔

تمام ماہرین اور نمائندے خاموش ہو گئے کیونکہ رانی نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بہ حرف درست تھا۔ وہ اس امر پر بھی حیران تھے کہ جھانسی سے کبھی باہر نہ جانے والی رانی لکشمی بائی نے محض چند الفاظ میں پوری صورت حال کا تجزیہ کر ڈالا تھا۔

''تب پھر اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے''۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے نمائندے نے دریافت کیا۔ اس کے اس جملے نے بالواسطہ طور پر رانی کو جنگ آزادی کی سرخیل اور رہبر و رہنما بھی تسلیم کر لیا تھا۔

''ہمیں کسی بھی قسم کا فیصلہ کرنے سے پہلے کم از کم پچھلے سو سالہ برطانوی اقتدار پر ایک نظر بہر حال دوڑانی ہوگی تا کہ ان کی سوچ، قوت اور اپنی کمزوریوں کا علم ہو سکے''۔ رانی ایک ماہر مقررہ کی طرح بول رہی تھی۔ ''اس سے ہمیں یہ بھی پتا چل جائے گا کہ آخر وہ کون سے عوامل ہیں جن کے باعث ہندوستانی قوم میں بیداری کی لہر دوڑنے لگی ہے اور وہ آزادی حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں''۔

تمام نمائندے پوری توجہ سے رانی کی گفتگو سن رہے تھے۔ ان میں سے بعض نے اپنے سروں کو اثباتی انداز میں جنبش دے کر رانی کو اپنی بات جاری رکھنے کا خاموش اشارہ بھی کر دیا تھا۔ انہیں علم ہو گیا تھا کہ رانی محض ایک چھوٹی سی ریاست کی حکمران نہیں بلکہ وہ پورے ملک کے ماضی اور حال پر گہری نگاہ رکھتی ہے۔

''ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوستان میں سماجی اور سیاسی بے اطمینانی کے پیچھے کئی عوامل کارفرما ہیں۔'' رانی لکشمی بائی نے حاضرین مجلس کو آگاہ کیا۔ ''مغل بادشاہت اور خود مختار ریاستوں

کو غصب کر کے انگریز نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے جذبات کو یکساں طور پر مجروح کیا ہے۔ سابق گورنر جنرل ڈلہوزی اور اب اس کے جانشین لارڈ کیننگ [10] کی ہنگامی زرعی اصلاحات نے جلتی پر تیل کا کام کیا جب کہ یورپی تہذیب کو متعارف کرائے جانے سے ہندوستان کی روایتی اقدار کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ 1853ء میں مرہٹوں کے رہنما نانا صاحب کو برطانویوں نے ان کے خطاب اور پنشن سے محروم کر دیا جب کہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر دوم [11] کو باضابطہ طور پر مطلع کر دیا گیا ہے کہ ان کے انتقال کی صورت میں مغل بادشاہت خود بہ خود ختم ہو جائے گی''۔

رانی چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی کہ شاید وہاں موجود کوئی شخص اس کی باتوں سے اختلاف کرے لیکن کسی نے کوئی رائے زنی نہیں کی۔

''سیاست اور سماج کی بات ہم کر چکے''۔ رانی بولی۔ ''اب ذرا فوج کی خبر لیتے ہیں۔ اس وقت ہندوستانی فوجی اپنی تنخواہ کے ساتھ ساتھ قواعد وضوابط میں ہونے والی بار بار تبدیلیوں سے بھی بری طرح متنفر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انہیں تنگ کر کے عیسائی بننے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ان کے اس عقیدے کو یوں بھی تقویت ملتی ہے کہ جن کارتوسوں کا ابھی ذرا دیر پہلے نواب آف اودھ کے نمائندے نے تذکرہ کیا ہے وہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس سے یکساں طور پر متنفر ہیں۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ کارتوسوں پر گائے کی چربی لگائی گئی ہے جو ان کے لیے گئو ماتا ہے جب کہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ وہ سور کی چربی ہے، جو ان کے مذہب میں حرام ہے۔ یوں انگریز نے دانستہ یا نادانستہ طور پر فوج میں موجود دونوں مذاہب کے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے''۔

رانی نے پھر ایک وقفہ لیا لیکن حاضرین پوری توجہ کے ساتھ اس کی گفتگو سننے میں مصروف تھے۔ ''اب ذرا سو سال پیچھے چلیں۔'' وہ اس وقت بچوں کو پڑھانے والی استانی محسوس ہو رہی تھی۔ ''یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1757ء میں جنگ پلاسی [12] میں کامیابی حاصل کر کے بنگال کے دیوانی حقوق یعنی محاصل کیے تھے جب کہ 1764ء کی جنگ بکسر جیت کر وہ بنگال کی حکومت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے اور یہی وہ جنگ تھی جس نے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم جمانے اور اس کے اقتدار کو وسعت دینے میں بنیادی کردار ادا کیا.....''

''لیکن مہارانی پنجاب اور سندھ میں بھی انگریزوں .....'' مغل بادشاہ کے نمائندے نے رانی کو جیسے یاددہانی کرائی۔

''میں اسی طرف آرہی ہوں'' رانی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ اس کے بہت بعد کی بات ہے''۔ اس نے کڑے تیوروں سے نمائندے کو گھورا۔ ''برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1845ء میں سندھ پر کنٹرول حاصل کیا جب کہ 1848ء میں سکھوں اور انگریزوں کی دوسری جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں انگریز پنجاب پر بھی قابض ہو گئے اور اس کے پانچ سال بعد یعنی 1853ء میں مرہٹوں پر انگریزوں نے دھاوا بولا لیکن یہ جنگ کی صورت میں نہیں تھا بلکہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ اس سال نانا صاحب کو ان کے خطاب اور پنشن سے محروم کر دیا گیا۔''

''نانا صاحب نے عظیم اللہ خان کو پنشن اور مراعات کی بحالی کے لیے سفارتی مشن پر لندن بھی بھیجا تھا، مہارانی!'' نواب آف اودھ کا نمائندہ بولا۔ ''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ان کا مشن ناکام ہو گیا ہے''۔

''درست'' رانی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''انگریزوں نے پنشن اور خطاب کی بحالی سے انکار کر دیا ہے۔'' وہ چند ثانیے رکی جیسے اسے اس فیصلے سے دکھ ہوا ہو۔ ''بہر حال'' وہ دوبارہ گویا ہوئی ''1854ء میں برار [13] کا علاقہ کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر لیا گیا جب کہ 1856ء میں یعنی پچھلے سال اودھ کو برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا حصہ قرار دیا گیا اور بہادر شاہ ظفر کو باضابطہ طور پر آگاہ کر دیا گیا کہ وہ آخری بادشاہ ہے اور اس کے بعد مغل بادشاہت اختتام پذیر ہو جائے گی''۔

اجلاس میں شریک لوگوں کو رانی کے حافظے پر حیرت تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس نے انگریزوں کے اقتدار کو یوں لمحہ بہ لمحہ گن رکھا ہو گا۔

''کیا یہ واقعی درست ہے کہ انگریز، ہندوستان کو ایک ہندو ملک کے بجائے عیسائی سلطنت بنانا چاہتا ہے؟'' راجپوت سرداروں کے نمائندے نے سوال کیا۔

''سو فیصد'' رانی نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اس وقت ہندوستان میں لاتعداد مشنری ادارے کام کر رہے ہیں جو دن رات مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بننے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اگر محض تبلیغ یا ترغیب کا معاملہ ہوتا تو شاید اتنی بددلی نہ پھیلتی لیکن بعض مقامات سے ایسی خبریں بھی ملی ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بہ زور قوت ان کا آبائی مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

ناگپور [14] کے شاہی خاندان کے نوادرات کی کلکتہ میں عوامی نیلامی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے''۔

رانی لکشمی بائی کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے تمام تر ملکی معاملات پر مکمل عبور حاصل ہے اور وہ انگریزوں کی ایک ایک حرکت پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

''مشنری اداروں کی سرگرمیوں کے علاوہ خود کمپنی نے بھی بعض ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ ان سے ان کی مذہبی آزادی چھینی اور حقوق سلب کیے جا رہے ہیں''۔ رانی ذرا وقفے کے بعد پھر اپنے موضوع کی جانب لوٹ آئی۔ ''برطانویوں نے بچپن کی شادی کو خلاف قانون قرار دیا حالانکہ مشرقی یورپ کے بعض ملکوں میں یہ رسم اب بھی موجود ہے۔ ستی کو ممنوع کہہ کر پابندی عائد کر دی گئی اور اب ٹھگ [15] انگریزوں کے نشانے پر ہیں''۔

رانی نے رک کر ایک خادم خاص سے پانی طلب کیا۔ شاید اس قدر بولنے سے اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ فوراً ایک طلائی کٹورے میں پانی رانی کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اس نے کٹورے میں سے چند گھونٹ لیے اور پھر بولنے لگی۔

''اس وقت ہندوستانیوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے، آپ لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے''۔ رانی نے فرداً فرداً تمام حاضرین کو دیکھا۔ ''آفیشل بلیو بکس ___ جن کا عنوان ''ایسٹ انڈیا (تشدد) 1855ء سے 1857ء'' ہے، ہاؤس آف کامنز کے سامنے پیش کی گئی ہیں جن سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ اگر کسی انگریز افسر کو کسی ہندوستانی کے خلاف تشدد، مار پیٹ، بدسلوکی، حتیٰ کہ قتل کا مجرم پایا جاتا ہے تو اسے بار بار فیصلے کے خلاف اپیل کا حق حاصل ہے لیکن کسی ہندوستانی سپاہی کو اگر انگریز کے خلاف مجرم پایا جاتا ہے تو اسے اپیل کرنے کا کوئی حق ہے نہ اختیار ___ آپ خود ہی بتائیں کہ اس سے بڑی ناانصافی کیا ہو گی، ہندوستانیوں کے ساتھ .....؟''

رانی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''آپ درست کہتی ہیں''۔ مغلیہ نمائندے نے کہا۔ ''کیا آپ کو اس امر کا کوئی اندازہ ہے کہ انگریز اب تک ہندوستان کی کتنی زمین پر قابض ہو چکا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''جی ہاں!'' رانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''انگریزوں کے توسیع پسندانہ عزائم نے

ہندوستانیوں کے دلوں میں آگ کے الاؤ بھڑکا رکھے ہیں۔ پچھلے آٹھ سالوں میں گورنر جنرل ہندوستان جیمز اینڈریو براؤن رمزے، فرسٹ مارکوئیس آف ڈلہوزی نے کم وبیش پانچ لاکھ مربع میل کا علاقہ انگریزی مقبوضات میں شامل کیا ہے۔ لارڈ ڈلہوزی اور اس کے جانشین چارلس جان کیننگ، فرسٹ ارل کیننگ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت اگر کسی زمین کا مالک اولاد نرینہ کے بغیر اس دار فانی سے کوچ کر جاتا ہے تو اس کی زمین خود بہ خود انگریزوں کی ملکیت قرار پا جاتی ہے۔ یہ قانون جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ ریاستوں کے حکمرانوں پر بھی نافذ العمل ہے''۔ رانی بولتے بولتے اچانک چپ ہوگئی۔

اسے یاد آ گیا تھا کہ ان دنوں جھانسی بھی اسی صورت حال سے دوچار ہے اور وہ گزشتہ چار سال سے خط و کتابت اور سفارتی ذرائع سے اس ظالمانہ قانون کے خلاف لڑ رہی تھی لیکن خود اسے بھی اپنی کامیابی کے امکانات صفر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے چہرے پر دکھوں کے سائے اتر آئے لیکن وہ یہ طے کیے بیٹھی تھی کہ اپنی جان دے دے گی لیکن انگریزوں کو ترالقمے کی طرح جھانسی ہضم کرنے کا موقع نہیں دے گی۔

''آپ صرف اسی ایک بات سے انگریزوں کے توسیع پسندانہ عزائم کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ 1752ء میں جب مغل شہنشاہ نے برطانویوں کی تجارت پر پابندی عائد کر کے انہیں گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیا تھا تو اس وقت کمپنی صرف تین گوداموں کی مالک تھی اور اس کے زیر ملکیت کل رقبہ محض بیس مربع میل تھا لیکن ایک سو سال بعد ان کے زیر تسلط علاقے کا رقبہ ساڑھے سات لاکھ مربع میل سے زائد ہے''۔ رانی نے ایک بار پھر اپنی معلومات کے خزانے لٹانے شروع کر دیئے۔ ''انگریز جس زمین پر قبضہ کرتا ہے اسے زمینداری نظام کے تحت پٹہ پر دے دیا جاتا ہے۔ اس سے ایک جانب کاشت کاروں سے بے جا مشقت لی جا رہی ہے جب کہ دوسری جانب اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں بلا جواز اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح مقامی صنعتوں پر بھی بھاری ٹیکس عائد کیے گئے ہیں اور یوں مقامی اشیاء برطانیہ سے درآمد کی جانے والی اشیاء کی نسبت زیادہ مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کو یہ شکایات بھی ہیں کہ برطانوی ان سے بھاری ٹیکس وصول کر رہے ہیں''۔

رانی نے مختصر سے وقت میں گزشتہ ایک سو سال پر محیط انگریزی اقتدار کی پوری تصویر ان کے

سامنے پیش کر دی تھی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ مہارانی کہ آپ نے ہندوستان کی موجودہ کیفیت کی بڑی بھرپور عکاسی کی ہے۔'' بادشاہ کے نمائندے نے اسے خراج تحسین پیش کیا۔

''بے شک'' نواب آف اودھ کے فرستادے نے اس کی تائید کی۔'' لیکن ہم مقامی سپاہیوں کے موجودہ کردار اور ان میں بددلی کے بعض دیگر اسباب کے حوالے سے مزید کچھ سننے کے خواہش مند ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مہارانی ان سے بھی لاعلم نہیں ہوں گی؟''

جی ہاں، ہم ان معاملات سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں''۔ رانی لکشمی بائی نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔''اس کا تو آپ کو بھی علم ہوگا کہ ہندوستانی، سپاہیوں کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے ملازم ہیں جب کہ ان کے افسران انگریز ہیں جنہیں انگلینڈ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اپنے ملٹری کالج میں تربیت دینے کے بعد ہندوستان بھجوایا جاتا ہے۔ بمبئی [16] مدراس [17] اور بنگال [18] کی پریذیڈنسیز کی اپنی اپنی فوجیں ہیں جن کی کمان ان کے کمانڈر انچیف کرتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی فوجوں کی تعداد برطانوی بادشاہت کی سرکاری فوج سے زیادہ ہے .....''

''کیا مطلب؟'' بیک وقت کئی آوازیں ابھریں۔

''جی ہاں، ایسی ہی بات ہے'' رانی نے اپنا جملہ کاٹے جانے کا قطعی بُرا نہیں منایا۔''اس وقت یعنی جنوری 1857ء کے پہلے ہفتے میں برطانوی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد دو لاکھ 75 ہزار ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کمپنی نے برہمنوں اور راجپوتوں کے علاوہ دوسری ہندوستانی اقوام کے باشندوں کو بھی فوج میں بھرتی کیا ہے جب کہ راجپوتوں کو ہندوستان میں خالصتاً جنگ جو قوم قرار دیا جاتا ہے۔ پچھلے سال یعنی 1856ء میں ہندوستانی سپاہیوں کو سمندر پار خدمات انجام دینے پر مجبور کیا گیا جو ان کے خیال میں ان کے دھرم کے خلاف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فوجی زندگی کے بعض دیگر پہلوؤں سے بھی غیر مطمئن ہیں .....''

رانی نے پھر ایک چھوٹا سا وقفہ لیا لیکن اپنی بات جاری رکھی'' .....مثلاً ان کی تنخواہیں بے حد کم ہیں۔ جب انگریزی افواج نے اودھ اور پنجاب پر حملہ کیا تو انہیں کوئی اضافی تنخواہ نہیں دی گئی اور جب انہوں نے اس کا مطالبہ کیا تو جواب میں یہ کہا گیا کہ یہ کوئی غیر ملکی مشن نہیں تھا کہ

انہیں اضافی تنخواہ دی جائے۔''

رانی کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ برطانوی فوج میں بھی اس کے جاسوس موجود ہیں جو اسے مکمل طور پر باخبر رکھتے ہیں لیکن حاضرین میں سے کسی نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''پھر اس کے علاوہ ان کارتوسوں کا شاخسانہ، جن کا پہلے بھی تذکرہ ہو چکا ہے۔'' رانی ایک بار پھر بول اٹھی۔ ''دی پیٹرن 1853 انفیلڈ (پی/53) رائفل [19] ہندوستان میں متعارف کرائی گئی۔ اس کے کارتوسوں پر ایک قسم کی چربی لگی ہوئی تھی جب کہ انہیں رائفل میں لوڈ کرنے سے پہلے دانتوں سے اس چربی کو کاٹنا پڑتا تھا۔ ان کارتوسوں کی آمد کے ساتھ ہی یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ یہ گائے یا سور کی چربی ہے اور یہ مسلمان اور ہندو، دونوں ذاتوں کے سپاہیوں کے لیے ناقابل برداشت عمل تھا جو اپنے اپنے مذاہب کے تحت گائے اور سور کے گوشت کو حرام تصور کرتے تھے۔ اس پر برطانویوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے کارتوس، تبدیل کر دیئے ہیں اور نئے کارتوسوں پر گائے یا سور کی چربی نہیں لگائی گئی۔ انہوں نے سپاہیوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ کارتوسوں پر لگی ہوئی چکنائی موم اور خوردنی تیل سے تیار کردہ ہے لیکن سپاہی ان وضاحتوں سے مطمئن نہ ہوئے۔ ہندوستانی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل جارج اینسن نے اس پر اپنے ردعمل کا یوں اظہار کیا کہ ''میں ان لوگوں کے نفرت انگیز رویئے اور حیوانی طرز عمل کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔'' اس کے جونیئر افسران نے بہت کوشش کی لیکن جنرل جارج، ہندوستانی سپاہیوں سے کوئی سمجھوتہ کرنا تو درکنار، بات چیت پر بھی آمادہ نہ ہوا۔''

''اس کا مطلب تو یہی ہے مہارانی کہ اب فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے''۔ نانا صاحب کے نمائندے نے کہا۔ ''مزید تاخیر ہمارے لیے نقصان دہ ہوگی اس لیے آپ سے استدعا یہی ہے کہ کاروائی کا حکم دے دیا جائے۔''

''نہیں!'' رانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فیصلے کی گھڑی ضرور آ پہنچی ہے لیکن کارروائی کا وقت ابھی نہیں آیا۔'' رانی اب بھی اپنے سابقہ موقف پر قائم تھی۔ ''اس لیے چند دن مزید انتظار کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔''

اس کے ساتھ ہی رانی نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ اجلاس کے باقی شرکاء بھی اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ رانی کا اٹھنا اجلاس ختم ہونے کا اشارہ تھا۔

سب نے باری باری ہاتھ جوڑ کر رانی کو پرنام کیا جب کہ ان کی آنکھیں اس نوجوان اور خوبصورت دوشیزہ کو خاموش خراج تحسین پیش کر رہی تھیں۔

جنوری 1857ء کا آخری ہفتہ شروع ہو چکا تھا

جھانسی سمیت پورے ہندوستان میں حالات بظاہر معمول پر تھے اور زندگی اپنی تمام تر جولانیوں سمیت رواں دواں تھی۔ غلامی کے احساس کے باوجود جگہ جگہ میلے، رقص و سرود کی محفلیں اور تھیٹرز کا انعقاد جاری تھا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے ان میں مگن تھے لیکن ہندوستانی جوانوں کے دل معمول سے زیادہ رفتار کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔

شاید وہ آنے والے خطرے کی بو سونگھ رہے تھے۔

کچھ یہی عالم ہندوستانی فوجیوں کے کیمپوں میں بھی تھا جہاں ہر آنے والا دن گزرنے والے دن کی نسبت زیادہ کشیدہ اور تناؤ سے بھرپور گزر رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے اطمینانی کی فضا تھی جسے فی الحال کوئی نام نہیں دیا جا سکا تھا۔

جھانسی شہر کے وسط میں واقع رانی محل میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہر روز کئی نئے چہرے آتے، رانی سے سرگوشیوں میں گفتگو کرتے اور خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ ہر ایسے مہمان کی آمد پر سرخ پگڑیاں پہنے ہوئے رانی کے محافظ دستے کے افراد اور پیلے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس رانی کی خصوصی زنانہ فوج معمول سے زیادہ سرگرم ہو جاتی۔ ان کی عقابی نگاہیں بغور چاروں جانب کا جائزہ لینے میں مصروف رہتیں جب کہ ان کا ایک ہاتھ تلوار کے دستے اور دوسرا رائفل کی لبلبی پر ہوتا۔

یہ آنے والے رانی کے جاسوس اور خیر خواہ تھے جو ملک کے کونے کونے سے اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے جھانسی پہنچتے تھے۔

شہر میں چونکہ انگریزی فوج بھی موجود تھی لہٰذا آنے والے ہمیشہ مختلف حلیوں میں ہوتے تاکہ پکڑے یا پہچانے جانے کا اندیشہ کم سے کم ہو۔

چاند کی چودھویں تاریخ کو منایا جانے والا ''کڑوا چوت'' کا تہوار گزر چکا تھا اور یہ فروری کی

ابتدائی تاریخوں کی ایک اندھیری رات تھی جب تانتیا توپ [20] رانی سے ملاقات کے لیے محل میں داخل ہوا۔

اسے فوراً رانی کے کمرہ خاص میں پہنچا دیا گیا۔

رانی چونکہ عبادت میں مصروف تھی اس لیے اسے کچھ وقت تنہا ہی گزارنا پڑا لیکن اتنی دیر میں ملازمین نے اس کے سامنے کھانا چن دیا۔ رانی جب کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کھانے سے فارغ ہو کر قہوے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

رانی کو دیکھتے ہی اس نے پیالی میز پر رکھی اور احتراماً کھڑا ہو گیا۔

ایک خادمہ نے بڑھ کر قہوے کی ایک پیالی رانی کو تھما دی اور پھر فوراً کمرے سے باہر چلی گئی کیونکہ اسے علم تھا کہ رانی ایسے مواقع پر کسی اور کی موجودگی پسند نہیں کرتی۔

رانی نے تانتیا توپ سے اس کی خیریت دریافت کی لیکن یہ رسمیہ جملے کچھ زیادہ طویل نہیں تھے کیونکہ جلد ہی وہ دونوں مطلب کی بات پر آ گئے۔

''کلکتہ کی خبر تو آپ کو مل چکی ہو گی؟'' تانتیا توپ کا انداز سوالیہ تھا۔

رانی نے فوراً اثبات میں سر ہلایا ''ہوں'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''22 جنوری کو چھاؤنی کے علاقے میں بعض مقامی سپاہیوں نے فائرنگ کی ہے لیکن کوئی انگریز افسر زخمی نہیں ہوا۔''

''جی ہاں، مہارانی'' تانتیا توپ نے اس کی تائید کی۔ ''لیکن یہ سب کچھ وقت سے بہت پہلے ہو گیا ہے جب کہ ہم ابھی اس کے لیے تیار نہ تھے۔''

''ہم آپ سے متفق ہیں، تانتیا!'' مہارانی نے جواب دیا۔ ''ہمیں تیاریوں کے لیے کچھ وقت اور درکار ہے۔'' رانی کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''شاید اب ایسا ممکن نہ ہو۔'' تانتیا نے کہا اور اپنے لباس کی اندرونی تہ سے ایک کاغذ نکال کر رانی کو تھما دیا۔ ''آپ پہلے اس کا مطالعہ فرما لیں، میرا خیال ہے کہ اس کے بعد ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو گی۔''

رانی نے تہ کیا ہوا کاغذ کھول ڈالا۔ یہ ایک ہینڈ بل تھا جس کی تحریر کچھ اس طرح سے تھی۔

''اب مزید تکالیف و مصائب برداشت نہیں ہوتے۔ ہم مزید کتنا عرصہ خطرے کی وہ گھنٹیاں سنتے رہیں جو ہمیں اپنے کانوں میں بجتی محسوس ہوتی ہیں۔ اٹھ کھڑے ہو اور انصاف کے

حصول کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بعض غاصبوں نے اس ملک کو یرغمال بنا رکھا ہے، انہیں نکال باہر کرو، اپنے ملک کو آزاد کراؤ اور اپنے حقوق حاصل کرو۔''

رانی نے کئی بار ہینڈ بل کی تحریر پڑھی اور پھر اسے اپنے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر ڈال دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ تانتیا بدستور اس کی جانب نگراں تھا لیکن اس نے رانی کی محویت میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔

کافی دیر اسی طرح گزر گئی، بالآخر رانی نے یوں سر اٹھایا جیسے وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گئی ہو۔

''نہیں، تانتیا.....نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس ہینڈ بل کے باوجود ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہ اس قسم کی کارروائی کے لیے مناسب وقت نہیں۔''

''مگر مہارانی! فوج میں بے اطمینانی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔'' تانتیا توپ نے جواب دیا۔ ''اب انہیں مزید روکنا شاید ہمارے اختیار میں نہ ہو۔''

''ہم بھی صورت حال سے پوری طرح باخبر ہیں۔'' رانی بولی۔ ''لیکن کیا عوام، اپنی فوج کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو چکے ہیں؟'' اس کے جملے کا آخری حصہ سوالیہ تھا۔

''بالکل، مہارانی۔'' تانتیا نے بتایا۔ ''فنڈز کے حصول کے لیے خفیہ مہم شروع کی جا چکی ہے اور اب تک ہمارے پاس حسب ضرورت رقم جمع ہو چکی ہے۔''

''درست'' رانی بولی۔ ''اسلحہ اور گولہ بارود کی صورت حال کیا ہے؟''

''ہر مضبوط ٹھکانے پر وافر مقدار میں اسلحہ ذخیرہ کیا جا چکا ہے'' جو تانتیا کے پاس مکمل معلومات موجود تھیں۔ ''ہراول دستے اور گولہ بارود ایک سے دوسری جگہ پہنچانے کے انتظامات بھی کیے جا چکے ہیں۔''

رانی اب بھی سوچوں میں غرق تھی۔ ''عوام سے فنڈز کس نام پر حاصل کیے جا رہے ہیں؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''ابھی انہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔''

''تو پھر آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ عوام اپنی فوج کا ساتھ دینے کے لیے مکمل طور پر تیار ہیں۔'' رانی نے تیکھے لہجے میں کہا۔

تانتیا توپ خاموش رہا کیونکہ اس کے پاس رانی کے سوال کا جواب نہیں تھا۔

''آپ کی خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی ہماری کارروائی مناسب نہیں۔'' رانی نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا۔ ''ہماری تجویز ہے کہ پہلے عوام کو فوج کا ساتھ دینے کے لیے تیار کیا جائے اور پھر کارروائی کا آغاز کیا جائے۔''

''اتنے بڑے ملک میں اس اطلاع کو پہنچانا اور اسے خفیہ رکھنا کیسے ممکن ہے، مہارانی؟'' تانتیا توپ نے اپنی بے چارگی کا اظہار کیا۔

''بہت آسان ہے، تانتیا؟'' رانی زیرلب مسکرائی۔ ''پکی ہوئی چپاتیوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں مہارانی!'' تانتیا نے پلکیں جھپکائیں۔

''چپاتیوں کے ذریعے خفیہ پیغام رسانی کا طریقہ بے حد پرانا، محفوظ اور عام ہے۔'' رانی نے اسے بتایا۔ ''اس بار ہم چپاتیوں کو انقلاب کے پیغام کے طور پر استعمال کریں گے۔ ابتدا جھانسی سے ہوگی۔ انقلاب کی پہلی چپاتیاں ہمارے محل میں تیار ہوں گی۔ ہمارے خصوصی ایلچی یہ چپاتیاں اپنے ساتھ دوسرے شہروں میں لے جائیں گے اور تقسیم کریں گے۔ جو لوگ یہ چپاتیاں لیں گے وہ انہیں بھیجنے کے مقاصد سے بخوبی آگاہ ہوں گے۔ وہ یہ چپاتیاں اپنے پاس رکھیں گے اور نئی چپاتیاں پکا کر اپنے قابل اعتماد افراد کے ہاتھ اگلے شہر روانہ کردیں گے۔''

''واہ، مہارانی'' تانتیا توپ کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''واقعی یہ پیغام رسانی کا محفوظ ترین طریقہ اور ذریعہ ہے۔''

''لیکن تانتیا! یہ ذہن میں رکھو کہ کام اتنا آسان نہیں۔'' رانی نے اسے یاد دلایا۔ ''ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اس لیے اس سارے عمل کے لیے کم از کم تین ماہ درکار ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے، مہارانی'' تانتیا پرجوش انداز میں بولا۔ ''ہم تین ماہ انتظار کرسکتے ہیں لیکن اس پر عمل درآمد جلد سے جلد شروع ہوجانا چاہیے۔''

''بے فکر رہو۔'' رانی نے اسے اطمینان دلایا۔ ''ہمارے محل سے چپاتیاں آج رات ہی کم و بیش دس شہروں کے لیے روانہ کردی جائیں گی، تم لوگ اپنے شہروں سے جلد از جلد اس عمل کے آغاز کے اقدامات کرو۔''

''ایسا ہی ہوگا، مہارانی۔'' تانتیا توپ نے جواب دیا۔ ''انقلاب کا امتیازی نشان کیا ہوگا؟''

رانی چند ثانیے خاموش رہی پھر بولی۔ ''کنول کا پھول، عقل و دانش کی دیوی سرسوتی کی عظمت اور دولت وشہرت کی دیوی لکشمی کا امتیازی نشان ہے۔''

''یعنی ___''

''کنول کا پھول، انقلاب ہندوستان کا امتیازی نشان ہوگا۔'' رانی نے تانتیا توپ کا ادھورا جملہ مکمل کر دیا۔

''اور اب میں درخواست کروں گا کہ رانی خود ہی کارروائی کے دن کا تعین بھی فرمادیں۔'' تانتیا نے تجویز پیش کی۔

''ہوں'' رانی نے پھر ہنکارا بھرا۔'' ہمارے خیال میں اپریل کے اواخر یا مئی کے وسط تک پورے ملک میں پیغام رسانی کا عمل مکمل ہو چکا ہوگا۔''

''جی مہارانی!''

''تو پھر ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستانی عوام، اتوار 31 مئی 1857ء کو پورے ملک میں بیک وقت انقلاب کا آغاز کریں گے۔'' جھانسی کی ملکہ، رانی لکشمی بائی نے فیصلہ سنادیا۔

◈ ◈ ◈

لیکن رانی کے فیصلے کی گونج ابھی شاید جھانسی کی حدود سے باہر بھی نہیں نکلی تھی کہ ہندوستان کی اس جنگ آزادی کا آغاز ہو گیا جسے انگریز مصنفین و مورخین نے غدر یا بغاوت اور مشرقی مصنفین نے ''جنگ آزادی ہند'' کا نام دیا۔

رانی اور تانتیا کی ملاقات کے بعد جنگ کا پہلا شعلہ 25 فروری 1857ء کو اس وقت بھڑکا جب بہرام پور میں تعینات 19 ویں رجمنٹ نے بغاوت کر دی۔ رجمنٹ کے مقامی سپاہیوں نے اپنے ایک ساتھی کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ پریڈ گراؤنڈ میں پریڈ کے دوران اپنے ایک اعلیٰ افسر پر گولی چلا دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔

31 مارچ 1857ء کو بارک پور میں 34 ویں رجمنٹ نے بغاوت کی جب کہ اپریل میں یہ آگ آگرہ، الہ آباد اور انبالہ تک جا پہنچی۔

لیکن جس واقعہ کو جنگ آزادی کا نقطہ آغاز تسلیم کیا جاتا ہے وہ 29 مارچ 1857ء کو میرٹھ

میں پیش آیا جب 34ویں مقامی انفنٹری کے ایک سپاہی منگل پانڈے نے اپنے ایک برطانوی سارجنٹ پر حملہ کیا اور ایک ایڈ جوٹنٹ کو زخمی کر دیا۔ جنرل ہیرسے، جس کا کہنا تھا کہ پانڈے، ایک طرح کے مذہبی جنون میں مبتلا تھا، نے ایک جمع دار کو حکم دیا کہ حملہ آور کو گرفتار کر لیا جائے لیکن جمع دار نے ان احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد منگل پانڈے نے رائفل کا رخ اپنی جانب کر کے پیر کی مدد سے ٹرائیگر دبانے کی کوشش کی تا کہ خودکشی کر سکے لیکن وہ اس میں ناکام رہا اور اسے جمع دار سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ دونوں پر ہنگامی مقدمہ چلا کر 7 اپریل 1857ء کو پھانسی دے دی گئی۔ اجتماعی سزا کے طور پر پوری رجمنٹ کو برطرف کر دیا گیا کیونکہ انگریز افسران کا خیال تھا کہ رجمنٹ کے تمام سپاہی اپنے افسران کے لیے نفرت انگیز جذبات رکھتے ہیں۔

9 مئی 1857ء کو میرٹھ میں ہی تھرڈ لائٹ کیولری کے 85 سپاہیوں نے اپنے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ انہیں گرفتار کر کے سرعام ننگا کیا گیا یعنی یونیفارم اتار لیے گئے جبکہ بعد ازاں ان میں سے ہر ایک کو دس دس سال جبری مشقت کی سزا دی گئی۔ یہ بھی کہا گیا کہ شہر بھر کی طوائفوں نے ان قیدیوں کو رات بھر جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔

10 مئی 1857ء کو جب بنگال آرمی کی گیارہویں اور بیسویں مقامی کیولری کے دستے میرٹھ میں جمع ہوئے تو انہوں نے اپنے رینک اتار پھینکے اور اپنے کمانڈنگ آفیسرز پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے بعد انہوں نے میرٹھ جیل پر ہلہ بول دیا اور تھرڈ رجمنٹ کے گرفتار سپاہیوں کو رہا کرایا۔ انہوں نے پوری چھاؤنی پر حملہ کر دیا اور وہاں موجود تمام یورپی اور ہندوستانی عیسائیوں کو ہلاک کر دیا جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے جب کہ چھاؤنی کی عمارتوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔

اس کارروائی کے بعد باغی افواج کی بچ جانے والے برطانوی فوجیوں سے جنگ ہوئی۔ اس وقت میرٹھ میں پورے ہندوستان کے مقابلے میں سب سے زیادہ برطانوی فوجی موجود تھے جن کی تعداد دو ہزار اڑتیس بتائی گئی ہے۔ ان کے پاس بارہ فیلڈ توپیں موجود تھیں۔ ان کے مقابلے پر دو ہزار تین سو ستاون مقامی سپاہی تھے جنہیں آرٹلری کی کوئی مدد حاصل نہ تھی۔ بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ برطانوی افواج باغی سپاہیوں کو دہلی کی جانب بڑھنے سے روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

لیکن یہ غلط ہے بلکہ 11 مئی 1857ء کو باغی، دہلی [21] میں داخل ہو گئے جہاں مقامی لوگ ان کے ساتھ مل گئے اور انہوں نے لال قلعہ دہلی پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس جھڑپ

میں پانچ برطانوی مارے گئے جن میں ایک برطانوی آفیسر اور دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ لال قلعہ میں اس وقت مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر موجود تھا۔ باغیوں نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی دوبارہ تخت نشینی کا اعلان کرے۔ پہلے بہادر شاہ نے کسی قدر ردّ و کد سے کام لیا لیکن بعد ازاں باغیوں کا مطالبہ تسلیم کر کے اس نے خود کو ہندوستان کا بادشاہ اور باغیوں کا سربراہ قرار دے دیا۔ اس کے بعد باغی سپاہی پورے شہر میں پھیل گئے تاکہ یورپیوں اور عیسائیوں کو چن چن کر قتل کر سکیں۔

یوں ابتدائی چار ماہ میں بغاوت مسلح افواج سے نکل کر عوام تک تو جا پہنچی لیکن ابھی اسے وہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی تھی جس کی امید باغی رہنماؤں کو تھی۔ ہندوستانی قوم پوری طرح متحد نہ تھی۔ اس کی ایک مثال یہ بھی تھی کہ جب بہادر شاہ ظفر نے شاہی تخت و تاج کی بحالی کا اعلان کیا تو ایک افواہ یہ بھی گشت کرنے لگی کہ اب مرہٹہ بادشاہ بھی اپنے تخت کی بحالی کا اعلان کرنے والے ہیں جب کہ اہالیان اودھ کی خواہش تھی کہ نواب آف اودھ کے اختیارات بھی بحال ہونے چاہئیں۔

اس وقت تک جنگ آزادی، ہندوستان کے صرف شمالی اور وسطی علاقوں میں لڑی جا رہی تھی۔ دہلی، لکھنو [22] کانپور، جھانسی اور بریلی اس کے مرکزی گڑھ تھے۔ مرہٹے، روہیلے اور اودھ کے باشندے بہادر شاہ ظفر کے حمایتی اور انگریزوں کے مخالف تھے۔

احمد اللہ شاہ سمیت کئی مسلمان علماء نے باقاعدہ جہاد کے فتوے دینے شروع کر دیئے جن کی وجہ سے مسلمانوں نے اس جنگ کو مذہبی رنگ دے دیا اور انگریز یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اس بغاوت کے مرکزی کردار مسلمان ہی ہیں۔ اودھ میں سنی مسلمانوں کی خواہش تھی کہ شیعہ حکمران ان پر دوبارہ مسلط نہ ہو پائیں چنانچہ ان میں سے بیشتر نے یہ کہہ کر اس جنگ میں شرکت سے انکار کر دیا کہ یہ بنیادی طور پر ایک شیعہ انقلاب ہے۔

تھانہ بھوانہ میں سنیوں نے حاجی امداد اللہ کو اپنا امیر تسلیم کر لیا اور یوں مئی 1857ء میں حاجی امداد اللہ کے جہادیوں اور انگریزوں کے مابین مشہور جنگ شاملی لڑی گئی۔

کئی مسلمان، انگریزوں کی حمایت کر رہے تھے کیونکہ وہ مغل بادشاہ کی دوبارہ بحالی کے مخالف تھے اور یہی وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے انگریز، آزاد علاقے دوبارہ فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پنجاب کے سکھوں اور سرحد کے پٹھانوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے وہ دوبارہ دہلی پر قابض ہو گئے۔ اسی طرح نیپال کے گورکھاؤں نے بھی انگریزوں کی حمایت

جاری رکھی۔

جنوبی ہندوستان ہنوز پرسکون تھا اور وہاں قانون کی اکا دکا خلاف ورزی کے سوا بحیثیت مجموعی حالات قابو میں تھے۔ کئی ہندو ریاستوں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا اور یوں انہوں نے ہندوستان کے باسیوں کی خواہش یعنی ''آزادی'' سے خود کو الگ تھلگ رکھا۔

بہادر شاہ ظفر کی حکومت اصولی طور پر صرف دہلی تک محدود تھی لیکن اس نے خود کو پورے ہندوستان کا بادشاہ قرار دیا اور کئی امراء نے اس سے وفاداری کا حلف بھی اٹھالیا۔ بادشاہ نے فوری طور پر اپنے نام کے سکے جاری کیے اور اس کا نام خطبے میں شامل کرلیا گیا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ مسلمانوں نے اسے اپنا حکمران تسلیم کرلیا ہے۔

ابتدائی طور پر ہندوستانی سپاہی، برطانوی فوجوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے جس سے آزادی کی تحریک کو بے انتہا تقویت ملی۔ ہندوستانی سپاہیوں نے ہریانہ، بہار، سنٹرل پراونسز (سی پی) اور یونائیٹڈ پراونسز (یو پی) [23] کے بیشتر اہم اضلاع اور شہروں پر قبضہ کرلیا۔ میرٹھ اور انبالہ سے برطانوی افواج کو نکال باہر کیا گیا اور یہ دونوں شہر کئی ماہ تک ہندوستانی سپاہیوں کے قبضے میں رہے۔

اس مرحلے پر انگریزوں نے ایک چالاک دشمن ہونے کا ثبوت دیا۔ ان کے پاس اعلیٰ معیار کے ہتھیاروں کے علاوہ بہترین تربیت اور حکمت عملی موجود تھی جب کہ آزادی کے متوالے ان سے محروم تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مرکزی طور پر ان کے پاس کوئی کنٹرول اینڈ کمانڈ سسٹم نہ تھا۔ ہریانہ کا حکمران راؤ تولا رام جدید ہتھیاروں کی خریداری کے لیے روس گیا جو اس وقت خود انگریزوں کے خلاف جنگ کریمیا میں الجھا ہوا تھا۔ مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ تولا رام راستے میں ہی انتقال کر گیا اور روسی ہتھیار کبھی ہندوستان نہ پہنچ سکے۔

برطانویوں نے ابتدائی مراحل میں پلٹ کر حملہ کرنے میں قدرے سستی اور تاخیر کا مظاہرہ کیا لیکن پھر اچانک ہی ان کے دو طاقت ور دستے میرٹھ اور شملہ سے نمودار ہوئے۔ وہ آہستہ روی کے ساتھ دہلی کی جانب بڑھے اور راستے بھر ہندوستانی سپاہیوں سے لڑتے رہے، انہیں قتل کرتے رہے اور باغیوں کو پھانسی دیتے رہے۔ ٹھیک اسی وقت برطانیہ نے جنگ کریمیا میں مصروف اپنی بعض رجمنٹس کو چین کے راستے ہندوستان روانہ کر دیا۔

چنانچہ دو ماہ کے طویل سفر کے بعد انگریزی فوجوں نے دہلی کے قریب بادل کی سرائے کے مقام پر باغیوں کی مرکزی فوج کے خلاف جنگ لڑی اور انہیں واپس دہلی میں دھکیل دیا۔ برطانویوں نے دہلی شہر کی شمالی جانب اپنا مرکزی کیمپ قائم کیا اور محاصرہ شروع ہو گیا۔ ایک اندازے کے مطابق دہلی کا محاصرہ یکم جولائی سے 31 اگست تک جاری رہا۔ انگریزی فوجیں چاروں طرف سے دہلی کو گھیرنے میں ناکام رہیں چنانچہ باغیوں کو بہ آسانی رسد اور کمک ملتی رہی۔ بعدازاں پنجاب سے سکھ افواج اور نیپال سے گورکھا بریگیڈ، انگریزوں سے آملا۔

مگر اس کے باوجود شہر فتح ہونے کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے کیونکہ باغی تعداد میں انگریزوں اور ان کے ہم نواؤں سے کہیں زیادہ تھے۔ حسن اتفاق سے انگریزوں کو کشمیری دروازے کے راستے شہر میں داخل ہونے کا موقع مل گیا جس کے ساتھ ہی ہر گلی میں دست بہ دست لڑائی ہونے لگی۔ اس دو بہ دو جنگ میں سکھوں کا کمانڈر مارا گیا اور وہ میدان چھوڑ گئے لیکن برطانوی فوج لال قلعہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ بہادر شاہ ظفر نے فرار ہو کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لے لی اور یوں انگریزوں نے دوبارہ دہلی فتح کر لیا۔

انگریزوں نے شہر کو جی بھر کر اجاڑا اور لوٹا۔ ہندوستانیوں کے ہاتھوں یورپیوں کی ہلاکت کا بدلہ لینے کے لیے انہوں نے بلا مبالغہ ہزاروں شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انگریزوں نے اپنی توپیں شہر کی مرکزی مسجد میں نصب کیں اور چاروں اطراف بے حساب گولہ باری کی چنانچہ جہاں جہاں ان توپوں کے گولے گرے وہاں کی عمارتیں اپنے مکینوں سمیت صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ دہلی میں پورے ہندوستان کے امیر کبیر افراد کے گھر موجود تھے۔ جہاں لا تعداد فنی، ثقافتی، ادبی اور مالی خزائن تھے۔ وحشی انگریزوں نے ان خزانوں کو ملیا میٹ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جنوبی ایشیاء میں اپنے عہد کے عظیم ترین شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کا بیشتر قیمتی ادبی ورثہ بھی دہلی کی اسی لڑائی کی نذر ہوا۔

انگریزوں نے بعدازاں بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر لیا اور برطانوی افسر ولیم ہڈسن نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس کے بیٹوں مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو اگلے دن گولی سے اڑا دیا جب کہ اس سے اگلے دن ان کے سر، ان کے باپ کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔

موجودہ دور کے اتر پردیش میں واقع ریاست اودھ میں بھی میرٹھ کے فوری بعد بغاوت شروع ہوگئی۔ لکھنو کے برٹش کمانڈر ہنری لارنس کے پاس اپنے ریذیڈنسی کمپاؤنڈ میں پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے کافی وقت تھا۔ مقامی افراد سمیت اس کے پاس مجموعی طور پر 1700 سپاہی تھے۔

باغیوں کے ابتدائی حملے ناکام رہے اور وہ کمپاؤنڈ پر گولہ باری کرتے رہے اور گولیاں برساتے رہے۔ اس حملے کا سب سے پہلا زخمی خود لارنس تھا۔ باغیوں نے دھماکہ خیز مواد کے ذریعے دیواروں میں شگاف ڈالنے اور زیر زمین سرنگیں بنا کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں جنگ بھی دست بدست اور زیر زمین ہی لڑی گئی۔ باغیوں نے نوے دن تک کمپاؤنڈ کا محاصرہ کیے رکھا جس کے باعث انگریزوں کی تعداد کم ہو کر تین سو مقامی سپاہی اور ساڑھے تین سو برطانوی فوجی رہ گئے جب کہ ان کے ساتھ ساڑھے پانچ سو افراد ایسے تھے جو لڑ نہیں سکتے تھے۔

25 ستمبر کو ہائی لینڈرز [25] کے ایک ہزار فوجی جنرل سر ہنری ہیولاک [26] کی سرکردگی میں ان سے آملے جسے ''لکھنو کے لیے پہلی برطانوی امداد'' کہا جاتا ہے۔ اکتوبر میں سر کولن کیمپ بیل [27] کی زیر قیادت ہائی لینڈرز کا ایک اور دستہ ان کی مدد کو پہنچ گیا اور یوں وہ 18 نومبر 1857ء کو کمپاؤنڈ خالی کر کے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ پہلے بچوں اور عورتوں کو روانہ کیا گیا جب کہ مرد ان کی حفاظت کے لیے پیچھے پیچھے تھے۔

اب ان کا رخ کانپور کی طرف تھا جسے باغیوں کے قبضے سے آزاد کرایا جا چکا تھا۔

◈ ◈ ◈

ہندوستان جل رہا تھا۔

اور اب اس کے شعلوں کی تپش چین اور روس میں برسر پیکار انگریزوں کے ساتھ ساتھ لندن کے ایوانوں تک بھی جا پہنچی تھی۔

لیکن رانی کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔

عبادت، استغراق اور مذہبی رسومات حسب سابق جاری تھیں۔

مگر وہ حالات سے غافل نہیں تھی۔ 25 فروری 1857ء کو بہرام پور میں چلنے والی پہلی گولی سے لے کر اب تک رونما ہونے والے واقعات کی ایک ایک تفصیل اس کے ذہن پر نقش تھی۔

پورے ہندوستان میں اس نے اپنے مخبروں کا جال کچھ اس طرح بچھا رکھا تھا کہ دور دراز ہونے والا واقعہ بھی تیسرے یا چوتھے روز اس کے علم میں آجاتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے با اعتماد اور وفادار مشیروں و وزیروں کو جنگ کی تیاری کے خفیہ احکامات صادر کر دیئے تھے کیونکہ اسے علم تھا کہ جنگ کے شعلے کسی بھی وقت جھانسی کو اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ بے خبری میں ماری جائے۔

ایک روز رانی معمول کی گھڑ سواری سے لوٹی تو اس کی ایک مصاحب خاتون، جو اس کی قریبی دوست بھی تھی، نے اسے روک لیا۔

''یور ہائی نیس، اب تک اس جنگی تربیت کا کیا جواز ہے؟'' اس نے عام سے انداز میں سوال کیا۔ ''کیا آپ بھگوان کے بھروسے پر کچھ اور وقت نہیں گزار سکتیں؟''

''ہم ایک شتریا (جنگ جو عورت) ہیں۔'' رانی نے برجستہ جواب دیا۔ ''اور ایک شتریا کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک اور قانون کے حفاظت کرے''۔

''لیکن اب تو ملک اپنا ہے نہ قانون اپنا.....'' عورت شاید بحث پر آمادہ تھی لیکن رانی نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔

''کون کہتا ہے؟'' رانی اچانک ہی غضب ناک ہوگئی۔ ''یہ ملک بھی ہمارا ہے اور قانون بھی ہمارا.....اگر ضروری ہوا تو ہم ان کی حفاظت کرنے کے لیے جنگ کو بھی تیار ہیں۔'' اس کے لہجے میں عزم اور حوصلے کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ''ہم کسی دشمن کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈال سکتے، یاد رکھو کہ ہم ایک بے یار و مددگار بیوہ کی طرح رو اور مر نہیں سکتے.....ہم اپنے مقاصد کے لیے جنگ کریں گے اور ہنستے ہوئے موت کو گلے لگائیں گے۔''

عورت حیرت زدہ نگاہوں سے اسے دھان پان سی لڑکی کو دیکھتی رہ گئی جس کے سینے میں شاید کسی وحشی درندے کا دل دھڑکتا تھا۔

رانی واقعی جنگ کے لیے تیار تھی اور پورا جھانسی اس کے ساتھ تھا۔

اور پھر ایک دن رانی کے اندیشے اور وسوسے حقیقت بن کر سامنے آگئے۔

وہ 4 جون 1857ء کا دن تھا جب کانپور اور جھانسی میں بیک وقت بغاوت کا آغاز ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کانپور میں جنگ کے شعلے صبح کو بھڑکے لیکن جھانسی میں ان کی تپش بعد از دوپہر

محسوس کی گئی۔

مگر بغاوت کے ان ابتدائی واقعات میں رانی کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔

کانپور میں جنرل وہیلر کی زیر کمان سپاہیوں نے نانا صاحب کی منظوری اور حکم پر بغاوت کا پرچم بلند کیا اور پوری آبادی کا محاصرہ کر لیا۔ برطانویوں نے مسلسل تین ہفتے پانی کی تھوڑی سی مقدار کے ساتھ گزارے جب کہ ان کے جوان مسلسل زخمی ہو رہے تھے۔

25 جون کو نانا صاحب نے ہتھیار ڈالنے کی تجویز پیش کی اور وہیلر کے پاس اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن انگریز جب دریا کے راستے فرار ہونے کے لیے کشتیوں پر سوار ہوئے تو ان کے ناخدا بھاگ کھڑے ہوئے اور گھاٹ کے آس پاس چھپے لوگوں نے کشتیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ انگریزوں نے جوابی فائرنگ بھی کی لیکن ہندوستانی بھاری پڑے۔ انہوں نے آگ کے گولے پھینک کر کشتیاں نذر آتش کر دیں۔ دریا کا پانی خون سے رنگین ہو گیا جب کہ انگریزوں کی لاشیں ہر جانب تیرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

موتی گھاٹ کے مقام پر رونما ہونے والا یہ واقعہ بغاوت کا بدترین سانحہ تھا کیونکہ یہاں سے صرف ایک کشتی میں چار انگریز فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے تھے جب کہ گولیوں کا نشانہ بننے والوں کی تعداد سینکڑوں بیان کی گئی ہے۔

بچ جانے والی عورتوں اور بچوں کو بی بی گھر لے جایا گیا جو کانپور شہر میں واقع تھا۔ 15 جولائی کو تین افراد اس بی بی گھر میں داخل ہوئے اور چاقوؤں اور خنجروں کی مدد سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جنہیں بعد ازاں ایک کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔

کانپور پوری جنگ آزادی کے دوران انگریزوں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بنا رہا لیکن اس کا بدلہ انہوں نے یوں چکایا کہ جب وہ دوبارہ کانپور پر قابض ہوئے تو سینکڑوں ہندوستانی سپاہی ان کے قیدی بنے۔ انہوں نے ان قیدیوں کو بی بی گھر میں بند کر کے انہیں اپنی زبانوں سے فرش اور دیواروں پر لگا خون صاف کرنے پر مجبور کیا جب کہ بعد ازاں ان سب کو پھانسی دے دی گئی۔

جھانسی میں صورت حال قدرے مختلف تھی۔

میرٹھ کی بغاوت کے ساتھ ہی رانی نے میجر اسکین کو اپنے پاس محل میں طلب کر لیا۔

''میرٹھ کے واقعات کی خبر یقیناً آپ تک پہنچ چکی ہو گی؟'' رانی نے بلا تمہید اپنی گفتگو کا

آغاز کیا تھا لیکن اس کا انداز سوالیہ تھا۔

''یس یور ہائی نیس'' میجر اسکین نے اس سے اتفاق کیا۔ ''میرٹھ کے علاوہ بھی بعض دیگر شہروں سے ایسی ہی اطلاعات موصول ہوئی ہیں''۔

''ہم نہیں سمجھتے کہ ہندوستان میں جو آگ لگی ہے، اس سے ہم یا جھانسی محفوظ رہ سکیں گے۔'' رانی بولی۔ ''آپ کو علم ہے کہ اس وقت ہم اور ہمارا جھانسی آپ کے رحم و کرم پر ہے اور چند ایک اختلافات کے باوجود ہمارے کمپنی کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم ہیں۔''

''یس یور ہائی نیس!'' میجر اسکین نے تائیدی انداز میں سر کو جنبش دی۔

''اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ جھانسی میں ایسا کوئی واقعہ ہو جس سے ہمارے درمیان بدگمانی کی فضا پیدا ہو۔'' رانی نے بڑے نپے تلے انداز میں کہا۔ ''لہٰذا ہم ابھی سے آپ کو آگاہ کیے دیتے ہیں کہ جھانسی شہر اور دونوں قلعوں کی حفاظت مکمل طور پر آپ کے ذمہ ہے۔''

''ایسا ہی ہے، یور ہائی نیس۔ ہم اپنی ذمہ داریوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم قلعے اور شہر کی حفاظت سے خود کو بری الذمہ سمجھیں؟'' رانی نے سوال کیا۔

''یس، یور ہائی نیس'' میجر اسکین نے جواب دیا۔ ''یہ ہمارا دردسر ہے۔''

''لیکن ہم خود اور اپنے محل کو آپ کا دردسر نہیں سمجھتے۔'' رانی شاید میجر اسکین کے اسی جملے کی منتظر تھی۔

''ہمارے خیال میں تو آپ کی حفاظت ہماری اولین ترجیح ہے۔'' میجر اسکین بولا۔

''نہیں، میجر!'' رانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کسی پر بوجھ بننا ہماری سرشت میں شامل نہیں ___ اس لیے ہم اپنے محل اور خزانے کی حفاظت خود کرنا چاہتے ہیں۔''

''اوکے!'' خلاف توقع میجر اسکین نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔ ''اس سلسلے میں آپ ہم سے کیا تعاون چاہتی ہیں، یور ہائی نیس!''

''ہم اپنے محل، خزانے اور خود اپنی حفاظت کے لیے اپنے محافظ دستے کی تعداد میں اضافے کے خواہش مند ہیں۔'' رانی بالآخر اپنا مدعا زبان پر لے ہی آئی۔

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں، یور ہائی نیس'' میجر اسکین نے اسے فوری اجازت دے دی۔

''میں کیولری کے کچھ نوجوان بھی محل پر متعین کردوں گا تا کہ بہ وقت ضرورت وہ آپ کے محافظوں کے مدد کرسکیں۔''

رانی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میجر اسکین نے اسی روز کیولری کے دس جوانوں کی ڈیوٹی مستقل طور پر رانی محل پر لگا دی۔ اس دستے کے سربراہ رہ کا نام کالا خان تھا لیکن اگلے ہی روز اس نے اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ انگریزوں کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر رانی سے وفاداری کا حلف اٹھالیا چنانچہ رانی نے اپنے باقی محافظوں کی بھرتی کا کام اسی کے سپرد کردیا۔

مئی کے آخری ہفتے میں جھانسی میں متعین بارہویں مقامی انفنٹری کے سپاہیوں میں چپاتیاں اور کنولی کے پھول تقسیم کیے گئے تو ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا۔

2 جون کو چند مقامی سپاہیوں نے رات کی تاریکی میں ایک بنگلے کو آگ لگا دی لیکن کرنل ہنری کے سمجھانے پر اگلا دن اور رات سکون سے گزر گئے۔

مگر 4 جون کی سہ پہر مبینہ طور پر فیض علی، کالا خان اور سپاہیوں نے رانی کے نئے محافظوں کے ساتھ اسٹار فورٹ پر دھاوا بول دیا۔ انہوں نے ہتھیاروں پر قبضہ کیا اور فائرنگ شروع کردی۔ حملہ آوروں نے قلعہ میں موجود کچھ رقم اور خزانے کو بھی لوٹ لیا۔

کرنل ہنری اور میجر اسکین کو جیسے ہی اس واقعے کی خبر ملی انہوں نے کیمپ میں موجود اپنی عورتوں اور بچوں کو فوری طور پر محفوظ مقامات پر منتقل کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ اسٹار فورٹ خود انگریزوں نے حال ہی میں تعمیر کیا تھا اور اس کی حفاظت کے سخت ترین انتظامات کیے گئے تھے لیکن باغی یہ دفاعی حصار توڑنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

مگر یہ وقت اس بحث کا نہیں تھا۔ عورتوں اور بچوں کی حفاظت ان کی سب سے پہلی ترجیح تھی چنانچہ میجر اسکین ایک بار پھر رانی کے روبرو تھا۔

''ہمیں خبر ملی ہے کہ باغیوں نے اسٹار فورٹ پر حملہ کرکے رقم، خزانے اور ہتھیاروں پر قبضہ کرلیا ہے۔'' اس بار بھی بات چیت میں پہل رانی نے ہی کی۔ ''ہمیں اس واقعے پر بے حد افسوس ہے۔''

''اگر آپ برا محسوس نہ کریں، یور ہائی نیس! تو میں ایک شکایت کرسکتا ہوں۔'' میجر اسکین

نہایت عاجزی سے بولا۔

''اجازت ہے'' حکم شاہی صادر ہوا۔

''ہماری اطلاعات کے مطابق حملہ آوروں میں آپ کے محافظ دستے کے ارکان بھی موجود تھے۔'' میجر اسکین ڈرتے ہوئے بولا۔ ''فیض علی، کالا خان.....''

''ہمیں الزام تراشی پسند نہیں میجر!'' رانی نے اسے ٹوک دیا۔ ''ہم دوست ہیں اور اس وقت تک دوست رہیں گے جب تک آپ لوگ اس دوستی کا لحاظ کریں گے.....ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اسٹار فورٹ پر حملے میں ہم یا ہمارا کوئی آدمی ملوث نہیں۔''

''آئی ایم سوری یور ہائی نیس۔'' میجر اسکین نے سر جھکا لیا۔

''اور آج پہلی اور آخری بار ہم ایک بات آپ کو سمجھائے دیتے ہیں۔'' رانی تیز لہجے میں بولی ''ہم راجپوت ہیں اور چھپ کر یا پیچھے سے وار کرنے پر یقین نہیں رکھتے لہٰذا جس دن ہم آپ کے مقابلے پر آئیں گے، علی الاعلان آئیں گے۔ اس طرح چھپ کر وار نہیں کریں گے۔''

''میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، یور ہائی نیس۔'' میجر اسکین نے دوبارہ معذرت کی۔

''اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟'' رانی نے سوال کیا۔

''ہمیں یقین ہے کہ ہم جلد ہی صورت حال معمول پر لے آئیں گے لیکن اس مشکل وقت میں آپ کو بہر طور ہماری مدد کرنا ہوگی۔'' میجر اسکین نے درخواست کی۔

صورت حال کی سنگینی کے باوجود رانی کو ہنسی آ گئی۔

''آپ کی درخواست مضحکہ خیز نہیں ہے، میجر؟'' رانی نے سوال کیا۔ ''آپ ایک ایسی عورت سے مدد مانگنے آئے ہیں جس کے پاس کوئی فوج ہے نہ ہتھیار۔''

''ہمیں علم ہے، یور ہائی نیس۔'' میجر اسکین نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کے باوجود ہم آپ سے مدد کے طالب ہیں۔''

رانی نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ میجر اسکین بھی خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ ''ہاں، ایک صورت ہو سکتی ہے'' بالآخر رانی نے سکوت توڑا۔

''وہ کیا، یور ہائی نیس؟'' میجر اسکین کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''اگر تم لوگ راضی ہو تو ہم لوگوں کی حفاظت کے لیے اپنی فوج جمع کرنے کی کوشش کر سکتے

ہیں۔'' رانی نے پیشکش کی اور میجر اسکین نے فوری طور پر اسے تسلیم کرلیا۔

ذرا دیر بعد جب میجر اسکین اس کے محل سے رخصت ہو رہا تھا تو رانی کے لبوں میں فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ انگریزوں کو انہی کے جال میں پھنسا کر اپنے راستے کی رکاوٹیں دور کرتی جا رہی تھی۔

اسی شام اس نے اپنے وفاداروں کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں فیض علی، کالا خان، غلام غوث خان، دولت خان، خدا بخش، لالہ باہو بخش، موتی بائی، سندر، مندر، کاشو بائی، دیوان رگھوناتھ سنگھ، دیوان جواہر سنگھ اور رام چندر راؤ دیش مکھ کے علاوہ رانی کا ذاتی اور وفادار محافظ گل محمد شامل تھے۔

رانی نے اس اجلاس میں صرف ایک حکم صادر کیا تھا کہ ریاست جھانسی کی منتشر افواج کو از سرِ نو منظم اور ہتھیاروں سے لیس کیا جائے۔

اجلاس ابھی جاری تھا کہ رانی کو کرنل ہنری کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ایک ہی دن میں انگریز افسروں کے بار بار آنے کا مطلب یہ تھا کہ حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں اور انگریز بُری طرح خوف زدہ ہیں۔ وہ اس بات سے بھی بہ خوبی آگاہ تھے کہ ان کی آخری مدد گار صرف رانی ہی ہو سکتی ہے۔

کرنل ہنری، ملاقاتی کمرے میں رانی کا منتظر تھا۔ رانی اندر داخل ہوئی تو اس نے اٹھ کر اسے تعظیم دی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا لیکن خود اس کے اپنے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

رسمی جملوں کے بعد کرنل نے رانی کو آگاہ کیا کہ ذرا دیر پہلے باغیوں نے چھاؤنی میں ایک انگریز افسر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔

''ہم نے میجر اسکین کو ہر قسم کی مدد کا یقین دلایا ہے، کرنل۔'' رانی نے اسے بتایا۔

''آپ کی نہایت مہربانی، یور ہائی نیس۔'' کرنل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے اس کی رپورٹ مل چکی ہے۔''

''تو اب بتائیے کہ ہم اس کے سوا کیا کر سکتے ہیں؟'' رانی نے پوچھا۔

''ہم مرد ہیں اس لیے اپنے لیے خوفزدہ نہیں۔'' کرنل ہنری نے جواب دیا۔ ''لیکن ہم اپنے بیوی بچوں کے لیے آپ کے محل میں پناہ چاہتے ہیں۔''

رانی کے مشیر اور دوست احباب اسے پہلے ہی مشورہ دے چکے تھے کہ وہ انگریزوں سے محدود پیمانے پر تعاون کا وعدہ کرے لیکن ان کے ذاتی تحفظ کی ذمہ داری قبول نہ کرے کیونکہ وقت پڑنے پر وہ گھٹنوں کے بل جھک جانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ البتہ جب وہ محفوظ ہوں گے تو زخمی سانپ کی طرح پلٹ کر حملے سے دریغ نہیں کریں گے۔

رانی کو یہ مشورہ دینے والے اب بھی دوسرے کمرے میں اس کی آمد کے منتظر تھے۔ وہ چاہتی تو انگریزوں کو منع کر سکتی تھی۔ ٹاؤن فورٹ اور اسٹار فورٹ دونوں انگریزوں کے قبضے میں تھے اور وہ اپنے اہل خانہ کو کہیں بھی منتقل کر سکتے تھے۔

ایک لمحے کے لیے رانی کے ذہن میں بھی آیا کہ انگریزوں کی یہ درخواست کوئی چال ہی نہ ہو۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس قسم کا کوئی وعدہ اس کے مشیروں اور دوستوں کی ناراضی کا سبب بھی بن سکتا ہے لیکن اس نے سر جھٹک کر گویا ساری فکروں کو ذہن سے نکال پھینکا۔

''فکر نہ کرو آفیسر!'' اس نے پوری استقامت اور عزم کے ساتھ کہا۔ ''ہماری جنگ برطانوی مردوں کے خلاف ہے۔ ان کی عورتوں یا بچوں کے خلاف نہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہماری پناہ میں آنے والے، بھگوان کی کرپا سے محفوظ رہیں گے کیونکہ اگر ہم اپنے سپاہیوں پر نظر نہیں رکھ سکتے تو پھر ان کی سربراہ کس طرح ہو سکتے ہیں..... ہم اعلان کرتے ہیں کہ برطانوی خواتین اور بچوں کو فوری طور پر محل میں پناہ دی جاتی ہے۔''

کرنل ہنری، رانی کا شکریہ ادا کر کے فوراً واپس چھاؤنی روانہ ہو گیا تا کہ جلد از جلد عورتوں اور بچوں کو محل منتقل کیا جا سکے۔

لیکن جب رانی نے اپنے رفقاء کو اس کی بابت بتایا تو انہوں نے دبے الفاظ میں احتجاج ضرور کیا مگر رانی کو اس کے فیصلے سے روکا نہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ رانی جو کچھ کہہ آئی ہے وہ پتھر پر لکیر ہے اور وہ کبھی اپنے موقف سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوگی۔

اسی شام انگریز عورتوں اور بچوں کو محل منتقل کر دیا گیا لیکن بعض برطانویوں نے ٹاؤن فورٹ جانے کو ترجیح دی۔

تاریخ گواہ ہے کہ رانی نے پوری جنگ کے دوران اپنے محل میں مقیم برطانوی عورتوں اور بچوں کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ ان کے طعام و قیام کا بھی مکمل خیال رکھا۔

لیکن ٹاؤن فورٹ میں پناہ لینے والے باغیوں سے نہ بچ سکے۔ وہ پانچ دن وہاں محصور رہے اس دوران باغیوں نے سات مرتبہ قلعہ کی دیوار پر ہلہ بولا لیکن کامیاب نہ ہو سکے مگر اس دوران انگریزوں کے پاس خوراک اور پانی ختم ہو گیا اور بندوقوں کے لے گولیاں بھی نہ بچیں۔

میجر اسکین، ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے ٹاؤن فورٹ میں پناہ لی تھی۔ اسے اپنی اور جوانوں کی فکر نہ تھی لیکن جب بچے، بھوک اور پیاس سے بلکنے لگے تو اس نے تین افراد کو سفید جھنڈے دے کر رانی کے پاس بھیجا مگر رانی اس وقت تک اتنی طاقت حاصل نہ کر پائی تھی کہ باغیوں کے خلاف کوئی موثر کارروائی کر سکتی۔ پھر بھی اس نے ایلچیوں کو ہر ممکن مدد اور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔

لیکن ان کی جانب سے کسی کارروائی سے پہلے ہی میجر اسکین نے باغیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کر دی۔ اور قلعے کے گیٹ کھول دیئے۔ باغی سب کو جوکن باغ لے گئے جہاں انہیں گولی سے اڑا دیا گیا۔ مرنے والوں میں کلکٹر شور کے علاوہ اینڈریوز، گورڈن، برجس، ٹید، ٹرن بل اور میجر اسکین وغیرہ شامل تھے۔ میجر اسکین کی گردن تلوار سے اڑائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے اپنی بیوی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن جواب میں باغیوں نے قہقہے لگائے اور اسے ٹھڈے مارے۔ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ جب اس نے چلا چلا کر باغیوں کو بزدلی کے طعنے دیئے تو جیل کے داروغہ بخش علی، جو باغیوں میں شامل تھا، نے اس کی گردن کاٹ ڈالی۔

یہ سب عورتوں اور بچوں کے سامنے کیا گیا۔ وہ چیختے چلاتے رہے لیکن باغی ان کی نگاہوں کے سامنے خون کی ہولی کھیلتے رہے۔

مردوں کے بعد عورتوں کی باری آئی۔ میجر اسکین کی خوبصورت بیوی نے باغیوں سے کہا کہ وہ اسے بے شک زندہ جلا دیں مگر بچوں کو کچھ نہ کہیں۔ جواب میں اسے زمین پر گرا دیا گیا اور وہ اسی حالت میں قتل کر دی گئی۔ اسی طرح عورتوں کے بعد بچوں کی باری آئی اور انہیں ہتھوڑوں اور چاقوؤں کی مدد سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا اور پھر انہیں بے گور و کفن جوکن باغ میں ہی چھوڑ دیا گیا۔

اس طرح 8 جون 1857ء کو مجموعی طور پر چھیاسٹھ برطانویوں کو جوکن باغ، جھانسی میں موت کے گھاٹ اتارا گیا جن میں تیس مرد، سولہ عورتیں اور بیس بچے شامل تھے۔

قتل عام کے بعد بغیر کسی کماندار اور سربراہ کے لڑنے والی اس فوج نے لوٹ مار کے ارادے سے شہر کا رخ کیا۔

رانی کو اس سانحے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ اپنے چند محافظوں کے ساتھ جوکن باغ جانے کے لیے محل سے نکلی لیکن باغیوں نے اسے راستے میں روک لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ رانی ان کے راستے سے ہٹ جائے تاکہ وہ شہر میں لوٹ مار کر کے اپنے لیے رقم اور اشیائے خورد و نوش حاصل کر سکیں۔

لیکن رانی نے اپنے ذاتی زیورات اور رقم ان کے حوالے کر کے انہیں لوٹ مار سے باز رکھا چنانچہ یہ آوارہ اور سرپھری فوج دہلی روانہ ہوگئی۔

اگست 1857ء کے اوائل میں رانی نے کچھ مرہٹہ سواروں اور چند سو پیدل سپاہیوں کا ایک دستہ تیار کر لیا جن کے پاس نصف درجن کے لگ بھگ توپیں بھی تھیں۔ رانی نے انہیں خزانے سے باقاعدہ اور مستقل تنخواہ دینے کا وعدہ کیا جب کہ سواروں اور جوانوں نے مرتے دم تک اس کا وفادار رہنے کا حلف اٹھایا۔

وہ دل سے انگریز کی وفادار کبھی نہیں تھی بلکہ صرف ریاست کے مفاد کی خاطر وہ انگریزوں کو اپنا دوست کہتی تھی لیکن جنگ آزادی شروع ہونے کے بعد اسے توقع نہیں تھی کہ اب انگریز کسی بھی مرحلے پر اس کی دوستی پر اعتماد کریں گے۔ جوکن باغ کے واقعہ میں رانی قطعی طور پر ملوث نہیں تھی لیکن اس کے جاسوسوں نے اسے اطلاع دی تھی کہ انگریزوں نے اسے اس قتل عام کا باقاعدہ اور باضابطہ ذمہ دار ٹھہرا دیا ہے اور جنرل سر ہوگ روز کو اسے سزا دینے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔

اب انگریزی سرکار اسے ''دوست رانی'' کے بجائے ''باغی رانی'' اور ''غدار ملکہ'' کے ناموں سے یاد کرنے لگی تھی۔

رانی کو ان اطلاعات پر کوئی افسوس نہ تھا۔ وہ روز اول سے جھانسی کی سرزمین کی وفادار تھی اور اسی کی خاطر مرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جونہی اسے تھوڑی سی پشت پناہی حاصل ہوئی اس نے جھانسی سے خانہ جنگی ختم کرنے کی آڑ میں اچانک کارروائی کی۔ سرداروں اور کمانداروں نے بیک زبان رانی سے درخواست کی کہ وہ ریاست کا نظم و نسق سنبھال لے۔ رانی رضامند ہوگئی اور ریاست کا

پرچم ایک بار پھر قلعے کی سب سے بلند ڈیوڑھی پر لہرانے لگا۔

رانی کو علم تھا کہ جنرل ہوگ روز کی قیادت میں انگریزوں کی جنوبی افواج شمال میں گوالیار اور بندھیل کھنڈ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں لیکن اسے یقین تھا کہ برطانوی افواج موسم سرما ختم ہونے سے پہلے جھانسی نہیں پہنچ پائیں گی۔ اس کا خیال تھا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ خود کو اس قدر مضبوط کر لے گی کہ جنرل ہوگ روز کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکے۔

چنانچہ اس نے جھانسی میں جنگی تیاریوں کی عام اجازت دے دی اور جھانسی کا ہر گھر اسلحہ تیار کرنے والے کارخانے میں تبدیل ہو گیا۔ رانی براہ راست ان تیاریوں کی نگرانی کر رہی تھی۔

لیکن چند دن کے اندر اندر ہی رانی کو ایک نئے خطرے کی آہٹ سنائی دینے لگی۔

سدھاشیو راؤ نامی ایک شخص نے یہ سوچ کر کہ اب جھانسی کی حکمرانی ایک کمزور عورت کے ہاتھ میں ہے، ریاست کے ایک حصے میں بغاوت کر دی اور اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا لیکن رانی آندھی وطوفان کی طرح وہاں پہنچی اور عقاب کی طرح اس پر جھپٹی۔ راؤ کی بغاوت فرو کرنے میں اس بہادر عورت کو پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں لگے تھے۔

ستمبر میں رانی کو مزید دو امتحانات سے گزرنا پڑا لیکن وہ ان میں بھی سرخرو ہوئی۔ اس کی ہمسایہ ریاستوں آرکا[25] اور داتیا[26] کے راجاؤں نے انگریزوں کے ایماء پر رانی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا لیکن اس نے جھانسی کی حدود کا نہ صرف کامیاب دفاع کیا بلکہ دشمنوں کو اس حد تک کچل دیا کہ وہ دوبارہ کبھی جھانسی کی جانب میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکیں۔

لیکن اس دوران رانی، انگریزوں کی طرف سے بھی غافل نہیں تھی۔ وہ جنرل ہوگ روز کی پیش قدمی اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ تھی۔ انگریزی افواج میں موجود اس کے مخبر روزانہ اس کے لیے نئی خبریں لاتے۔

جنرل روز ابھی تک اودھ، روہیل کھنڈ اور بندھیل کھنڈ میں الجھا ہوا تھا۔ بچے کھچے فوجی اب بھی اس کی مزاحمت کر رہے تھے لیکن انگریزوں کو علم تھا کہ جھانسی اب تک باغیوں کی آخری امید ہے لہٰذا وہ جب تک جھانسی کو سرنگوں نہ کر لیتے، ان کے خیال میں بغاوت کا مکمل خاتمہ ناممکن تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جھانسی اب ان کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوگا کیونکہ انتظامی اختیارات ملنے کے بعد رانی نے جھانسی کو بہت تیزی سے ترقی دی تھی۔

اب رانی کے پاس دس ہزار افراد اور قلعے کی مضبوط دیواروں کے علاوہ لبالب بھرا خزانہ تھا۔ اس کی فوجیں، جھانسی کے سرخ پرچم تلے پوری طرح منظم تھیں۔ اس نے عورتوں کی ایک علیحدہ فوج تشکیل دی تھی جو مردانہ فوج کی نگرانی کرتی تھی۔ رانی نے اپنے ذاتی محافظوں کے طور پر صرف مسلمان پٹھانوں کا انتخاب کیا تھا جو سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتے۔

اب جھانسی کے پاس کوئی درجن بھر توپیں تھیں جن میں سے اس نے کئی توپوں کے مختلف نام بھی رکھ چھوڑے تھے۔ ان میں ''مائٹی روڈ''..... ''بھوانی شنکر''..... ''کڑکتی بجلی'' وغیرہ شامل تھے۔ رانی نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی مکمل فوجی تیاریوں کا حکم دیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ توپوں سمیت ہر ہتھیار چلانے میں مردوں اور عورتوں کو یکساں مہارت حاصل تھی۔

پرانے ہتھیاروں کو تیز دھار بنا لیا گیا تھا جب کہ نئے ہتھیار ڈھیروں کی تعداد میں تیار کرائے گئے تھے۔ رانی کم وبیش روزانہ ریاست کے اسلحہ خانوں کا معائنہ کرتی اور اپنی چاق و چوبند فوج کی سلامی لیتی۔ اس نے زنانہ لباس کو مکمل طور پر خیرباد کہہ دیا تھا اور اب وہ ہر وقت جنگی لباس میں ہی نظر آتی تھی۔

ایک روز رانی کے ایک مخبر نے اسے ایک ایسی خبر سنائی جس پر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ مخبر کے بقول گورنر جنرل ہندوستان لارڈ کیننگ نے باقاعدہ احکامات جاری کیے ہیں کہ رانی جھانسی کو زندہ گرفتار کیا جائے۔

''مگر کیوں؟'' رانی نے بے ساختہ پوچھا۔ ''اس نے ہزاروں برطانویوں کو مقامی باغیوں کی بھینٹ چڑھا دیا ہے جب کہ لاکھوں ہندوستانی اس کی افواج کے ہاتھوں مارے گئے ہیں، اگر ہم بھی اسی طرح مارے جائیں گے تو اسے کیا فرق پڑے گا؟''

''اگر آپ عمر رسیدہ ہوتیں تو ایسا ہی ہوتا۔'' مخبر نے جواب دیا۔ ''جھانسی پر قبضہ کرنا اور ایک بوڑھی رانی کو گولی سے اڑا دینا انگریزوں کے لیے نہایت آسان ہوتا۔''

''حیرت ہے؟'' رانی نے بھویں اچکائیں۔ ''اتنے بڑے ملک کا گورنر جنرل، بائیس سال کی ایک عورت کے سلسلے میں اتنا محتاط ہے۔''

''محتاط نہیں ہے، مہارانی''۔ مخبر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ ایک نوجوان اور خوبصورت باغی شہزادی کی موت سے خوفزدہ ہے کیونکہ اس وقت وہ پورے ہندوستان میں شہرت حاصل کر چکی

ہے اور لارڈ کیننگ کو ڈر ہے کہ کہیں اس باغی ملکہ کی موت اس مقبوضہ ملک میں کسی نئی بغاوت کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔''

''بے وقوف!'' رانی کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اس نے آپ کو انڈین جون آف آرک کا خطاب دیا ہے۔'' مخبر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ''اور حکم دیا ہے کہ خواہ کتنے ہی مقامی یا برطانوی کیوں نہ مارے جائیں، آپ کو زندہ گرفتار کیا جائے.....صرف زندہ۔''

''اوہ!'' رانی نے ہونٹ سکوڑے۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر وہ یہ حسرت لیے ہی اگر دنیا سے نہیں تو ہندوستان سے واپس ضرور جائے گا۔ اسے ہماری لاش جھانسی کی کسی گلی سے اٹھانی ہوگی۔ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ برطانوی ہمیں زندہ جھانسی کی حدود سے باہر لے جائیں، تاوقتیکہ ہم خود نہ چاہیں .....''

رانی نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شاید اسے کوئی نئی بات یاد آ گئی تھی۔

''کیا ہماری زندہ گرفتاری کے لیے کوئی خاص منصوبہ بھی تشکیل دیا گیا ہے؟'' اس نے مخبر سے سوال کیا۔

''ابھی اس بارے میں کوئی علم نہیں۔'' مخبر نے جواب دیا۔ ''آپ کی زندہ گرفتاری کو ممکن بنانے کی تمام تر ذمہ داری جنرل ہوگ روز کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔''

''لیکن کیا ہمیں اس بابت پتا چل سکے گا؟''

''کیوں نہیں مہارانی؟'' مخبر نے سر جھکایا۔ ''یہ راجپوت وچن دیتا ہے کہ جان ہار جائے گا لیکن اپنی مہارانی کو زندہ انگریزوں کے ہاتھ نہیں لگنے دے گا۔''

سر ہوگ روز کی قیادت میں برطانوی مسلح افواج مارچ کے تقریباً وسط میں جھانسی پہنچیں اور جنرل نے خیمے لگانے کے اگلے ہی روز مہارانی کو پیغام بھیجا کہ وہ غیر مسلح ہو کر اپنے دوستوں کے ہمراہ اس سے ملاقات کرے۔

لیکن رانی نے انکار کر دیا۔

اور جواب میں کہلایا کہ ہر ہم صرف اپنی فوج کے ساتھ ہی کسی ملاقات کے لیے جاسکتے ہیں تنہا نہیں۔

جنرل ہوگ روز کے لیے یہ جواب غیر متوقع نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے چند دن انتظار کیا اور بالآخر 23 مارچ 1858ء کو جھانسی کی رانی لکشمی بائی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

جنرل ہوگ کے احکامات کے ساتھ ہی برطانوی توپوں نے آگ اگلنی شروع کر دی۔ وہ شہر کے دفاع کو توڑنے کی کوششوں میں مصروف تھیں تا کہ قلعہ کے اندر داخل ہوا جاسکے لیکن ابتدائی ایک ہفتہ کے دوران جنرل ہوگ کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

باغیوں کی دفاعی پوزیشنیں بے حد مضبوط تھیں اس لیے جنرل روز کی ناکامی پر کوئی حیرت نہیں کی جاسکتی تھی۔ جھانسی کی مضبوط دیواریں، چمکتے سورج کی گرمی میں اب بھی مضبوط کھڑی تھیں۔ قلعے پر رانی جھانسی کا سرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ دیواروں کے آس پاس برطانوی فوجوں کے غول کے غول جمع تھے جو وقفے وقفے سے قلعے پر گولہ باری کرتے لیکن اندر سے انہیں پیش قدمی کا موقع نہ دیا جاتا۔ دیواروں کے عقب میں رانی کے دس ہزار جیالے موجود تھے جو جی داری اور انتہائی مردانگی سے انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔

گولہ باری سے قلعے کی دیواروں کے کئی حصے کمزور ہو گئے تھے اور کسی بھی لمحے ان میں شگاف ہو سکتے تھے۔ جونہی یہ شگاف بڑے ہوتے، رات کی تاریکی میں برطانوی فوجی قلعے پر ٹوٹ پڑتے اور پھر اندر موجود ہر ذی روح ان کے رحم و کرم پر ہوتا۔

لیکن انگریزوں کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ رانی کو کس طرح محفوظ رکھا جائے جب کہ اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ رضا کارانہ طور پر ہتھیار ڈال دیتی۔

26 مارچ کو صبح ہوتے ہی برطانوی فوجوں کی گنوں نے گولے اگلنے شروع کر دیئے جن کے دھماکوں سے زمین بری طرح لرز رہی تھی۔ فضا اس قدر دھواں دھار تھی کہ خود گنرز تک ان میں چھپ گئے تھے۔ وہ چیونٹیوں کی مانند ادھر ادھر رینگ کر گنیں لوڈ کر رہے تھے تا کہ دشمن کی نگاہوں میں نہ آئیں۔ دور دور تک جہاں نگاہ جاتی برطانوی کیولری کے کیمپ تھے۔ لائٹ ڈریگنز کی سرخ جیکٹس اور حیدر آبادی ٹروپرز کے خاکی کوٹ صاف دکھائی دے رہے تھے۔

دو میل کے فاصلے پر پرانی چھاؤنی (جو باغیوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئی تھی) کے کھنڈرات کے

پاس انفنٹری بریگیڈ کے خیموں کی نہ ختم ہونے والی قطار تھی جو اس بات کے منتظر تھے کہ کب گنیں جھانسی شہر کی فصیل میں شگاف ڈالیں اور کب وہ پیش قدمی شروع کریں۔ سب کی نگاہیں شہر کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جہاں کئی جلنے والی عمارتوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔

اسی دھوئیں کے پار، رانی جھانسی اپنے فوجی سرداروں کے ساتھ اہم اجلاس میں مصروف تھی اور اس کے نزدیک سب سے اہم اور فکر انگیز بات یہی تھی کہ جھانسی کا دفاع ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ جنرل روز نے اب تک لڑائی کے ساتھ ساتھ رانی کو جو پیغامات بھجوائے تھے اس نے اپنے سرداروں کو ان کی بابت بھی اعتماد میں لیا۔

''جنرل روز نے ہمیں صلح صفائی کے کئی پیغامات بھیجے ہیں۔'' رانی نے اپنے سرداروں کو آگاہ کیا۔ ''لیکن ہم نے ابھی تک اسے کوئی مثبت جواب نہیں دیا۔ اس کا خیال ہے کہ شاید ہم اپنی آبادی پر گولہ باری زیادہ عرصے تک برداشت نہ کر سکیں کیونکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ گولہ باری کے بعد پیدل فوج آگے آئے گی جو ہمارے لوگوں کو کاٹ کر رکھ دے گی۔ اس کا یہ خیال بھی ہے کہ ایک عورت کی حیثیت سے شاید ہم اتنے جی دار نہ ہوں کہ اس قتل عام کا نظارہ کر سکیں.....''

رانی نے چند ثانیے رک کر اپنے سرداروں کو دیکھا پھر گویا ہوئی۔ ''آپ لوگوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔

''ہمیں اپنی رانی کی جی داری اور بہادری پر کوئی شبہ ہے نہ اس کی وفاداری پر کوئی شک۔'' ایک سردار نے بہ آواز بلند کہا۔ ''ہم مہارانی کو اختیار دیتے ہیں وہ جھانسی کے مفاد میں جو بھی فیصلہ کریں ہمیں منظور ہوگا۔''

سب نے سردار کی تائید کی اور اجلاس اس عزم کے ساتھ اختتام پذیر ہوا کہ ان سب کا جینا مرنا صرف اور صرف رانی کے لیے ہوگا۔

لیکن اگلے تین دن جھانسی پر واقعی بھاری گزرے۔

اس عرصے میں انگریزی توپیں جنوبی دیوار میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گئیں اور جو لوگ اس شگاف کی مرمت کرنے آگے بڑھے انہیں بھی ہلاک کر دیا گیا۔ آٹھ انچ کے مارٹروں نے جھانسی کی گن پوسٹوں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ صورت حال اس حد تک انگریزوں کے حق میں ہو گئی کہ 29 مارچ 1858ء کو جنرل روز نے اپنی انفنٹری کو پیش قدمی کے احکامات دے دیئے لیکن دوسری

طرف وہ بدستور رانی کو زندہ سلامت پکڑنے کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔

جنرل روز کے خیمے میں جو اعلیٰ انگریز افسران موجود تھے ان میں سے ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ اگر ہماری انفنٹری، جھانسی میں داخل ہو گئی تو رانی کو زندہ گرفتار کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ وہ یقیناً جنگ میں حصہ لیتی اور بالآخر ماری جاتی۔

''نہیں'' جنرل ہوگ نے اچانک ہی بہ آواز بلند کہا اور نفی میں زور زور سے سر ہلانے لگا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی شیطانی تدبیر آ گئی تھی۔

''دس بارہ دن سے جھانسی کی ننھی سی ریاست فتح و شکست کے گھٹتے بڑھتے سائے دیکھ رہی ہے۔'' جنرل ہوگ نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ ''کسی ایک فتح سے حاصل ہونے والی ان کی خوشی اگلے ہی لمحے کسی شکست کے دکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوران رانی کے بہت سے وفادار سردار اس کا ساتھ چھوڑ گئے ہوں گے یا رانی پر قربان ہو گئے ہوں گے لیکن باہر سے رانی کو کوئی مدد نہیں پہنچی جس کا کہ اسے یقینی طور پر انتظار ہوگا.....''

وہ چند ثانیے رکا لیکن اس نے اپنی بات جاری رکھی ''.....ایسے میں ہمیں اسے دھوکے سے باہر لانا ہوگا۔ ایک امکان یہ ہے کہ ہم شہر پر دھاوا بول دیں لیکن اس کے لیے راستہ کھلا رکھیں۔ اگر ہم آرکا گیٹ سے اپنی کیولری پکٹس ہٹا لیں تو وہ لوگ ہماری اس کمزوری کو بھانپ لیں گے اور جب ہماری باغی خاتون یہ دیکھے گی کہ اس کے شہر پر گولہ باری ہو رہی ہے تو یقیناً فرار ہونے کے بارے میں سوچے گی ___ میں نے سنا ہے کہ وہ ایک برٹش لانسر کی طرح بلا کی شہ سوار ہے اس لیے وہ تانتیا توپ یا کسی اور باغی لیڈر سے جا ملنے کے لیے یقینی طور پر شہر چھوڑ دے گی اور ہم آرکا روڈ پر اس کے منتظر رہیں گے.....''

اجلاس کے تقریباً تمام شرکاء نے جنرل ہوگ روز کی اس تجویز اور منصوبے کی تائید کی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ بتانے سے قاصر تھا کہ رانی کو آخر فرار کی ترغیب کس طرح دی جائے گی؟

اگلے چار روز جنرل ہوگ روز نے اسی منصوبے پر سر کھپانے میں صرف کر دیئے لیکن کوئی قابل عمل صورت نظر نہ آئی حتیٰ کہ تانتیا توپ، بیس ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر جھانسی واگزار کرانے کے لیے اس کے عقب میں آ پہنچا۔

جنرل ہوگ روز کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید گھبرا جاتا کیونکہ سامنے جھانسی کے دس ہزار باغی اور عقب میں تانتیا توپ کے بیس ہزار فوجی تھے۔ دونوں بیک وقت حملہ کرتے تو انگریزوں کو پیس کر رکھ دیتے۔

لیکن جھانسی کی حالت دگرگوں تھی اور جنرل ہوگ روز نے اسی سے فائدہ اٹھایا۔

اس نے اپنی بھاری آرٹلری کو بدستور محاصرے پر چھوڑا اور باقی فوج لے کر تانتیا پر حملہ آور ہوا۔ اسی وقت اس نے جھانسی پر حملے کا حکم بھی دے دیا تھا تاکہ ان لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو سکے جو تانتیا کے آنے کی خبر سن کر جنرل روز پر جوابی حملے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

تانتیا کو سزا دینے میں صرف دو دن لگے لیکن جنرل روز کے سپاہی اگلے تین دن تک جھانسی میں داخل نہ ہو سکے۔

مگر آخر کار جھانسی سرنگوں ہونا شروع ہو گیا۔

جنرل ہوگ روز کی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں تو رانی نے خود ہتھیار اٹھا لیے۔ اس نے مردانہ لباس زیب تن کیا اور جنگ کی دیوی کی طرح انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ جس محاذ پر بھی وہ لڑی، اس نے انگریزی فوج کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی فوجوں کے نظم و ضبط، اس کی قائدانہ صلاحیتوں اور خود اس کے ذاتی طریقہ جنگ سے جنرل ہوگ روز جیسا شخص حیران رہ گیا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہندوستان میں رانی جھانسی جیسی بھی کوئی عورت ہوگی۔ اس نے برسر محفل رانی کو بہترین اور بہادر ترین سپہ سالار کا خطاب دیا۔

کامیابی کا امکان نہ ہونے کے باوجود رانی نے کم و بیش سات روز تک جھانسی کا دفاع کیا لیکن جب صورت حال اس کے قابو سے باہر ہو گئی تو اس نے شام کے وقت اپنا دربار طلب کیا جواب بھی موجود تھا جب کہ رانی بدترین صورت حال کے باوجود پہلے جیسی تمکنت اور وقار کے ساتھ دربار میں آئی۔

اس نے درباریوں کے سامنے صرف چند جملے کہے کیونکہ جھانسی کی ایک ایک اینٹ گزرے دنوں کی کہانیاں سنا رہی تھی۔

''ہمارے کماندار، بہادر سپاہی، وفادار اور توپچی اب ہمارے ساتھ نہیں''۔ رانی کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ''شہر کے چھ ہزار سپاہیوں کے علاوہ قلعے میں ہمارے چار ہزار سپاہی تھے جن میں

سے اب چار سو بھی نہیں بچے۔ اس لیے ہمیں ہر حال میں ایک نئی فوج ترتیب دے کر از سر نو حملہ کرنا ہوگا''۔

تمام اہل دربار نے بیک وقت اور بیک زبان رانی کی تائید کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ رانی کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتی۔

چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا، لیکن ماحول روشن تھا۔

یہ روشنی قلعے کی دیواروں کی دوسری جانب پھٹنے والے گولوں کی سرخی سے پیدا ہو رہی تھی۔ فضا میں بارود کی بو رچی ہوئی تھی اور قلعے کے باہر کئی عمارتوں سے اٹھنے والے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔

یہ محل کا ایک چھوٹا سا صحن تھا جو رانی کے سرخ جیکٹوں والے محافظوں سے بھرا پڑا تھا جب کہ ان سے ذرا فاصلے پر تنگ دروازے کے پاس ایک دبلا پتلا گھڑ سوار موجود تھا۔

یہ رانی لکشمی بائی تھی۔

حسب معمول وہ سفید گھوڑے پر سوار تھی جب کہ اس کے پیچھے اس کا سات سالہ بیٹا دامو دھر اس کی کمر سے لپٹا بیٹھا تھا۔

محافظوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا جب کہ گھوڑوں پر سوار دو خدمت گار عورتیں بھی وہاں موجود تھیں۔ رانی اور عورتوں کے چہرے بھاری نقابوں میں پوشیدہ تھے۔

لیکن رانی کے آنسو، بھاری نقاب کے عقب سے بھی واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔

آج وہ ان در و دیوار کو آخری بار دیکھ رہی تھی جہاں اس نے اپنی زندگی کے پندرہ برس گزارے تھے اور بچپن سے نوجوانی میں قدم رکھا تھا۔ یہیں وہ دلہن بن کر آئی تھی اور یہیں بیوگی کا داغ اس کے ماتھے پر لگا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں وہ کبھی شان و شوکت سے حکومت کرتی تھی اور باد بہادری کی مانند اٹھکیلیاں کیا کرتی تھی..... لیکن آج وہ یہاں سے رخصت ہو رہی تھی..... ہمیشہ کے لیے.....

وہ جانتی تھی کہ اب کبھی لوٹ کر یہاں نہ آسکے گی اس لیے وہ ایک ایک تفصیل جیسے اپنی

آنکھوں میں سمو لینا چاہتی تھی۔

رانی کا ذاتی محافظ گل محمد، بہت دیر سے اسی کی جانب متوجہ تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اپنا گھوڑا رانی کے برابر لے آیا۔ ''مزید تاخیر، خطرناک ہو سکتی ہے، مہارانی''۔ اس نے سرگوشی کی۔

اور رانی یوں چونکی جیسے کسی نے اسے اٹھا کر ماضی سے حال میں لا پھینکا ہو۔

''الوداع.....میرے جھانسی.....الوداع.....'' رانی نے دھیرے سے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور وہ اپنے سوار سمیت ایک ہی زقند میں دروازہ عبور کر گیا۔ رانی کے جانثار اپنے اپنے گھوڑوں پر اس کے پیچھے تھے۔

رانی کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ انگریزوں نے آرکا گیٹ پر سے اپنی فوجیں پیچھے ہٹالی ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ رانی کو فرار ہونے دیا جائے لیکن رانی جانتی تھی کہ اس میں بھی انگریزوں کی کوئی چال ہوگی۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ آرکا گیٹ سے باہر نکلتی اور تاک میں بیٹھے ہوئے انگریز اسے گرفتار کر لیتے.....اور وہ ان گوری چمڑی والوں کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتی تھی۔

رانی کے بعض مشیروں نے بھی اسے آرکا گیٹ کے راستے نکلنے کا مشورہ دیا تھا لیکن رانی نے انکار کر دیا۔

رانی کا قافلہ محل سے نکل کر پہلے گلیوں گلیوں گزرتا رہا اور چند موڑ مڑنے کے بعد ایک چوڑی شاہراہ پر جا پہنچا۔ اب سفر تاریکی میں جاری تھا۔ اگلے گھڑسوار البتہ راستہ دکھانے کے لیے کبھی کبھی ٹارچیں روشن کر لیتے تھے لیکن ٹارچیں بجھنے پر، ماحول پھر تاریکی میں ڈوب جاتا۔ اسی طرح سفر کرتے ہوئے قافلہ ایک بڑے دروازے پر جا پہنچا جہاں رانی کے مزید پہرے دار موجود تھے۔

یہ بندھاری گیٹ تھا۔

رانی نے اپنے سفید گھوڑے پر سے جھک کر گارڈ کمانڈر سے کچھ کہا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر رانی کو سلیوٹ کیا اور اپنے ماتحتوں کو احکامات دینے لگا۔ چند ثانیوں میں اس کے دو آدمیوں نے مرکزی دروازے کی رکاوٹ ہٹالی اور رانی کا قافلہ جھانسی کی حدود سے باہر نکل آیا۔

آس پاس مکمل تاریکی تھی لیکن نصف میل کے فاصلے پر انگریزی افواج کی پکٹس کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ پہلے گھوڑے کم رفتار چک سے آگے بڑھتے رہے، پھر ان کی رفتار تیز ہوگئی۔ اب انہوں نے سڑک سے اتر کر میدان میں دائیں جانب کا رخ کر لیا۔

بائیں جانب سے فائرنگ شروع ہوگئی۔شاید انگریزوں کو رانی کے فرار کا علم ہوگیا تھا۔ گولیاں ان کے سروں پر سے سنسناتی ہوئی گزرنے لگیں۔ برطانوی پکٹس اب محض چند سو گز فاصلے پر تھیں۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے جب کہ رانی ان فائروں کے درمیانی راستے کو فرار کے لیے استعمال کر رہی تھی۔ عقب سے بلند آواز میں انہیں للکارا بھی جا رہا تھا لیکن رانی اور اس کے ساتھی اندھا دھند گھوڑے بھگا رہے تھے اور ان کا اٹھنے والا ہر قدم انہیں جھانسی، جنرل روز اور تحفظ سے دور لیے جا رہا تھا۔

رانی ایک ماہر شہ سوار کی طرح گھوڑا دوڑا رہی تھی جب کہ دامودھر بدستور اس کی کمر سے چپکا ہوا تھا۔ ارد گرد پٹھان پہرے دار تھے جنہوں نے ان دونوں کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

جھانسی سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر رانی کو پہلی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک سمت سے اچانک چیخ بلند ہوئی تو سب اس جانب متوجہ ہوگئے۔ ایک پٹھان دائیں جانب اشارہ کر رہا تھا۔ گولی چلی اور دائیں جانب سے گھڑ سواروں کا ایک دستہ نالے میں سے برآمد ہوتا دکھائی دیا۔ وہ تعداد میں رانی کے لوگوں سے کم تھے تاہم ان کا تعلق کمپنی کیولری سے تھا جب کہ لیفٹیننٹ ڈاؤکر ان کا سربراہ تھا۔ وہ تیز رفتاری سے رانی کی جانب بڑھ رہے تھے جب کہ رانی کے پٹھان محافظ تلواریں سونت کر آنے والوں کا انتظار کر رہے تھے۔

پھر رات کی تاریکی میں تلواروں کے ٹکرانے کی آوازیں بلند ہوئیں اور بیک وقت مٹی کے کئی بگولے اٹھے۔ کچھ دیر یہی کیفیت رہی پھر ایک پٹھان کسی کے ساتھ مٹی کے اس طوفان سے باہر نکل آیا۔ وہ رانی کی ایک خدمت گار عورت تھی۔ پھر کچھ اور لوگ باہر آ گئے۔

رانی لکشمی بائی بھی ان میں سے ایک تھی۔ ایک گھڑ سوار، جو خود کمپنی سالار لیفٹیننٹ ڈاؤکر تھا ،اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ تلوار لہرا کر اس پر جھپٹنا ہی چاہتا تھا کہ شیر خان، نامی ایک جانثار نے چیخ کر رانی کو اس کی جانب متوجہ کیا۔

رانی نے اپنے سفید گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے گھمایا۔ اگلے ہی لمحے رانی کی تلوار چمکی، ڈاؤکر اور رانی کی تلواریں آپس میں ٹکرائیں۔ دو تین بار چیخوں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر لیفٹیننٹ ڈاؤکر اپنا بازو پکڑ کر گھوڑے پر جھک گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اگر اسے ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو رانی اسے قتل کر چکی ہوتی۔

لڑائی اس کے بعد بھی جاری رہی لیکن رانی اور اس کے جانثاروں نے انگریزی فوج کے دستے کو مار بھگایا۔ میدان صاف ہو جانے پر اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور اپنی تلوار ایک پٹھان کو تھما کر رومال سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔

تھوڑی دیر وہاں قیام کے بعد رانی نے دوبارہ کوچ کا حکم دے دیا۔ پھر کسی انگریز دستے کو اس کا راستہ روکنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ کالپی پہنچ کر تانتیا توپ اور راؤ صاحب سے جا ملی۔

کالپی میں بھی رانی نے آرام نہیں کیا۔ وہ لگ بھگ ایک ماہ وہاں مقیم رہی لیکن اس نے اپنا ہر دن ایک نئی فوج تیار کرنے میں گزارا۔ تانتیا توپ اور راؤ صاحب نے ہر ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا اور وہ اپنے تئیں یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ اب شاید وہ انگریزوں کے خلاف فتح حاصل کر سکے۔

دوسری جانب جنرل ہوگ روز کو رانی کے یوں آسانی سے فرار ہو جانے کا بے حد رنج تھا چنانچہ اس نے اپنا سارا غصہ جھانسی شہر اور اس کے باسیوں پر اتارا۔ جب انگریزی فوج جھانسی کی اینٹ سے اینٹ بجا چکی اور جنرل ہوگ روز کو یقین ہو گیا کہ جھانسی کی راکھ میں دبی بغاوت کی آخری چنگاری بھی سرد ہو گئی ہو گی تو وہ اپنی فوجوں کے ساتھ کالپی کی جانب بڑھا اور چھوٹے سے شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

لیکن رانی نے یہاں بھی جنرل ہوگ روز کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔

انگریزی افواج کے سامنے ان کی حیثیت مٹھی بھر سواروں سے زیادہ نہ تھی لیکن رانی نے اپنی اس مختصر سی فوج کے ساتھ بھی جنرل ہوگ روز کو کئی بار اپنے زخم چاٹنے پر مجبور کیا۔

مگر جھانسی کی طرح یہاں بھی شکست جب مقدر بن گئی تو رانی نے کالپی کو بھی خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ تجویز یہ تھی کہ رانی لکشمی بائی، تانتیا توپ اور راؤ صاحب ایک ساتھ فرار ہوں لیکن رانی نے مخالفت کی۔

''ہم اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے ضرور پھر رہے ہیں لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں کہ خود ہی شیر کی کچھار میں جا کودیں۔'' رانی کا انداز ناصحانہ تھا۔ ''ہم ایک ساتھ پکڑے گئے تو ہندوستان کی جنگ آزادی اسی جگہ دم توڑ جائے گی جہاں ہم گرفتار ہوں گے۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ ہم علیحدہ

علیحدہ فرار ہوں تا کہ جو بچ جائے وہ آزادی کا پرچم تھامے رکھے۔"

تانتیا توپ اور راؤ جی نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا البتہ یہ طے پایا کہ گوگل پور پہنچ کر مستقبل کے لائحہ عمل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اور یوں رانی، دوسری بار، جنرل ہوگ روز کی آنکھوں میں دھول جھونک کر خود کو اور اپنے بیٹے کو بچا لے گئی۔ اس مرتبہ بھی پٹھان محافظ اور رانی کے دوسرے جانثار اس کے ہمراہ تھے۔

گوگل پور پہنچ کر رانی اور اس کے قافلے نے کچھ دیر درختوں کے ایک جھنڈ میں آرام کیا۔ رات کو کسی وقت تانتیا توپ اور راؤ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ باہم صلاح مشورہ انہوں نے اسی وقت کر لیا چنانچہ صبح جب وہ رانی سے ملے تو ان کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔

"ہمیں آپ دونوں کے چہروں سے مایوسی جھلکتی نظر آ رہی ہے، مرہٹہ سردارو!" رانی نے بڑے تیکھے لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔

"آپ درست کہتی ہیں مہارانی۔" تانتیا توپ نے اعتراف کیا۔ "ہندوستان میں آزادی کی یہ جنگ شروع ہوئے کم و بیش ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے لیکن سوائے انسانی جانوں کے ضیاع کے، اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یہ درست ہے کہ ابتداء میں ہندوستانی سپاہیوں کا پلہ بھاری تھا لیکن جیسے جیسے انگریز سنبھلتے گئے، انہوں نے ہندوستانیوں کو تلوار کی نوک اور بندوق کی نالی پر رکھ لیا۔ یوں اب کوئی ایسا مقام باقی نہیں بچا جس پر انگریزوں نے دوبارہ قبضہ نہ کر لیا ہو۔"

"آپ ہمیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں؟" رانی نے تیوریاں چڑھائیں۔

"میری یہ مجال کہاں، مہارانی۔" تانتیا توپ نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم دو بار انگریزوں سے شکست کھا چکے ہیں....."

"خبردار!" رانی کسی شیرنی کی طرح غرائی۔ "آپ اپنے لیے شکست کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں، ہمارے لیے نہیں۔ جتنے وسائل انگریزوں کے پاس ہیں، اگر ان کے نصف بھی ہمارے پاس ہوتے تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی الگ ہوتا۔ یوں بھی ہم محصور تھے اور وہ آزاد۔ اگر وہ محصور اور ہم آزاد ہوتے تو آج جنرل ہوگ روز ہمارا نہیں بلکہ ہم جنرل ہوگ روز کا تعاقب کر رہے ہوتے۔"

"مگر، مہارانی، کب تک.....؟" اس بار راؤ جی نے دخل اندازی کی کوشش کی لیکن رانی نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ "جب تک ہمارے سر نہیں کٹ جاتے"۔ اس کے لہجے میں

چٹانوں کی سی سختی تھی۔ ''ہم راجپوت ہیں، راؤ جی ___ جو سر جھکانا نہیں، سر کٹوانا جانتے ہیں اور آپ دیکھئے گا کہ جب یہ وقت آیا تو سب سے پہلے کٹنے والا سر رانی کا ہی ہوگا۔''

راؤ جی اور تانتیا توپ مزید لڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے لیکن رانی کے دلائل کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور ایک طویل بحث کے بعد وہ رانی کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے کیونکہ رانی نے انہیں صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ ان دونوں کے بغیر بھی انگریزوں سے اس وقت تک لڑے گی جب تک اس کے جسم میں خون کا آخری قطرہ باقی نہ رہ جائے۔

''لیکن اب جب کہ ہم سب غریب الوطن ہیں۔ ہماری آئندہ حکمت عملی کیا ہوگی؟'' راؤ جی بول اٹھے۔

''ہم غریب الوطن نہیں ہیں، راؤ جی!'' رانی نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ ہندوستان سارے کا سارا ہمارا وطن ہے۔ غریب الوطن تو وہ ہیں جو ہمارے تعاقب میں پہاڑوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔'' رانی کا اشارہ انگریزوں کی طرف تھا۔

راؤ جی اور تانتیا توپ حیرت گوشت پوست سے بنی اس دھان پان سی لڑکی کو دیکھتے رہے جو جنگ کے میدان میں یوں مسکرا رہی تھی جیسے تھیٹر دیکھنے والے کوئی مزاحیہ واقعہ دیکھ یا سن کر ہنستے ہوں۔

''بہر طور.....'' رانی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہم نے ایک طویل عرصے تک قلعہ بند ہو کر انگریز فوج کا مقابلہ کیا ہے، اور یہی اب بھی ہم کرنا چاہتے ہیں۔''

''مگر کیسے مہارانی؟'' تانتیا توپ بولا۔ ''اب تو ہمارے پاس چھپنے کی جگہ نہیں اور آپ قلعہ بند ہو کر جنگ کرنے کی سوچ رہی ہیں؟''

رانی پھر ہنسی۔ ''گوالیار کو بھول گئے مہاراج ___ صرف چند کوس کے فاصلے پر گوالیار کا مضبوط پہاڑی قلعہ ہمارا منتظر ہے۔''

''مگر راجہ سندھیا تو انگریزوں کا پٹھو ہے۔'' تانتیا توپ نے جواب دیا۔ ''وہ بھلا ہمارا ساتھ کیوں دے گا؟''

''ہم جانتے ہیں۔'' رانی نے شان بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ''مگر اس سے مدد کا طالب ہے کون؟'' رانی نے سوالیہ نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔ ''راجہ بے شک، انگریزوں کا غلام

ہے لیکن ہمیں علم ہے کہ گوالیار کی فوج اور عوام انگریزوں کے مخالف ہیں۔ وہاں، رائفلوں، توپوں اور گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ بھی ہے جو راجہ سندھیا نے انگریزوں سے حاصل کیا ہے چنانچہ ہم انگریزوں کا اسلحہ انہی کے خلاف استعمال کریں گے۔"

گوالیار ایک خوفزدہ کر دینے والا شہر تھا جہاں ایک بہت بڑا اور پہاڑی قلعہ تھا جو نہ صرف جھانسی کے مقابلے میں زیادہ محفوظ تھا بلکہ اسے ہندوستان کا مضبوط ترین قلعہ بھی کہا جاتا تھا۔ رانی کا ارادہ اسی قلعہ پر قبضہ کر کے انگریزوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کا تھا۔

ہندوستان میں بغاوت اب اپنے آخری سانس لے رہی تھی جنرل کیمپ بیل نے شمال کے حصے میں جمنا کے کنارے تباہی مچا دی تھی جب کہ جنرل ہوگ روز، جھانسی پر قبضہ کرنے کے بعد تانتیا توپ اور ہندوستان کی خطرناک ترین غدار اپسرا کے تعاقب میں تھا۔

رانی جب گوگل پور سے گوالیار کے لیے روانہ ہوئی تو کانچ کے مقام پر ایک بار پھر اس کا جنرل ہوگ روز کی فوجوں سے آمنا سامنا ہوا لیکن وہ لڑتی بھڑتی صاف بچ نکلی اور بہ حفاظت گوالیار پہنچ گئی۔

یہاں وہی کچھ ہوا جس کی پیش گوئی رانی نے کی تھی۔

گوالیار کے عوام اور فوجوں کو جونہی ان کی آمد کی اطلاع ملی انہوں نے ان کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کر دیا جب کہ مہاراجہ جیاجی سندھیا راؤ بہ مشکل اپنی جان بچا کر فرار ہوا اور اس نے آگرہ پہنچ کر انگریزوں سے پناہ طلب کر لی۔

لیکن رانی کو یہاں آ کر سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

تانتیا توپ اور راؤ جی نے گوگل پور میں تو اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں مرتے دم تک اس کا ساتھ دیں گے لیکن گوالیار پہنچ کر ان کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ وہ خوش گپیوں اور عیش و عشرت میں مصروف ہو گئے اور رانی انگریزوں کے خلاف جنگ کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے تنہا رہ گئی، جنہوں نے ایک بار پھر گوالیار کے قلعے کے قدموں میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔

رانی نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے وفاداروں کا اجلاس طلب کر لیا جس میں رام چند راؤ دیش مکھ، شیر خان، کالا خان، غلام غوث خان، دولت خان، دیوان رگھوناتھ سنگھ، گل محمد اور بعض دیگر جانثار شامل تھے۔

انہوں نے پہلے تو تانتیا توپ اور راؤ جی کو سمجھانے کے لیے باقاعدہ ایک وفد ترتیب دیا جس کی سربراہی دیوان رگھوناتھ سنہا کو دی گئی۔ رانی کو امید تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی مرہٹہ سرداروں کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن شام کو انہوں نے جو رپورٹ دی اس سے رانی نے صرف یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اب انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا ہے۔

رانی نے اس کے بعد بھی تانتیا توپ اور راؤ جی کو کئی پیغامات بھجوائے لیکن انہوں نے اس نوجوان لڑکی کی کسی بات پر کان نہ دھرے۔

بالآخر اس نے اپنی زندگی کی آخری جنگ تنہا لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لیا اور گوالیار کے قلعہ کا کونا کونا چھان مارا۔ مقامی فوجیوں اور عوام کی حمایت اسے پہلے ہی حاصل تھی چنانچہ وہ محض تین دن کے اندر قلعہ کو اپنا مضبوط ترین مورچہ بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے یہ حکمت عملی اپنائی تھی کہ قلعے کی تمام برجیوں پر مقامی فوجیوں کے ساتھ ساتھ اپنے جانثاروں کو بھی تعینات کیا تھا تاکہ کسی قسم کی غداری یا بے وفائی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

قلعہ کے مرکزی دروازے کے علاوہ تمام دروازوں کی پہرے داری بھی اس نے اپنے آدمیوں کے سپرد کی جب کہ قلعے کے وسط میں ایک کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم قائم کیا جہاں سے وہ ذاتی طور پر پورے قلعے کے دفاعی نظام کی نگرانی کرتی تھی۔

جنرل ہوگ روز کو قلعے کے اندرونی حالات کی کچھ خبر نہ تھی تاہم سابقہ تجربے کی بنیاد پر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ رانی، قلعہ میں بے پناہ طاقت حاصل کر چکی ہو گی اور اسے یہاں زیر کرنا جھانسی کی نسبت زیادہ دشوار ثابت ہو گا۔ یوں بھی قلعہ اونچائی پر تھا اور اس کا بھاری توپ خانہ اتنی بلندی پر پہنچ نہ سکتا تھا چنانچہ مسلسل ایک ماہ کے محاصرے کے باوجود وہ گوالیار قلعہ کی کسی دیوار میں معمولی سا شگاف ڈالنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

اس کے برعکس قلعہ کے اندر رانی بے حد مطمئن تھی۔ اس کے پاس خوراک اور رسد کا وافر

ذخیرہ موجود تھا۔ انگریزوں کی گولہ باری کے جواب میں قلعہ سے برائے نام گولے داغے گئے تھے چنانچہ اسلحہ اب بھی وافر تھا۔ اس نے قلعے پر مکمل کنٹرول حاصل کر رکھا تھا اور وہ جھانسی کی طرح ہر مورچے اور ہر برجی میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ موجود دکھائی دیتی۔

جنرل ہوگ روز انتہائی کوشش کے باوجود جب قلعے کا دفاع کمزور کرنے میں ناکام رہا تو اس نے ایک چال چلی۔

اس نے ایک تیز رفتار قاصد آگرہ بھیجا اور مقامی کمانڈر کو ہدایت کی کہ مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا کو جس قدر جلد ممکن ہو، گوالیار پہنچا دیا جائے۔

دسویں دن، مہاراجہ انگریزوں کی حفاظت میں گوالیار قلعہ کے سامنے موجود تھا۔

جنرل ہوگ روز نے اپنے منصوبے کے مطابق اعلان کیا کہ انگریزوں کو گوالیار پر قبضہ کرنے یا اس کے عوام اور فوجوں کو نقصان پہنچانے سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ برطانوی فوجیں صرف اس لیے لڑ رہی ہیں کہ مہاراجہ جیاجی سندھیا راؤ کو اس کا تخت واپس دلا سکیں۔ اس لیے جو سپاہی باغیوں کا ساتھ چھوڑ دیں گے، انہیں معاف کر دیا جائے گا۔

اب مرہٹہ پیشواؤں کو تھوڑی سی عقل آئی کہ انہوں نے رانی کا ساتھ نہ دے کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ جنرل ہوگ روز چاروں طرف سے گوالیار کو گھیرے بیٹھا تھا۔ وہ اگر انگریزوں کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر کے معافی بھی مانگ لیتے تو جان بخشی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس سے بہتر یہی تھا کہ وہ رانی کا ساتھ دے کر موت قبول کر لیتے کیونکہ پہلی صورت میں پوری ہندوستانی قوم ان پر لعنت ملامت کرتی اور ان کا نام بھی میر جعفر و میر صادق کی فہرست میں شامل کر لیا جاتا لیکن دوسری صورت میں رانی کے ساتھ ساتھ وہ بھی پوری قوم کے ہیرو ٹھہرتے۔

مگر مشکل یہ تھی کہ اب رانی کا سامنا کون کرے۔

ہر کوئی اس کے سامنے جانے میں شرم محسوس کر رہا تھا کیونکہ ان کا اپنا ضمیر انہیں ملامت کر رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے نہایت منت سماجت کے بعد تانتیا توپ کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ رانی سے ملاقات کرے اور پیشواؤں کے رویے کی معذرت طلب کرے۔

رانی کو جب تانتیا توپ کے آنے کی اطلاع دی گئی تو وہ تانتیا توپ کی توقعات کے برخلاف اپنے خیمے کے دروازے پر اس کے استقبال کو آئی۔ تانتیا کے لیے یہ بے حد حیران کن اور ناقابل

یقین امر تھا۔ وہ پیشواؤں اور اپنی جانب سے رانی سے معافی کا خواستگار ہوا جسے رانی نے نہایت اعلیٰ ظرفی کے ساتھ قبول کرلیا۔

''ہمیں خوشی ہے کہ کچھ بگڑنے سے پہلے آپ ہم سے آن ملے ہیں۔'' رانی نے خوش دلی سے کہا ''ہمارا مقصد ایک ہے.....لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کی دوسری اور آخری منزل شمشان گھاٹ ہے۔ تو جب آخر کار ہم نے شمشان گھاٹ ہی جانا ہے تو بزدلی کی موت مر کر کیوں جائیں، بہادروں کی طرح موت کو گلے لگا کر شمشان گھاٹ جانے اور اگنی کی نذر ہونے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔''

رانی مسکرا رہی تھی اور تانتیا توپ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ باہر توپوں کی گھن گرج سے در و دیوار کانپ رہے تھے اور رانی قہقہے لگا رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

''معافی، کس بات کی تانتیا جی!'' رانی بول رہی تھی اور وہ سن رہا تھا۔ ''مقصد ایک ہوں تو دلوں کے فاصلے بڑھائے نہیں جاتے بلکہ انہیں کم کیا جاتا ہے۔ جایئے اور پیشواؤں کو پیغام دیجئے کہ ہم نے تہ دل سے انہیں معاف کر دیا ہے۔''

''ہم آپ کے شکر گزار ہیں، مہارانی۔'' تانتیا توپ بہ مشکل اتنا ہی کہہ پایا۔

''شکر یہ کس بات کا؟'' رانی نے اپنے لمبے بال ہاتھ میں لے لیے۔ ''ہم نے ایک بیوہ کی حیثیت سے انہیں ترشوانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن انگریزوں نے اجازت نہ دی کہ ہم کاشی جا سکیں۔ سو ہم نے سوگند کھائی کہ اب یہ بال ہمارے ساتھ ہی شمشان گھاٹ جائیں گے۔ آپ بھی جا کر پرارتھنا کیجئے اور سوگند کھایئے کہ انگریزوں کے خلاف فتح تک تمام عیش و عشرت کو خیر باد کہہ دیں گے۔''

''ایسا ہی ہوگا، مہارانی''۔ تانتیا توپ بذات خود مرہٹوں کا نہایت بہادر اور جری جرنیل تھا لیکن اس وقت اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر جنگ کی اس دیوی کے چرن چھو لے۔

رانی نے تانتیا اور پیشواؤں کو صرف زبانی طور پر ہی معاف نہیں کیا بلکہ اس رات انہوں نے مل کر جنگ کی حکمت عملی بھی ترتیب دی۔

اور جب 17 جون 1858ء کو انگریزوں اور رانی کے مابین پہلا دو بدو معرکہ ہوا تو اسی حکمت عملی سے کام بھی لیا گیا۔ اس کے باوجود کہ رانی کی افواج تعداد میں بے حد کم تھیں لیکن رانی کے

کمانداروں کے بلند حوصلوں اور رانی کی شجاعت اور جنگی حکمت عملی کے باعث انگریز اس دن کی لڑائی ہار گئے۔

اس دن کی فتح کا تمام تر سہرا مورخین نے رانی لکشمی بائی کے سر باندھا ہے۔

18 جون 1858ء کو طلوع سحر سے پہلے ہی برطانویوں نے طبل جنگ بجا دیا۔

مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا کی جانب سے عام معافی کے اعلان کے باعث بعض سپاہی اس سے جا ملے اور انگریزوں نے انہیں اپنے ساتھ جنگ میں شریک کر لیا۔ یہ اطلاعات بھی موصول ہوئیں کہ راؤ صاحب کی زیر کمان فوج کے دو بریگیڈز نے دوبارہ انگریزوں کے ساتھ اتحاد کا اعلان کر دیا ہے۔

رانی ششدر رہ گئی لیکن وہ گھبرائی نہ پریشان ہوئی۔

وہ اس وقت قلعہ گوالیار میں نصب اپنے شاہی خیمے میں تھی۔ اس نے سفید جودھپوری لباس پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے اوپر مردانہ جیکٹ اور سفید جبہ تھا۔ اس کا چہرہ رومن سپاہیوں کی طرح آہنی خود سے ڈھکا ہوا تھا جس کے گرد سفید اسکارف ٹھوڑی تک لپٹا ہوا تھا۔

اس نے رام چندر راؤ دیش مکھ کو طلب کیا۔ ''یوں دکھائی دیتا ہے کہ جیسے آج جنگ کا آخری دن ہوگا''۔ رانی کے لہجے میں بلا کا ٹھیراؤ تھا۔ ''اگر ہم جنگ میں مارے گئے تو یاد رکھنا کہ ہماری زندگی سے بڑھ کر ہمارے بیٹے دامودھر کی حفاظت کرنا اور اس کا خیال رکھنا.....''

رانی نے ذرا سا توقف کیا اور اپنی بات جاری رکھی ''.....ایک بات اور ..... ہمارے مارے جانے کی صورت میں یہ خیال بھی رکھنا کہ ہماری لاش ان لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائے جو ہمارے مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔''

رام چندر راؤ دیش مکھ کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن وہ زبان سے رانی کو کچھ نہ کہہ سکا۔

رانی نے اپنا گھوڑا منگوایا اور میدان جنگ کی جانب چل دی۔ پہرے داروں نے فوراً اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔

برطانوی افواج قلعہ میں داخل ہو چکی تھیں۔ رائفل بردار اور شمشیر بردار گھڑ سوار دستے سب

سے آگے تھے۔ وہ تلواریں لہرا رہے تھے اور چیخ چیخ کر باغیوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ نیلی وردیاں اور سفید ہیلمٹ پہنے لائٹ بریگیڈ آگے بڑھ رہا تھا۔ ان کا تعلق آئرش حصار سے تھا۔ جب کہ کرنل رینک کا ایک افسران کی کمان کر رہا تھا۔ وہ کسی آندھی کی مانند بڑھے چلے آ رہے تھے جب کہ پٹھان انہیں روکنے میں مصروف تھے۔

لکشمی بائی انہی پٹھانوں کے درمیان تھی۔ تلوار اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ بڑھ بڑھ کر حملہ آوروں پر وار کر رہی تھی۔ کئی برطانوی فوجی براہ راست اس کے ہاتھوں چیتھڑوں میں تبدیل ہوئے۔

وہ نہایت بے جگری سے لڑی لیکن اس کی توقع کے عین مطابق یہ دن جنرل ہوگ روز کا تھا۔ انقلابیوں کی فوج کے ایک بڑے حصے نے ہتھیار ڈال دیئے یا مارے گئے جب کہ ان کی بندوقیں برطانویوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں۔ رانی اور اس کے وفادار برطانوی فوج کے سیلابی دھارے کو روکنے میں ناکام ہو گئے تھے۔

اب رانی کے پاس گوالیار سے فرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

رانی نے اپنے بیٹے دامودھر کو اپنے پیچھے بٹھایا اور اس شان کے ساتھ گوالیار سے نکلی کہ اس نے گھوڑے کی باگیں دانتوں میں دبا رکھی تھیں جب کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں جنہیں وہ بیک وقت چلا رہی تھی۔ چند ایک پٹھان سرداروں کے علاوہ رگھوناتھ سنہا اور رام چندر راؤ دیش مکھ اس کے ساتھ تھے۔

برطانوی فوج نے فوراً رانی اور اس کے ساتھیوں کو گھیرے میں لے لیا لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلاتی اور دشمنوں کو چیرتی کاٹتی گوالیار کے قلعے سے بھی نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن خود وہ زخمی تھی۔ اس کے جسم پر کئی گھاؤ تھے جن سے خون تیزی کے ساتھ بہ رہا تھا۔

سورج اپنی پوری رفتار کے ساتھ مغرب کی جانب گامزن تھا۔ تاریکی لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی جب کہ رانی کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد گوالیار سے دور نکل جائے۔

اس کا رخ کوٹا کی سرائے کی جانب تھا۔

رانی اور اس کے ساتھی ہر ممکن تیز رفتاری کے ساتھ گھوڑے بھگا رہے تھے لیکن انگریز فوج بدستور اس کے تعاقب میں تھی۔ ایک برطانوی سپاہی، رانی کے بہت قریب آ پہنچا، اس نے رانی پر

خنجر سے وار کیا جو اسے سینے سے ذرا نیچے لگا۔ رانی کسی عقاب کی طرح پلٹی۔ اس کی بائیں ہاتھ والی تلوار چمکی اور برطانوی سوار کا سر کٹ کر دور جا گرا۔

لیکن رانی کے اپنے جسم سے بھی خون کا فوارہ ابل پڑا۔

زخم کا تقاضا تھا کہ رک کر مرہم پٹی کی جائے لیکن برطانوی فوج کچھ اس انداز میں رانی اور اس کے جانثاروں کے ساتھ ساتھ تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی کہیں ٹھہرا نہیں جا سکتا تھا۔

جب رانی، سوانا ریکھا کی نہر عبور کرنے والی تھی تو کسی برطانوی فوجی کی کاربائن کی گولی اس کے پیٹ میں لگی اور وہ ایک آہ کے ساتھ، گھوڑے کی گردن پر آ رہی۔ لیکن اس عالم میں بھی اس نے اپنے اوسان بحال رکھے۔ گھوڑا بدکا اور اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا مگر رانی اس کی گردن اور دامو دھر اپنی ماں کی کمر سے لپٹا رہا۔

درد اور تکلیف کی شدت کے باوجود رانی، گھوڑے پر سیدھی ہوئی۔ کاربائن سے فائر کرنے والا سپاہی، اب اس کے اس قدر قریب آ چکا تھا کہ رانی کی تلوار اسے بہ آسانی چاٹ سکتی تھی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس بار داہنے ہاتھ والی تلوار چلی اور حملہ آور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

رانی نے پھر گھوڑا بھگایا لیکن اسے احساس ہوا کہ خطرے کی اس گھڑی میں اس نے درست جانور کا انتخاب نہیں کیا۔ گھوڑا، رانی کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا اور اس کے پہرے دار ایک ایک کر کے اس پر قربان ہوتے جا رہے تھے۔

رانی کی ایک ران سن ہو چکی تھی۔ پیٹ سے خون بہ رہا تھا لیکن وہ بدستور گھوڑا دوڑاتی آگے بڑھ رہی تھی۔

ایک اور برطانوی فوجی نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اس کے قریب آیا۔ اس کی تلوار نے رانی کے دائیں رخسار کو چیر ڈالا اور داہنی آنکھ کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ رانی نے اس عالم میں بھی تلوار چلا کر اس فوجی کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔

لیکن اب خود رانی کی ہمت جواب دے گئی اور وہ دوبارہ گھوڑے کی گردن پر گر گئی۔ اپنی گردن پر بوجھ محسوس کر کے گھوڑا پھر بدکا لیکن رانی کے محافظوں نے اسے قابو کر لیا۔

گھوڑا تو رک گیا لیکن رانی اس کی گردن سے نہ اٹھ سکی۔

رانی کا ذاتی محافظ گل محمد جو ایک بہادر شخص تھا اور اب تک نہایت دلیری کے ساتھ لڑا تھا خود

پر قابو نہ رکھ سکا اور اپنی مالکن کی بے بسی دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

رانی تڑپ رہی تھی۔ اس کا اسکارف اور ہیلمٹ اتر چکا تھا۔ شدید کرب کے تاثرات اس کے حسین چہرے پر جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ اس کے لمبے بال کھل کر اس کے رخساروں پر آ گئے تھے اور اس کے خون سے تر بتر ہو رہے تھے۔

یہ وہ رانی تھی جسے اس کے بدترین دشمن نے بھی ہندوستان کی بہادر ترین عورت کا خطاب دیا تھا۔ کہاں اس کا وہ رعب کہ اس کے سامنے پرندہ بھی پر نہ مار سکے اور کہاں یہ بے چارگی کہ کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا۔

رگھوناتھ سنہا اور رام چندر راؤ دیش مکھ نے رانی کو گھوڑے سے اترنے میں مدد دی۔ باقی محافظ بھی رک گئے تھے اور سوالیہ نگاہوں سے اپنی نیم بے ہوش رانی کو دیکھ رہے تھے۔

''تم لوگ چاہو تو اپنی جانیں بچانے کے لیے جا سکتے ہو۔'' رام چندر راؤ دیش مکھ نے شاید محافظوں کی سوالیہ نگاہیں پڑھ لی تھیں۔

لیکن وہ فرار نہیں ہوئے بلکہ پلٹ کر ان انگریزوں پر حملہ آور ہو گئے جو اب ان کے قریب آ گئے تھے۔

''آپ رانی کو کسی محفوظ مقام پر لے جائیں، رام چندر جی!'' ایک پٹھان کی بلند آواز تلواروں کی جھنکار میں سے سنائی دی۔ ''ہم انہیں روکتے ہیں۔''

رگھوناتھ سنہا بھی بول پڑا۔ ''ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں ہے، رام چندر جی..... ہمیں جلد از جلد بابا گنگا داس کے گھر تک پہنچ جانا چاہیے جو قریب ہی ہے۔''

رام چندر راؤ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے روتے ہوئے دامودھر راؤ کو ایک گھوڑے پر بٹھایا جب کہ رانی کا جسم اس نے اپنی گود میں رکھا اور بابا گنگا داس کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

رگھوناتھ سنہا اور گل محمد محافظوں کی حیثیت سے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

تاریکی کے باوجود بابا گنگا داس نے رانی کے مسخ شدہ اور خون آلود چہرے کو پہچان لیا۔ انہوں نے بڑھاپے کے باوجود رانی کا نرم و نازک وجود اپنے ہاتھوں پر تھاما اور اسے ایک مسہری پر جا لٹایا۔ انہوں نے ٹھنڈے پانی سے رانی کا چہرہ صاف کیا۔ اس کے ماتھے کو بوسہ دیا اور اپنے ہاتھوں مقدس گنگا کا پانی اس کے منہ میں ڈالا۔

رانی کی حالت ذرا سی سنبھلی۔ دامودھر لپک کر اس کے قریب پہنچا اور رانی نے بہ وقت تمام اسے بازوؤں میں بھر کر اپنے بدن پر گرا لیا۔

''ہمارا بیٹا.....اس نے دامودھر کا ماتھا چومنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی''___ اس کا خیال رکھنا.....'' اس کے کپکپاتے لرزتے ہونٹوں سے آواز برآمد ہوئی۔ ''ہر ہر مہادیو۔'' اور اس کے بعد وہ بے ہوش ہوگئی۔

گل محمد۔ رام چندر راؤ اور رگھوناتھ سنہا اس کی مسہری سے چپکے بیٹھے تھے۔ دامودھر بابا گنگا داس کی گود میں تھا لیکن سب زار و قطار رو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد رانی نے بہ وقت تمام اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ اس وقت بھگوت گیتا کے بھجن گنگنا رہی تھی جو بچپن میں اس نے یاد کیے تھے۔ آواز رفتہ رفتہ ڈوبتی گئی.....اس کے آخری الفاظ تھے:

''واسودیو! میں تمہارے حضور حاضر ہوں''۔

اور اس کے ساتھ ہی جھانسی کا چاند ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

رام چندر راؤ، رگھوناتھ سنہا، گل محمد اور دامودھر پچھاڑیں کھانے لگے ایسے میں بابا گنگا داس کی آواز ابھری۔

''روشنی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ ہر جگہ اپنا راستہ بنا لیتی ہے اور مناسب وقت پر دوبارہ ظاہر ہوتی ہے۔'' وہ بھاری لہجے میں بول رہے تھے۔ ''لکشمی، صرف ہماری ہی نہیں بلکہ پورے دیش کی روشنی تھی۔ وشواس رکھو کہ وہ پھر اسی آب و تاب سے نمودار ہوگی___''

رام چندر راؤ کو رانی کی وصیت یاد تھی، چنانچہ وقت ضائع کیے بغیر اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے چتا تیار کی.....

اور موت کے چند گھنٹوں بعد ہی، ہندوستان کی اس بے مثال رانی کا جسم شعلوں کے حوالے کر دیا گیا۔

◈ ◈ ◈

حوالہ جات (2)

[1] جھانسی اس وقت بھارتی ریاست اتر پردیش کا ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ہے جس میں جھانسی، للیت پور اور جلاؤں کے اضلاع شامل ہیں۔

انگریزوں نے مارچ 1858ء میں قلعہ جھانسی اور جھانسی شہر پر قبضہ کیا اور 1861ء میں انہیں مہاراجہ گوالیار، جیاجی راؤ سندھیا کے حوالے کر دیا۔ یوں، جھانسی، ریاست گوالیار کا حصہ بن گیا۔ 1866ء میں انگریزوں نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی اور جھانسی کو دوبارہ اپنی عمل داری میں شامل کر لیا۔

1947ء میں جب تقسیم ہند عمل میں آئی تو جھانسی کو مرہٹہ بولنے والی ریاست اتر پردیش کا حصہ بنا دیا گیا۔ 2005ء کی انکارٹا انسائیکلو پیڈیا کے مطابق جھانسی شہر کی آبادی اس وقت چار لاکھ نفوس کے لگ بھگ ہے۔

1991ء کے اعداد و شمار کے مطابق ضلع جھانسی کا کل رقبہ 5024 مربع کلومیٹر جبکہ آبادی 19 لاکھ 29 ہزار 698 تھی۔ ان میں مردوں کی تعداد 7 لاکھ 67 ہزار 430 اور خواتین کی 6 لاکھ 62 ہزار 268 تھی۔ مجموعی آبادی میں سے 8 لاکھ 63 ہزار 342۔ افراد دیہات جبکہ 5 لاکھ 66 ہزار 356 افراد شہروں میں آباد ہیں۔

ضلع میں 5 لاکھ 96 ہزار 640 خواندہ افراد موجود تھے جن میں سے 4 لاکھ 7 ہزار 310 مرد اور ایک لاکھ 76 ہزار 330 عورتیں تھیں۔ پورے ضلع کی پانچ تحصیلیں، آٹھ بلاکس، 65 نیا پنچایت، 444 گرم سبھا، 760 دیہات اور 79 غیر آباد گاؤں ہیں۔ ضلع میں ایک فوجی چھاؤنی ہے جب کہ 26 پولیس اسٹیشن ہیں جن میں سے 8 دیہی اور 18 شہری ہیں۔

[2] مرہٹہ بادشاہت اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندوستان کی سب سے بڑی اور مضبوط قوت تھی۔اس کا آغاز سترہویں صدی کے وسط میں مہاراشٹر میں شیواجی بھونسلے کے ہاتھوں میں ہوا لیکن 1680ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔البتہ 1707ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مرہٹوں نے پیشواؤں (وزرائے اعظم) کے ایک نئے سلسلے کے تحت طاقت وقوت حاصل کی اور زوال پذیر مغل بادشاہت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ جنوب میں میسور اور تنجور (تھانپور) اور شمال میں دہلی، آگرہ اور روہیل کھنڈ (بریلی) تک پھیل گئے۔

1758ء میں جب مرہٹوں نے لاہور (موجودہ پاکستان) پر بھی قبضہ کرلیا تو مسلمانوں کو اپنا مذہب خطرے میں نظر آنے لگا چنانچہ افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ نے 1761ء میں دہلی کے شمال میں پانی پت کے مقام پر انہیں عبرت ناک شکست دی جس سے مرہٹہ بادشاہت کی کمر ٹوٹ گئی اور یہ پانچ حصوں میں تقسیم ہوگئی۔یہ ہولکر، سندھیا، بھونسلے، گائیکواڑ اور پیشوا کہلوائے۔

بعد ازاں ان مرہٹہ ریاستوں میں بھی اختلافات پیدا ہوگئے اور یہ آپس میں ہی مسلسل جنگوں میں مصروف ہوگئیں جن سے یہ کمزور سے کمزور ہوتی گئیں۔انگریزوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور 1775ء سے 1782ء، 1803ء سے 1805ء اور 1815ء سے 1817ء کے درمیان انہیں پے در پے شکستیں دیں جن سے یہ ریاستیں اپنی خودمختاری بھی کھو بیٹھیں البتہ ان میں سے تین ریاستیں یعنی گوالیار (سندھیا) اندور (ہولکر) اور بڑودہ (گائیکواڑ) برطانوی سائے تلے 1947ء میں ہندوستان کی آزادی تک قائم رہیں۔

مرہٹہ بادشاہ کا بانی شیواجی بھونسلے 1627ء میں پیدا ہوا۔وہ بیجاپور کے مسلمان-اطان کے ایک ہندو افسر کا بیٹا تھا۔وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور پھیلتے ہوئے اسلام کا کٹر مخالف تھا چنانچہ اس نے مرہٹوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور

ان کا سردار بن گیا اور اس نے موجودہ ریاست مہاراشٹر کے شہر پونا میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر کے اسی کو اپنا دارالحکومت قرار دے دیا۔

1659ء میں بیجاپور کے سلطان اور 1660ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اس کی سرکوبی کے لیے علیحدہ علیحدہ فوجیں روانہ کیں لیکن اس نے یکے بعد دیگرے دونوں فوجوں کو شکست دی۔ مغل اس وقت اپنے عروج پر تھے چنانچہ 1665ء میں اس نے مجبور ہو کر ان سے صلح کر لی۔ 1666ء میں اورنگ زیب نے شیواجی اور اس کے بیٹے کو اپنے دارالحکومت آگرہ کے قلعے میں قید کر لیا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مہاراشٹر واپس آ کر 1670ء میں اس نے مغل بادشاہ کے خلاف پھر جنگ شروع کر دی اور مغلیہ فوجوں کو شمالی بندرگاہ سورت تک دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا۔

1674ء میں اس نے باقاعدہ مرہٹہ بادشاہت کے قیام کا اعلان کیا اور خود اس کا پہلا بادشاہ قرار پایا لیکن صرف چھ سال بعد 1780ء میں اس کے مرنے پر مغلوں نے اس کی بادشاہت پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ البتہ اس کے جانشینوں نے کسی نہ کسی طرح مرہٹہ قوت کو زندہ رکھا۔

1681ء میں مغل بادشاہ نے جنوب پر حملہ کیا اور 87-1686ء میں اس کی ایک فوج دکن کے انتہائی اندرونی علاقوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ یوں بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں بھی مغل سلطنت کا حصہ بن گئیں۔ مرہٹہ فوجوں کو شکست ہوئی لیکن انہوں نے گوریلا جنگ شروع کر دی اور مغلوں سے آنکھ مچولی جاری رکھی۔

1707ء میں عالمگیر کے انتقال کے بعد کئی سال امن وسکون سے گزرے لیکن اس کے ایک جانشین بہادر شاہ کے دور میں امن کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور مرہٹوں نے مغل سلطنت پر دوبارہ حملے شروع کر دیئے۔ 1720ء میں وہ سابق مغلیہ صوبے حیدرآباد کو باقی مغل بادشاہت سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1738ء میں مرہٹوں نے مالوہ پر قبضہ کر لیا اور کچھ ہی دنوں بعد اوڑیسہ فتح کر کے بنگال پر حملہ آور ہوئے۔

اسی اثناء میں شیوا جی بھونسلے کے جانشینوں یعنی مہاراجہ ستارا اور پونا میں رہنے والے برہمنوں نے مرہٹوں کا پیشوا (وزیر اعظم) بن کر گویا ڈی فیکٹو لیڈروں کا درجہ حاصل کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹہ ریاستوں نے اپنی خودمختاری قائم رکھی لیکن وہ مہاراجہ اور پیشوا کی برائے نام حاکمیت بھی تسلیم کرتے رہے۔

1761ء میں احمد شاہ کے ہاتھوں شکست کے بعد بننے والی پانچ مرہٹہ ریاستوں (پونا میں پیشوا۔ بڑودہ میں گائیکواڑ، جن کے پاس گجرات کا بیشتر علاقہ تھا۔ ناگپور میں بھونسلے جو مرکزی ہندوستان کے زیادہ تر حصے پر قابض تھا۔ ہولکر اور سندھیا خاندان، مالوہ اور گوالیار او رشیوا جی بھونسلے کے قبیلے کے مہاراجہ کولہا پور، شمالی مہاراشٹر اور تامل ناڈو میں تنجور کے قابضین) پر ایک اور مصیبت ٹوٹی۔

یہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت تھی۔ انہوں نے 1775ء میں بمبئی کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر پونا میں مداخلت شروع کی جس کے نتیجے میں پہلی اینگلو مرہٹہ جنگ لڑی گئی۔ مرہٹوں کو شکست ہوئی لیکن جنگ سے پہلے کی مرہٹہ ریاستیں بحال کردی گئیں۔

1802ء میں انگریزوں نے بڑودہ میں مداخلت کی جس کا مقصد باغیوں کے خلاف ریاست کے حکمران کی مدد کرنا تھا۔ انہوں نے ایک معاہدے پر دستخط بھی کیے جس کی رو سے نئے مہاراجہ کو مرہٹہ بادشاہت سے علیحدہ ہو کر برطانوی حاکمیت کو تسلیم کرنا پڑا۔

اسی طرح انگریزوں کے ساتھ دوسری لڑائی میں مرہٹوں نے اپنی آزادی تو حاصل کی لیکن اوڑیسہ مکمل اور گجرات، جزوی طور پر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔

تیسری جنگ میں مرہٹوں کی آزادی مکمل طور پر ختم ہوگئی اور انگریز ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ مرہٹہ دیش کا دل یعنی پونا براہ راست انگریز عمل داری میں چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی کولہا پور اور ستارا کی ریاستیں بھی ختم ہوگئیں جو بعد ازاں محدود پیمانے پر مقامی مرہٹہ سرداروں کو واپس کردی گئیں۔ اسی طرح گوالیار، اندور اور ناگپور کی آزاد حیثیت بھی ختم ہوگئی اور وہ انگریزوں کی دست نگر ریاستوں میں

تبدیل ہو گئیں۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد 1960ء میں بھارتی ریاست مہاراشٹر کا قیام مرہٹہ زبان بولنے والی ریاست کے طور پر عمل میں آیا۔

[3] باجی راؤ اول 1700ء سے 1740ء تک چھتر پتی شاہو کا پیشوا (وزیر اعظم) تھا۔ اس نے اپنے باپ بالا جی وشوا ناتھ کی جگہ یہ عہدہ سنبھالا۔ اپنی شجاعت، بہادری اور بے جگری کی وجہ سے شہرت پانے والے مرہٹہ پیشوا باجی راؤ نے مرہٹہ بادشاہت کو انتہائی شمال تک پھیلا دیا۔ اس نے 36 جنگیں لڑیں لیکن کسی میں شکست نہ کھائی۔ بعد ازاں وہ پونا آ گیا جہاں اس نے ''شنی وار وادا'' کے نام سے ایک شاندار محل تعمیر کرایا جس کے کھنڈرات آج بھی مرہٹہ سلطنت کی عظمت کی گواہی دیتے نظر آتے ہیں۔

وہ بیک وقت نظام حیدر آباد دکن، مغلوں اور خلیج کے دہانے پر آباد پرتگالیوں پر حاوی تھا۔ اپنے بھائی چمن جی اپا، زیرک وزراء اور دلیر جنگ جوؤں کی مدد سے باجی راؤ نے مرہٹہ بادشاہت کو اس کے عروج تک پہنچایا۔

کہا جاتا ہے کہ باجی راؤ نے اپنے بھائی چمن جی اپا کو نصیحت کی تھی کہ۔ ''یاد رکھو کہ رات کو سونا نہیں چاہیے۔ یہ بھگوان نے اس لیے بنائی ہے کہ تم اس سرزمین پر حملہ کر سکو جس پر تمہارے دشمن نے قبضہ کر رکھا ہے۔ رات، دشمن فوجوں کی توپوں اور تلواروں کے سامنے تمہاری سپر اور ڈھال ہے۔''

باجی راؤ کی سرپرستی میں آنے والے جنگ جو، بہادر جرنیل بنے جن میں سندھیا (رانو جی) آف گوالیار، ہولکرز (ملہارو) آف اندور، گائیکواڑ (پلا جی) آف بڑودہ اور پوار (اودے جی) آف دھراس شامل تھے۔

مستانی نامی حسینہ کے ساتھ باجی راؤ کی داستان عشق بے حد مشہور ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ مستانی بے حد خوبصورت اور نرم و نازک لڑکی تھی۔ وہ بندیل کھنڈ کے راجہ رانا چھترسل کی مسلمان داشتہ کی بیٹی تھی۔ مستانی، باجی راؤ کے ساتھ اس کے محل شنی وار وادا میں رہتی تھی

اور اس کی متعدد فوجی مہمات میں اس کے ہم رکاب ہوتی تھی۔ وہی جنگوں میں اس کی حکمت عملی مرتب کرتی جب کہ اسی نے باجی راؤ کی آخری رسومات بھی ادا کیں۔ مستانی، باجی راؤ کی ذاتی زندگی کی سب سے بڑی لیکن واحد بے چیدگی تھی۔ ان کی محبت کے باعث پونا کے سخت گیر اور رجعت پسند معاشرے اور پیشوا فیملی میں بہت سے اختلافات اور بحرانوں نے جنم لیا۔

باجی راؤ کی خواہش تھی کہ مستانی کے بطن سے پیدا ہونے والے اس کے بیٹے کو مقدس دھاگہ باندھا جائے اور برہمن قرار دیا جائے لیکن اپنی تمام تر قوت اور طاقت کے باوجود باجی راؤ، پونا کے مذہب پرست پجاری کو اس پر رضامند نہ کر سکا۔ ایک بہادر اور سچے مسلمان کی حیثیت سے امید و یاس کا شکار باجی راؤ اور مستانی کا بیٹا شمشیر بہادر ستائیس سال کی عمر میں پانی پت کی تیسری جنگ میں مارا گیا۔ شمشیر بہادر کے بیٹے علی بہادر کو بندیل کھنڈ میں باجی راؤ کی جاگیر دے دی گئی جب کہ خود اس نے ''بانڈا یو پی'' نامی ریاست بھی قائم کی۔

[4] لندن کے 218 تاجروں کی ایک کمپنی نے ملکہ الزبتھ اول کے زمانے میں ہندوستان کے ساتھ تجارت کی اجازت چاہی تو انگلستان کی ملکہ نے 31 دسمبر 1600ء کو ایک فرمان کے ذریعے کمپنی کو پندرہ سال کے لیے ہندوستان کے ساتھ تجارت کی اجازت دے دی۔ ملکہ کے فرمان کا مقصد ''قومی ترقی، ملک کی فلاح، جہازوں کی تعمیر اور ذرائع آمد و رفت کی توسیع'' قرار دیا گیا۔ چنانچہ پہلے انگریز نے 1601ء میں تجارت کی غرض سے سرزمین ہندوستان پر قدم رکھا۔

مغل شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر سے باضابطہ اجازت ملنے کے بعد انگریز کمپنی نے تیزی سے اپنے کاروبار کو وسعت دینا شروع کی اور 1640ء میں چینا پٹم کے راجہ سے ایک قطعہ اراضی خرید کر مدراس کا سینٹ جارج فورٹ تعمیر کیا۔ جو سرزمین ہندوستان پر انگریزوں کا پہلا قلعہ شمار ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں آگرہ، اجمیر، احمد آباد اور بھڑائچ میں انگریزوں کی

تجارتی کوٹھیاں بھی قائم کی گئیں۔ پرتگال کے تاجروں نے ہندوستان کے ایک دلدلی اور بدبودار جزیرے پر قبضہ کرلیا۔ اس لاوارث جزیرے کا نام ممبئی تھا۔ اور اس پر صرف مچھیرے رہا کرتے تھے۔ 1661ء میں جب پرتگال کی شہزادی کی شادی انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم سے ہوئی تو شاہ پرتگال نے یہ جزیرہ اپنی بیٹی کو جہیز میں دے دیا۔ کمپنی نے اس جزیرے کو اپنے بادشاہ سے 10 پونڈ سالانہ کے پٹے پر لے کر بمبئی شہر کی بنیاد رکھی او رفتہ رفتہ اسے ایک عظیم الشان شہر میں تبدیل کردیا۔

1681ء میں بنگال کے مغل گورنر شائستہ خان کے ساتھ کمپنی کا محصول کی ادائیگی پر جھگڑا شروع ہوا تو کمپنی کے گورنر سر جوشیا چائلڈ نے اپنے بادشاہ جیمز ثانی سے مغلوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے کی درخواست کی تاکہ بحری آمدورفت بند ہو اور بنگال کے محاصل متاثر ہوں۔ چٹاگانگ کو مرکز بنا کر انگریزی فوجیں خشکی کے راستے آگے بڑھیں تاکہ مغل صوبے دار کو انگریزی شرائط تسلیم کرانے پر مجبور کیا جاسکے لیکن اس وقت اورنگ زیب عالمگیر جیسا طاقت ور بادشاہ ہندوستان کا حکمران تھا۔ مغلوں نے انگریزوں کی تمام کوٹھیوں پر قبضہ کرلیا اور انہیں ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اس پر انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے انہیں ایک لاکھ پچاسی ہزار طلائی سکے جرمانہ کیا اور معافی دے کر دوبارہ تجارت کی اجازت دے دی۔

1690ء میں انگریزوں کو کلکتہ میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ مغلوں کے ہاتھوں شکست کھانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی کمپنی نے ملکی سیاست میں دخل دینے کے بجائے صرف تجارت کی طرف توجہ مبذول رکھی اور بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں مضبوط تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔

اس انگریزی کمپنی کے علاوہ برطانیہ والوں کی ایک اور کمپنی 1635ء میں ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرچکی تھی۔ جس کے باعث انگریزی کمپنی کو نقصان پہنچ رہا تھا چنانچہ دونوں کمپنیوں نے متحد ہو کر 1707ء میں ایک معاہدے کے تحت ایک نئی کمپنی کی

بنیاد رکھی جس کا نام ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' رکھا گیا۔

1714ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی تجارتی کوٹھیوں کے گورنروں نے مغل بادشاہ فرخ سیر کے دربار میں ایک سفارت بھیجی جو تین سال کی کوششوں کے بعد 1717ء میں تجارت کے بارے میں مزید رعائتیں حاصل کرنے کے لیے تین شاہی فرمان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ان فرامین کے مطابق کمپنی کو تین ہزار روپے سالانہ کے عوض بنگال سے فری تجارت کا حق حاصل ہوگیا اور کلکتہ حیدر آباد، گجرات اور بمبئی کے علاقوں کے لیے بھی قابل قدر تجارتی مراعات حاصل ہوگئیں۔

مورخین، ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا سال آغاز 1765ء کو قرار دیتے ہیں جو بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے علاقوں پر مشتمل تھی جب کہ لارڈ رابرٹ کلائیو اس نئی حکومت کا پہلا گورنر جنرل تھا۔

ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت 1765ء سے 1858ء تک 93 سال قائم رہی اور اس دوران تیئیس گورنر جنرلز نے اپنے فرائض انجام دیئے۔ 58-1857ء میں جب ہندوستان کی جنگ آزادی لڑی گئی تو لارڈ کیننگ، ہندوستان کا تیئیسواں گورنر جنرل تھا۔ جنگ کے خاتمے پر ہندوستان، ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنجوں سے نکل کر براہ راست تاج برطانیہ کے تحت آگیا اور لارڈ کیننگ کو ہی پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ یہ برطانوی راج 1947ء تک یعنی مزید 89 سال جاری رہا۔

[5] انگریزوں نے جھانسی کے راجہ گنگا دھر راؤ سے دو معاہدے کیے تھے۔ پہلے معاہدے کے تحت وہ اس امر کا پابند تھا کہ انگریزوں کو جب بھی اس کی مدد کی ضرورت پڑی وہ اس سے انکار نہیں کرے گا۔ اس معاہدے کی رو سے جھانسی میں ایک انگریزی چھاؤنی بھی قائم کی گئی تھی جس کے تمام تر اخراجات جھانسی کے شاہی خزانے سے ادا کیے جاتے تھے۔

دوسرے معاہدے کے تحت گنگا دھر راؤ اس امر کا پابند تھا کہ وہ جھانسی کے آئندہ حکمران کا فیصلہ کرتے وقت انگریزوں سے لازمی طور پر مشاورت کرے گا۔

[6] عقل و دانش کا دیوتا گنیش، شو اور پاربتی کا بیٹا تھا لیکن یہ ان کے ملاپ سے پیدا نہیں ہوا کیونکہ شو اور پاربتی امامل کر بچہ پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ دیوتا ڈرتے تھے کہ شو اور پاربتی کے ملاپ سے پیدا ہونے والا بچہ انتہائی خطرناک ہوگا چنانچہ انہوں نے شو سے عاجزانہ درخواست کی کہ پاربتی ماں نہ بننے پائے۔ شو نے ان کی بات مان لی لیکن جب پاربتی کو علم ہوا تو وہ بہت روئی پیٹی مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ جنسی قربتوں کے باوجود اس کی گود خالی ہی رہی۔ غصے میں آ کر اس نے بددعا دی کہ دوسری دیویوں کے ہاں بھی کوئی اولاد نہ ہو چنانچہ سرسوتی اور لکشمی جیسی بڑی دیویاں بھی اولاد سے محروم ہی رہیں۔

شو کی عادت تھی کہ جب پاربتی (اما) نہا رہی ہوتی تو اچانک اس کی برہنہ تنہائیوں میں جا کر اسے چونکا دیتا۔ وہ خاوند کی اس حرکت سے بہت عاجز تھی چنانچہ تنگ آ کر اس نے ایک بیٹا پیدا کرنے کا ارادہ کر لیا جو نہاتے وقت باہر پہرے داری کر سکے۔ پاربتی نہاتے وقت ایک خاص قسم کا تیل اور دوسرے مرکبات اپنے جسم پر ملا کرتی تھی۔ انہیں کو اس نے اپنے بدن کے میل کچیل میں گوندھا اور اس آمیزے سے مردانہ مجسمہ بنا دیا۔ پھر اس نے مجسمے پر گنگا جل چھڑک کر اسے زندگی دے دی۔ یہ گنیش دیوتا تھا۔ پاربتی نے اپنے اس بیٹے کو اپنے غسل خانے کا نگہبان مقرر کر دیا۔

ایک دن وہ نہا رہی تھی کہ شو حسب معمول اسے چھیڑنے آیا۔ دروازے پر گنیش جی ڈٹے ہوئے تھے۔ شو اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا لیکن اندر جانے لگا۔ بیٹے نے راستہ روکا تو شو ہتھے سے اکھڑ گیا اور تاؤ میں آ کر اس نے اس کا سر اڑا دیا۔ پاربتی نہا کر باہر آئی تو بیٹے کو سر بریدہ دیکھا اور بین کرنے لگی۔ شو نے بیوی کی آہ وزاری دیکھ کر حکم دیا کہ جس جاندار کا سر سب سے پہلے ملے وہ لایا جائے۔ اتفاق سے ہاتھی کا سر پہلے ملا اور شو نے اسی کو گنیش کی گردن سے جوڑ کر زندہ کر دیا۔

گنیش کی دو بیویاں تھیں جن کے نام سدھی اور بدھی بیان کیے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ دونوں بے حد خوبصورت اور حسین و جمیل عورتیں تھیں۔

[7] پیشوا 1713ء سے 1818ء تک وسطی ہندوستان کی مرہٹہ بادشاہت کے وراثتی حکمران تھے ان کا عہدہ بادشاہ کے وزیر اعظم کے برابر ہوا کرتا تھا۔

باجی راؤ دوم مرہٹہ سلطنت کا آخری ''سرکاری پیشوا'' تھا جو 1796ء سے 1818ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔

پہلے مرہٹہ پیشوا کا نام بالا جی وشوانا تھ جو کونکن کے ایک گاؤں سیوار دھن کا رہائشی ایک برہمن تھا۔ وہ 1713ء سے 1720ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ اول 1740ء تک مرہٹوں کا پیشوا رہا جس نے زندگی میں کسی جنگ میں شکست نہیں کھائی۔ 1740ء سے 1761ء تک اس کا بیٹا بالا جی باجی راؤ، پیشوا رہا جسے نانا صاحب پیشوا بھی کہا جاتا ہے۔ ان دونوں باپ بیٹوں نے مرہٹہ سلطنت کو اپنے عروج پر پہنچا دیا۔ 1761ء میں مدھوراؤ، مرہٹوں کا پیشوا بنا جو نانا صاحب پیشوا یعنی بالا جی راؤ کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس نے 1772ء تک پونا سے پورے ہندوستان پر حکومت کی۔ 1771ء میں وہ بیمار ہو گیا۔ خیال ہے کہ اسے تپ دق کا مرض لاحق ہو گیا تھا چنانچہ 1772ء میں وہ صرف 27 سال کی عمر میں چل بسا۔

اس کی موت پر اس کا چھوٹا بھائی نارائن راؤ 1772ء میں مرہٹوں کا پیشوا بنا۔ وہ 1749ء میں پیدا ہوا تھا لیکن پیشوا بننے کے اگلے ہی سال یعنی 1773ء میں شتی وارہ، پونا میں اپنے چچا رگوناتھ راؤ کے ہاتھ قتل ہو گیا۔ 1773ء سے 1774ء تک رگھوناتھ راؤ پیشوا رہا۔ جب کہ 1774ء سے 1796ء تک اس کا بیٹا مدھوراؤ نارائن اس عہدے پر فائز رہا۔

باجی راؤ دوم مرہٹوں کا آٹھواں پیشوا تھا۔

[8] نانا صاحب 1821ء میں پیدا ہوا۔ وہ مرہٹوں کے آخری سرکاری پیشوا باجی راؤ دوم کا لے پالک بیٹا تھا۔ اس کا اصل نام دھوندو پنت تھا۔ اس نے 1853ء میں انگریزوں سے درخواست کی کہ باجی راؤ دوم کے متبنیٰ بیٹے کی حیثیت سے اسے مرہٹہ پیشوا تسلیم کیا جائے اور پنشن سمیت دیگر تمام مراعات بحال کی جائیں لیکن انگریزوں نے اس سے انکار کر دیا۔

اس کا بدلہ لینے کے لیے نانا صاحب اور اس کے آدمیوں نے جون 1857ء میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے دوران کانپور میں بغاوت کر دی اور برطانوی گیریژن اور کالونی میں قتل عام کیا۔ اس نے کانپور کے علاوہ دیگر شہروں کی بغاوت میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کے قابل ترین جرنیل تانتیا توپ نے انگریزوں کے خلاف متعدد لڑائیوں میں کامیابی حاصل کی لیکن خود نانا صاحب کو شکست ہوگئی۔

جنگ آزادی ختم ہونے پر وہ نیپال چلا گیا اور پھر اس کے بارے میں دنیا کو کچھ پتا نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ تاہم بعض مورخین اور مصنفین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ نیپال میں جلاوطنی کے دوران ہی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

[9] جیمز اینڈریوز براؤن ریمزے، فرسٹ مارکوئیس آف ڈلہوزی، ہندوستان کا کم عمر ترین گورنر تھا۔ وہ 22 اپریل 1812ء کو پیدا ہوا جب کہ اس کا انتقال 19 دسمبر 1860 کو ہوا۔ 1848ء میں جب وہ گورنر جنرل بن کر ہندوستان آیا تو اس کی عمر صرف 36 سال تھی۔

اس کے عہد میں پنجاب، اودھ اور برما کا بڑا علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آیا جب کہ 9 مارچ 1849ء کو مہاراجہ دلیپ سنگھ اور لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب پر انگریزی تسلط کے معاہدے پر دستخط کیے۔ اور ملکہ وکٹوریہ کے لیے ''کوہ نور'' ہیرا حاصل کیا جو مہاراجہ دلیپ کے باپ نے شاہ شجاع سے لیا تھا۔

لارڈ ڈلہوزی نے متبنیٰ بنا کر ریاستی حکومتیں منہ بولی اولاد کو دینے کا حق ختم کر دیا۔ چنانچہ اس اصول کے تحت ستارہ، جھانسی، جیت پور، سنبل پور، باگھٹ، مداول، اودے پور اور ناگپور کے علاوہ اودھ اور برار کو بھی انگریزی حکومت کا حصہ بنا لیا گیا۔ اس نے پنجاب، اودھ، ناگپور اور برما کے علاقے علیحدہ علیحدہ کر کے صوبوں میں بانٹ دیئے اور وہاں لیفٹیننٹ گورنر تعینات کیے۔ بنگال آرمی کا ہیڈ کوارٹر کلکتہ سے میرٹھ منتقل کر دیا جب کہ آرمی ہیڈ کوارٹر شملہ منتقل کر دیا۔ گورکھا رجمنٹ اسی کے دور میں بنی۔

اس کے عہد میں سب سے پہلے تھانہ سے بمبئی اور رانی گنج سے کلکتہ تک ریلوے لائنیں

بچھائی گئیں اور برصغیر کی پہلی ریل چلی۔ ٹیلی گراف کا نظام شروع ہوا اور ملک کے کئی اہم شہروں کو اس سے منسلک کر دیا گیا۔

[10] ارل چارلس جان کیننگ، 1812ء میں پیدا ہوا جب کہ 1862ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ وہ 1856ء سے 1858ء تک ہندوستان کا گورنر جنرل اور 1858ء سے 1862ء تک وائسرائے رہا۔

یوں وہ ہندوستان کا تیسواں اور آخری گورنر جنرل کے علاوہ پہلا وائسرائے بھی تھا۔

اس نے 29 فروری 1856ء کو لارڈ ڈلہوزی کی جگہ بحیثیت گورنر جنرل اپنے اختیارات سنبھالے۔ کیننگ جب کلکتہ پہنچا تو ڈلہوزی بھی وہاں موجود تھا جس نے نئے گورنر جنرل کو بتایا کہ ہندوستان میں کوئی خطرہ نہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈلہوزی آنے والے خطرے سے کتنا بے خبر تھا حالانکہ یہ آگ اسی کی لگائی ہوئی تھی۔ اس نے ہندوستان میں کمپنی کی فتوحات کو مکمل کر دیا تھا اور پورے ملک میں ایک سے دوسرے سرے تک سارے تخت ٹوٹ چکے تھے اور جو سلامت تھے وہ بھی کمپنی کا دم بھرتے تھے۔

انگریزوں کی ان فتوحات سے ایسے سیاسی و معاشی حالات و واقعات رونما ہوئے جن کی اہمیت سے حکام غافل تھے۔ انہیں شاید اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ جس طرح عوام کے جذبات سے کھیل رہے ہیں اور جو رسوا کن سلوک انہوں نے اب تک روا رکھا ہے اس سے ان کے خلاف نفرت کے جذبات اپنی شدت کو پہنچ چکے ہیں۔

یہی نفرت رنگ لائی اور 1857ء کو وہ خونریز لڑائی لڑی گئی جسے مشرقی مورخین ''جنگ آزادی'' اور مغربی مورخین ''بغاوت یا غدر'' کا نام دیتے ہیں۔ انگریز اس بغاوت یا جنگ آزادی کو کچلنے میں کامیاب ہو گئے، اس کا صرف ایک فائدہ ہوا کہ ہندوستان، ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنجوں سے نکل کر براہ راست تاج برطانیہ کے تحت آ گیا اور لارڈ ڈ کیننگ پہلا وائسرائے مقرر ہوا۔ اس نے 1861ء کو اواخر تک اس عہدے پر خدمات انجام دیں اور پھر انگلستان واپس چلا گیا۔

[11] بہادر شاہ ظفر نے آخری مغل تاجدار کی حیثیت سے 1837ء سے 1857ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔ وہ 1775 میں پیدا ہوا جب کہ 1862ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ اردو زبان کا ایک عظیم شاعر بھی تھا اور ظفر تخلص کرتا تھا۔ اس کے والد کا نام اکبر شاہ دوم تھا۔

ہندوستان کی جنگ آزادی کے وقت اس کی عمر 82 سال تھی۔ انگریزوں نے اسے جنگ آزادی سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ اس کی موت پر مغل بادشاہت اختتام پذیر ہو جائے گی۔ یوں وہ ہندوستان کا چھبیسواں اور آخری تاجدار تھا۔

جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے اسے رنگون (برما) جلاوطن کر دیا۔ اس کے دو بیٹوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے گولی مار دی گئی جس سے انگریزوں کے ہاتھوں مغل بادشاہت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ یاد رہے کہ اس آخری مغل تاجدار کو رنگون کی سڑکوں پر بھیک مانگتے دیکھا گیا۔

تخت دہلی سے اس کی برطرفی کے ساتھ ہی نہ صرف جنگ آزادی ختم ہو گئی بلکہ ''تاجدار ہندوستان'' کا خطاب بھی انگریزوں نے حاصل کر لیا اور ملکہ وکٹوریہ، ہندوستان کی پہلی برطانوی ملکہ قرار پائی۔ یہ عہدہ 1947ء میں برصغیر پاک و ہند کی آزادی تک انگریزوں کے پاس رہا۔

بہادر شاہ ظفر کے عہد میں برصغیر میں اردو ادب نے بے حد ترقی کی جب کہ مرزا غالب، داغ دہلوی، مومن اور ذوق جیسے شعراء اس کے دربار سے وابستہ رہے۔

[12] 23 جون 1757ء کو انگریزوں اور بنگال کے نواب سراج الدولہ کے مابین لڑی جانے والی جنگ پلاسی کو ہندوستانی تاریخ میں بے حد اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہی وہ جنگ تھی جس سے برصغیر میں انگریزوں کے طویل اقتدار کا آغاز ہوا۔

اس جنگ میں نواب کے امیروں نے اس سے غداری کی چنانچہ اس نے فرانسیسیوں اور مرہٹوں سے مدد مانگی لیکن وہاں سے انکار ہو گیا۔ مغلیہ بادشاہ بھی بے بس تھے۔ والئی اودھ نے بھی معذرت کر لی چنانچہ ہر طرف سے مایوس ہو کر نواب نے اپنے تمام سرداروں بشمول

میر جعفر سے، وفاداری کے تازہ حلف لیے اور اپنے دارالحکومت مرشد آباد سے 35 میل ہٹ کر پلاسی کے میدان میں انگریزوں کے مقابلے پر آیا۔

انگریزوں کی چار ہزار کے لگ بھگ فوج کے مقابلے میں نوابی سپاہ کی تعداد پچاس ہزار تھی لیکن اس میں غدار زیادہ تھے۔ 23 جون 1757ء کو دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ جنگ شروع ہوئی تو میر جعفر اپنے سپاہیوں سمیت کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ میر مدن ایک انگریزی توپ کے گولے سے شہید ہو گیا تو نواب کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک اور غدار نے ہندوستان کی غلامی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ یہ راجہ درلاب تھا۔ اس نے مقابلہ کرنے کے بجائے نواب کو ترغیب دی کہ آپ جنگ ہار چکے ہیں لہٰذا بھاگ جائیں۔ نواب نے اس ''وفادار'' کی بات مان لی اور تیز رفتار اونٹنی پر بیٹھ کر مرشد آباد آ گیا۔

دوسرے دن جب اسے اپنی فوج کی تباہی اور غداری کی اطلاع ملی تو وہ اپنی بیوی سمیت مرشد آباد سے بھاگ نکلا مگر راج محل پہنچ کر اس نے جب ایک ویران باغ میں رات گزارنا چاہی تو لوگوں نے اسے پہچان لیا اور میر جعفر کے حوالے کر دیا۔ اسی رات میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔

لڑائی کے اگلے روز 24 جون 1757ء کو ہندوستان کی تاریخ کی بدقسمتی کا آغاز ہوا اور میر جعفر، بنگال کا نواب قرار پایا۔ 29 جون کو اس نے باضابطہ حلف اٹھایا جس میں انگریزی افواج کے کمانڈر انچیف لارڈ رابرٹ کلائیو نے بہ نفس نفیس شرکت کی۔

واضح رہے کہ بنگال کی یہ لڑائی نواب اور انگریزوں کے مابین محصولات کے تنازع کے باعث لڑی گئی اور انگریزوں نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگا کر چڑھائی کی جو نواب اور ان کے مابین طے پایا تھا۔

[13] برار، انگریزی ہندوستان کا سابقہ صوبہ تھا لیکن اس وقت یہ ہندوستانی ریاست مہاراشٹر میں شامل ہے۔ برار کی حدود تاریخ کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہی ہیں لیکن برطانوی صوبے کی حیثیت سے اسے حیدر آباد اسائنڈ ڈسٹرکٹ بھی کہا جاتا تھا اور یہ مرہٹوں کے امراوتی

ڈویژن کی نمائندگی کرتا تھا۔

برار کے نام کی اصل حقیقت کسی کے علم میں نہیں تاہم بعض لوگوں کے خیال میں یہ دکن کی ایک بادشاہت ''ودار بھا'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے لیکن مرہٹوں کے دور میں برار اس بادشاہت سے علیحدہ ہوگیا۔ اس علاقے نے بہت عروج و زوال دیکھے۔ مختلف ہندو بادشاہتوں کے علاوہ یہ مغلیہ سلطنت اور نظام آف حیدر آباد کے قبضے میں بھی رہا اور بالآخر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں چلا گیا۔ برطانویوں کے دور میں اس علاقے نے بے حد ترقی کی۔ ہزاروں کی تعداد میں مراٹھی باشندے جو مرہٹہ پیشواؤں کے اثر و رسوخ سے تنگ آ کر یہاں سے چلے گئے تھے، واپس آ گئے۔

یکم اکتوبر 1903ء کو برار کو برٹش کمشنر جنرل آف سنٹرل پراونسز کے ماتحت کر دیا گیا جو بعد ازاں سنٹرل پراونسز اور برار کے نام سے مشہور ہوا۔ 1947ء میں یہ اسی نام سے بھارت کی ریاست بنی جب کہ 1950ء میں اسے مدھیا پردیش میں شامل کر دیا گیا۔ 1956ء میں اس ریاست کی از سر نو تشکیل ہوئی اور زبانوں کی بنیاد پر برار اور ناگپور ریاست بمبئی کا حصہ بن گئے۔ 1960ء میں ریاست بمبئی کو زبانوں کی بنیاد پر ہی توڑ دیا گیا اور برار سمیت جنوبی مرہٹہ علاقے نئی ریاست مہاراشٹر کا حصہ بنا دیئے گئے۔

[14] اکیس لاکھ ستر ہزار کی آبادی کا شہر ناگپور وسطی ہندوستان میں ممبئی سے شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ دریائے ناگ کے کنارے آباد یہ شہر سابقہ سنٹرل پراونسز اینڈ برار اور بعد ازاں ریاست مدھیا پردیش کا دارالحکومت رہا۔

اس شہر کی بنیاد اٹھارہویں صدی عیسوی میں ناگپور مرہٹہ بادشاہت کے دارالحکومت کی حیثیت سے رکھی گئی جب کہ 1853ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا۔

تواریخ کے مطابق ناگپور کی بنیاد دیوگرا کی کوگونڈ بادشاہت کے ایک شہزادے بخت بلند نے رکھی تھی لیکن 1743ء میں مرہٹہ سردار رگھوجی بھونسلہ اس پر قابض ہو گیا اور اسے مرہٹہ سلطنت کا دارالحکومت بنا دیا۔ بعد ازاں یہ نظام حیدر آباد کے قبضے میں رہا اور بالآخر

انگریزوں نے ایک معاہدے کے تحت اسے نظام سے حاصل کرلیا۔
اس وقت ناگپور ایک ڈویژن ہے اور ریاست مہاراشٹر میں شامل ہے۔

[15] ٹھگ بنیادی طور پر ہندو دیوی کالی کے پجاری تھے۔ یہ دوستوں کے بھیس میں مسافروں کے ساتھ سفر کرتے لیکن موقعہ پاتے ہی، اپنے رومال کی مدد سے اس کا گلا گھونٹ دیتے اور اس کے تمام مال ومتاع پر قبضہ کر لیتے۔ کہتے ہیں کہ ان کے شکنجے میں آنے والا شخص کبھی بچ نہیں سکتا تھا۔

ٹھگوں کا موقف تھا کہ وہ یہ قتل و غارت اپنی دیوں کی خوشنودی کے لیے کرتے ہیں لیکن مسلمان بادشاہوں اور بعد ازاں انگریزوں نے ان کے خلاف باقاعدہ مہمات چلائیں اور انہیں باقاعدہ ڈاکو قرار دے دیا۔ 1830ء کے لگ بھگ انگریزوں نے ٹھگوں کا تقریباً خاتمہ کر دیا لیکن بعض تاریخی شواہد کے مطابق ان کا وجود 1904ء تک برقرار رہا۔

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق بیس لاکھ سے زائد افراد ٹھگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔

[16] بمبئی یا ممبئی اس وقت بھارتی ریاست مہاراشٹر کا دارالحکومت ہے۔ اس کا رقبہ 25 مربع میل اور آبادی 45 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر کا کچھ حصہ بمبئی اور کچھ سیلسٹ جزائر پر آباد ہے۔ یہ مغربی ہندوستان کی واحد گہرے پانی کی بندرگاہ ہے۔

موجودہ شہر کا علاقہ پرتگیزیوں نے 1534ء میں گجرات اور بمبئی کے سلطان سے پٹہ پر حاصل کیا تھا بعد ازاں 1661ء میں یہ برطانویوں کے قبضے میں چلا گیا۔ بمبئی 1668ء سے 1858ء تک مغربی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا کے مطابق پرتگیزیوں نے ممبئی کا جزیرہ گجرات کے مسلمان سلطان بہادر شاہ سے حاصل کیا۔ 1661ء میں جب انگلینڈ کے بادشاہ چارلس دوم کی شادی کیتھرائن ڈی برگنزا سے ہوئی تو یہ اسے جہیز میں مل گیا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے اپنے بادشاہ سے دس پونڈ سالانہ کے پٹے پر لے لیا اور رفتہ رفتہ اسے ایک عظیم الشان

شہر میں تبدیل کر دیا۔

یہ علاقہ درحقیقت سات چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل تھا جنہیں آپس میں جوڑنے کا کام 1782ء میں شروع ہوا اور 1845ء میں مکمل ہوا۔ یہی وہ پہلا شہر ہے جہاں سے 1853ء میں برصغیر کی پہلی ریل گاڑی تھانہ کے لیے روانہ ہوئی۔ یہ شہر 1947ء تک انگریزوں کے قبضہ میں رہا۔

[17] مدراس کا نیا نام چنائے ہے۔ پہلے یہ بھارتی ریاست ہوا کرتی تھی جب کہ اب یہ از خود بھارتی ریاست تامل ناڈو کا ایک حصہ ہے۔

[18] بنگال ایک طویل عرصے تک انگریزوں کی پریذیڈنسی رہا انہوں نے اس پر 1757ء کی جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر قبضہ کر لیا تھا۔ 1905ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندو آبادی کے لحاظ سے اسے منصفانہ طور پر تقسیم کیا تھا۔ مشرقی بنگال میں مسلمان زیادہ تھے اور یہی علاقہ برصغیر کی تقسیم کے وقت مشرقی پاکستان بنا جس کا دارالحکومت ڈھاکہ تھا تاہم 1971ء میں ہندوستان کی مدد سے یہ حصہ آزاد ہو کر بنگلہ دیش کہلایا۔

مغربی بنگال کا دارالحکومت کلکتہ تھا جو عرصہ دراز تک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہیڈ کوارٹر بھی رہا۔ 1877ء میں جب ملکہ وکٹوریہ نے ملکہ ہندوستان کا لقب اختیار کیا تو کلکتہ کو برطانوی راج کا دارالحکومت قرار دے دیا گیا تاہم بعد ازاں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔

[19] انفیلڈ جسے لی این فیلڈ رائفل بھی کہا جاتا ہے 1895ء سے 1956ء تک برطانوی افواج کی اسٹینڈرڈ بولٹ ایکشن رائفل رہی۔ اسی رائفل کے کارتوس ہندوستان کی جنگ آزادی کی ابتداء قرار پائے تھے۔

[20] مرہٹوں کے پیشوا نانا صاحب کا بہادر اور قابل ترین جرنیل جس نے اپنے پیشوا کے لیے متعدد جنگیں لڑیں اور فتح یاب ہوا لیکن بعد میں اسے شکست ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق 1858ء میں جنگ آزادی ختم ہونے پر تانتیا توپ انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا

جنہوں نے اسے پھانسی دے دی۔

[21] دریائے جمنا کے کنارے شمالی وسطی ہندوستان کا اہم ترین شہر جو ہزاروں سال قبل آباد ہوا۔ یہ شہر حملہ آوروں کے ہاتھوں کئی بار اجڑا اور چند سو سالوں کے وقفے کے علاوہ ہمیشہ ہندوستان کا دارالحکومت رہا۔ اس شہر کا پرانا حصہ مغل شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں نے سترہویں صدی عیسوی میں تعمیر کرایا اور لال قلعہ کو مغلیہ محل کی حیثیت دی۔

1857ء کی جنگ آزادی کے وقت دہلی، مغلیہ سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ 1912ء میں اس شہر کا نیا حصہ برطانوی راج کا دارالحکومت بنا اور اب یہ ہندوستان کا صدر مقام ہے۔

جنگ آزادی کے دوران یہیں سے آخری مغل تاجدار بہار شاہ ظفر کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے بیٹوں کو قتل کیا گیا اور برطانویوں نے باغیوں کو شکست دینے کے بعد یہاں جی بھر کر لوٹ مار کی اور لوگوں کا قتل عام کیا۔

[22] 1775ء سے 1856ء تک یہ سلطنت اودھ کا دارالحکومت رہا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران پانچ ماہ تک باغیوں کے محاصرے میں رہا۔ جون 1857ء سے نومبر 1857ء تک کے اس عرصے کے دوران برطانوی گیریژن کو بھاری جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا بالآخر نومبر میں انگریز محاصرہ توڑ کر فرار ہو گئے تاہم ایک سال بعد انہوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

1877ء میں جب اودھ اور آگرہ کا ادغام ہوا تو اسے یونائیٹڈ پراونسز (متحدہ صوبہ جات) کا دارالحکومت قرار دیا گیا جب کہ 1942ء سے 1947ء تک یہ تحریک پاکستان کا ایک اہم مرکز بھی رہا۔

[23] یونائیٹڈ پراونسز (متحدہ صوبہ جات) کا قیام 1877ء میں اودھ اور آگرہ کے ادغام کے نتیجے میں عمل میں آیا۔

ہریانہ شمالی وسطی ہندوستان کی ایک ریاست تھی جس کا صدر مقام چندی گڑھ تھا۔ جب کہ کرنال، پانی پت، روہتک اور بھوانی اس کے اہم شہر تھے۔ اسے 1966ء میں صوبہ پنجاب

سے علیحدہ کر کے ریاست کا درجہ دیا گیا۔

بہار، مشرقی وسطی ہندوستان کی ایک ریاست ہے جس کا دارالحکومت پٹنہ ہے، دریائے گنگا اس زرخیز ریاست کو سیراب کرتا ہے لیکن اپنی زرخیزی کے باوجود یہ بھارت کا غریب ترین صوبہ ہے۔

[24] برطانوی جرنیل جسے کانپور کو باغیوں کے قبضے سے چھڑانے کے باعث شہرت ملی لیکن وہ اتنی تاخیر سے پہنچا کہ برطانویوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل ہونے سے نہ بچا پایا۔ ستمبر 1857ء میں اس نے لکھنو سے باغیوں کا محاصرہ ختم کروانے کی کوشش کی لیکن خود اپنی فوجوں سمیت ان کے نرغے میں آ گیا۔ نومبر میں جب شہر واگزار ہوا تو چند ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

[25] دریائے بیتوا کے کنارے جھانسی کی ہمسایہ ریاست۔ اس وقت یہ بھارتی ریاست مدھیہ پردیش کے ضلع ٹیکم گڑھ کا ایک قصبہ ہے جب کہ تقسیم ہند اور انگریزوں کے قبضے سے قبل یہ بندھیل کھنڈ ریجن کی ایک خودمختار ریاست تھی۔ اس کا عظیم الشان قلعہ سترہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا۔ جس میں کئی محلات اور دوسری عمارتیں تھیں۔ یہ تمام محلات اور عمارتیں ایک دوسرے کے ساتھ خفیہ راستوں کے ذریعے ملی ہوئی تھیں۔

1848ء سے 1874ء تک ہمیر سنگھ نامی راجہ یہاں کا حکمران تھا۔ ستمبر 1857ء میں ہمیر سنگھ نے حالات کا فائدہ اٹھا کر جھانسی پر حملہ کر دیا لیکن رانی جھانسی کے ہاتھوں اسے عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1865ء میں اس نے مہاراجہ کا لقب اختیار کیا۔ 1874ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ (پیدائش 1854ء وفات 1930ء) یہاں کا حکمران بنا۔ اس نے اپنی ریاست کو بے انتہا ترقی دی۔ 1901ء میں ریاست کا رقبہ 2080 مربع میل اور آبادی تین لاکھ 21 ہزار 634 تھی۔ یہ بندھیلی ریاستوں میں سب سے پرانی اور بڑی ریاست تھی جس کے مہاراجہ کو پندرہ توپوں کی سلامی دی جاتی تھی جب کہ اس کے مہاراجہ کو بندھیل کھنڈ کا اولین راجکمار کہا جاتا تھا۔

یکم جنوری 1950ء کو ریاست کے مہاراجہ ویر سنگھ (پرتاپ سنگھ کے جانشین) نے ہندوستان

میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ اسے ابتدائی طور پر ریاست وندھیا پردیش کا ضلع بنایا گیا لیکن 1956ء میں مدھیہ پردیش میں ضم کر دیا گیا۔

[26] واتیا، جھانسی سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر واقع ایک خودمختار ریاست تھی۔ اس کے گرد پتھریلی فصیل تھی جس کے اندر شاندار محلات بنے ہوئے تھے۔ 1802ء میں یہ ریاست برطانوی راجہ کے ساتھ شامل ہوئی اس کے مہاراجہ بندیلہ قبیلے کے راجپوت تھے جو اورکایا آرکا کے ایک سابق مہاراجہ کی اولاد میں سے تھے۔

ستمبر 1857ء میں اس کے مہاراجہ کو بھی رانی جھانسی کے ہاتھوں شکست ہوئی۔

برطانوی حکومت کا حصہ بننے کے بعد اس ریاست کی سالانہ آمدنی 70 ہزار پونڈ تھی جو انگریز سرکار مہاراجہ گوالیار سندھیا کے سپرد کر دیتی تھی۔ یہ انگریزوں کے ساتھ اس کی وفاداریوں کا صلہ تھا۔ 1896ء سے 1897ء تک ریاست بدترین قحط اور خشک سالی کا شکار رہی جب کہ 1890-1900ء میں یہاں دوبارہ اشیائے خوردنی کی قلت پیدا ہوگئی۔

1947ء میں داتیا کے مہاراجہ نے ہندوستان میں شمولیت کا اعلان کیا اور 1950ء میں اسے بندھیل کھنڈ کے باقی حصوں سمیت ریاست وندھیا پردیش میں ضم کر دیا گیا تاہم 1956ء میں ریاست وندھیا پردیش، نئی ریاست مدھیہ پردیش میں مدغم ہوگئی۔

اس وقت داتیا کی حیثیت ایک ضلع کی ہے جس میں 445 دیہات اور تین قصبے داتیا، سیوندھا اور بھاندر شامل ہیں۔ تینوں شہر تحصیل ہیڈ کوارٹر ہیں۔